پاکستانی ادبیات اور نسیم امروہوی
ایک سماجی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ ڈی

از

مہرالنساء عزیز

سپروائزر

ڈاکٹر ہلال نقوی

پاکستان اسٹڈی سینٹر

جامعہ کراچی

۲۰۰۷ء

انتساب

اپنے والد

عبدالعزیز مرحوم ومغفور کے نام

جن کی آغوشِ تربیت نے
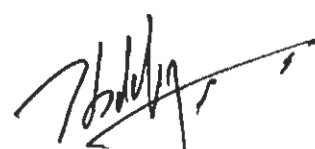
علم اور محنت ومطالعہ کی پہلی شمع دل میں روشن کی

Certificate

Certified that Ms. Mehrunnisa Aziz d/o. Abdul Aziz has written this thesis entitled:

پاکستانی ادبیات اور نسیم امروہوی: ایک سماجی مطالعہ

under my supervision and guidance. The views expressed in it are those of the author. She has completed this thesis as a requirement for the degree of Ph.D in Pakistan Studies.

(Dr. Hilal Naqvi)
Supervisor

Dated: 21-03-2007

تلخیصِ مقالہ

نسیم امروہوی (۱۹۸۷ء۔۱۹۰۸ء) اردو زبان وادب کی دنیا میں اگرچہ ایک شاعر اور مرثیہ نگار کے طور پر شہرت رکھتے تھے لیکن ان کی علمی و ادبی خدمات کے سلسلے مختلف اصنافِ شعر و نثر تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ایک صحافی، مورخ، افسانہ نویس، مترجم، ماہر لسانیات، لغت نگار، فرہنگ نویس، عالمِ دین اور بطورِ خاص بچوں کا ادب تخلیق کرنے والی شخصیت تھے۔ ۱۰۰ سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مولف تھے۔ ان کی یہ تمام خدمات زندگی اور سماج کی بہتری سے وابستہ تھیں جن میں وہ بہت واضح سماجی اقدار رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی چشمِ بصیرت سماجی تفصیلات کو پرکھ لیتی تھی اسی سبب سے ان کی شاعری اور نثر سماجی جائزے اور سماجی عمل کی مظہر ہے۔

نسیم امروہوی ہجرت کر کے آنے والوں میں اس اعتبار سے ایک علیحدہ شخصیت کے حامل تھے کہ انہوں نے مقامی روایات سے زیادہ اثر قبول کیا اور وہ اثر انداز بھی ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ پہلے ادیب تھے جنہوں نے ایک ذوالّلسانی اخبار 'مراد' سندھ سے جاری کیا جو بیک وقت اردو اور سندھی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار میں وہ ان مضامین کی شمولیت کو بہت اہمیت دیتے تھے جس سے معاشرے کی سوچ میں مثبت تبدیلی آ سکے۔ خود ان کے جو مضامین اس میں شامل ہوتے تھے ان میں ایک پسماندہ معاشرے میں تعلیمی ترجیحات کے تذکرے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اس اخبار کے اداریوں میں انہوں نے اپنے آباد کیے ہوئے صوبے میں حقوقِ نسواں کی پامالی پر سخت احتجاج کیا۔ نسیم صاحب نے 'تاریخِ خیر پور' بھی لکھی جس میں وہ محض ایک مورخ ہی نہیں بلکہ ایک ایسے ریفارمر بھی نظر آتے ہیں جس نے ان عوامل کی نشاندہی کی جو پہلے سے کمزور سماجی ڈھانچے کو مزید کمزور کر رہے تھے۔ یہ ان کے مقامی تہذیب و ادب سے باہمی عمل کا نتیجہ تھا کہ ان کے کام کی ستائش جس انداز سے مشاہیرِ سندھ نے کی وہ قابلِ قدر ہے۔

نسیم اللغات، رئیس اللغات اور جامع نسیم اللغات کے علاوہ انہوں نے علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کی فرہنگیں الگ الگ تیار کیں۔ یہ فرہنگیں عام لغات سے زیادہ ادبی اور منفرد ہیں اور مشکل فلسفیانہ تصورات کو عام آدمی کے لیے آسان تر بنانے میں بہت معاون ہیں۔ ان کی عمر کا ایک کثیر حصہ لغت نگاری میں گزرا۔ الفاظ کے معانی اور ان کی تشریحات میں وہ مختلف زبانوں کے تصورِ حیات اور اقدار کے تذکرے کو لے کر آگے بڑھے ہیں۔ الفاظ جس ماحول اور جس سماج میں پرورش پاتے ہیں، اپنے قاری کو وہ اس کے تہذیبی اور تاریخی ماحول سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ ان کی لغت نگاری الفاظ کی تجریدی تعریف پیش کرنے سے بالا ہوتی ہے۔ وہ تازہ ترین روزمرہ کو ملحوظ رکھتے ہیں اور الفاظ کی مصورانہ تاویل کرتے ہیں جو سماج کی عکاسی کا ایک عمل ہے۔

اردو کے اصنافِ شعر میں مرثیے کی صنف جو پہلے ہی سے اپنی واقعہ نگاری میں انسانی حقوق کو عوامل کے طور پر برت رہی تھی اس میں نسیم امروہوی نے انسانی تعلقات کو اس انداز سے پیش کیا کہ ہر کردار اپنے نصب العین اور اعلیٰ مقاصد کو بروئے کار لاتا ہے۔ ان مرثیوں میں مخدّرات (خاندانِ رسولؐ کی خواتین) کی کردار نگاری بہت نمایاں ہے۔ اس روایتی فنِ مرثیہ میں انہوں نے حقوقِ نسواں کا تصور متعارف کروایا ہے۔ ان کے افسانے، ادبی کہانیاں اور بچوں کے لیے تخلیق کیا ہوا ادب بھی اس نہج پر تیار ہوا کہ وہ سماجی اقدار کو فروغ دیں اور سماجی تنقید کو بروئے کار لائیں۔ سبق آموز باتوں کو فنکارانہ طور پر پیش کرنے میں وہ مہارت رکھتے تھے۔ یہ سبق آموزی واعظانہ طرز کی نہیں ہے بلکہ ایک سچے فنکار کی طرح یہ ان کی تخلیقات کی روح میں موجود ہوتی ہے، شعر ہو یا نثر، ان کی کوششیں ہمیں ہر جگہ سماجی اقدار میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔

Abstract

Naseem Amrohvi (1908-1987) although famous as a poet and elegy writer in the domain of Urdu language and literature, the extent of his scholarly and literary services embrace various forms and works. He was a person who was a journalist, translator, linguist, lexicographer, glossary writer, religious scholar and specially a creator of children's literature. He was the author and editor of more than 100 books. All his services were committed to the betterment of life and society within which he upheld very clear social values. His writings indicate that his vision was able to assess social details. Because of this his poetry and prose presented a phenomenon of social action and social survey.

Naseem Amrohvi was a personality apart from other émigré writers in the sense that he imbibed local traditions and affected it as well. After 1947 he was the first writer who published from Sindh, a bilingual Sindhi-Urdu journal *Murad.* In this journal he gave great importance to including those articles which could contribute to the positive thinking of society. His own articles which were carried, gave importance to the discussion of educational priorities of a downtrodden society. In the province of his adoption, he agitated against the trampling of women's rights. Naseem Sahab also wrote *the history of Khairpur (Tarikh-i-Khairpur)* in which he is seen not only as a historian, but also as a reformer, who pinpointed the factors which were weakening an already fragile social structure. It was the result of his mutual interaction with local literature and culture, that he received plaudits for his endeavours from the luminaries of Sindh, which is it by itself valuable.

Apart from *Naseem ul Lughat, Raees ul Lughat* and *Comprehensive Naseem ul Lughat,* he compiled separate glossaries of the Urdu and Persian works of Allama Iqbal. These glossaries are more literary and nonpareil and make difficult philosophical concepts easy and accessible to the common man.

A great part of his life has been spent in lexicography. He used to make aware his reader of the mileu and society, in which the words breathed, along with their historical and cultural connotation. His lexicography was above giving abstract denotations of words. He kept in view the latest usage and idiom, and was illustrative of words, which is a work reflective of society.

In the poetic forms of Urdu, the elegy (marthia) form was already in its narrative style treating human right as factors. In these Naseem Amrohvi has potrayed human relations in such a manner that every character fulfils his aim and high purpose. In these elegies the characterization of the *Mukhaddirat* (ladies of the Holy Prophet PBUH's family) is most prominent. In this traditional art of elegy, he introduced the concept of women's rights. His short stories, literary tales, and children's literature was created in the manner of promoting social values and engaging in social criticism. He is an expert in presenting moralizing material in artistic fashion. Such moralizing is not of a didactic fashion, but like a true artist, these are imbued by him in the spirit of his creations. Whether it be poetry or prose, his endeavours appear everywhere as immersed in social values.

فہرست

پہلا باب

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

ضمیمہ

ابتدائیہ

یہ مقالہ پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی کے تحت لکھا گیا ہے۔ پاکستان اسٹڈی سینٹر 'مطالعۂ پاکستان' کا ایک ایسا احاطہ کرتا ہے جس میں تاریخ، سیاسیات، معاشیات، جغرافیائی معلومات اور اسلامی نظریۂ حیات کے ساتھ ساتھ علاقائی اور قومی ادب کا بھی ایک بہت جامع مطالعہ کیا جاتا ہے۔ زبان وادب کی تعلیم جب مندرجہ بالا تمام علوم کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے تو ہم ایک ایسے نئے ماحول میں ادب کو دیکھتے ہیں جس میں ثقافتی اور سماجی تعلق کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اور زندگی کو اس کے تہذیبی وسماجی رشتوں کے تناظر میں دیکھنے کی طرف طلبا و طالبات کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ پیشِ نظر تحقیقی موضوع 'پاکستانی ادبیات اور نسیم امروہوی ایک سماجی مطالعہ' اسی سلسلۂ فکر کی ایک کڑی ہے۔

نسیم امروہوی پاکستان کی اُن اہم علمی و ادبی شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں جنہیں اس طرح کی عوامی شہرت تو نہیں ملی جو ہمارے یہاں تیسرے درجے کے شاعر و ادیب کو بھی ذرائع ابلاغ اور اخبارات سے مل جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ ایک گوشہ نشین شخص رہے لیکن اُن کے علمی کاموں اور ادبی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ عہدِ حاضر کے پڑھے لکھے لوگ نقاد و دانشور اُن کے نام اور کام سے آگاہ ہیں۔

پاکستانی ادبیات کے مطالعے کے دوران جن اہم شخصیات کے متعلق بحیثیت ایک طالب علم میرے علم میں اضافہ ہوا، اُن میں نسیم امروہوی کے متعلق پڑھتے ہوئے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ لغت نویسی، صحافت، لسانیات، ترجمہ وتفسیر، نصابی کتب خصوصاً بچوں کا ادب، شاعری اور تجزیہ وتنقید کے حوالے سے کم وبیش سو (۱۰۰) سے زیادہ کتابوں کے مصنف

ہیں۔لیکن ان کی شہرت صرف ایک مرثیہ نگار کی حیثیت سے ہوئی یا زیادہ سے زیادہ اُن کی لغت نویسی اور فرہنگ نگاری سے لوگ باخبر ہوئے، لیکن دیگر کاموں پر پردہ پڑا رہا۔میرے اس موضوع کی تحقیقی اہمیت اسی بات سے قائم ہوتی ہے کہ اُن کی وہ تمام تحریریں اور تالیفات جو نظروں سے اوجھل ہیں انہیں سامنے لایا گیا اور اس مقالے میں اُن سب کو اپنی بحث کا حصہ بنا کر گمنامی کے پردوں سے ضرور نکالا گیا۔

ایسے موضوعات کا پہلا مسئلہ مواد کی فراہمی ہوتا ہے اور نسیم صاحب کے سلسلے میں اس کی دقتیں اس لیے زیادہ تھیں کہ اُن کی زندگی کا سفر کئی علاقوں، شہروں اور دیہاتوں سے وابستہ رہا ہے۔ وہ ۱۹۰۸ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے اور پھر لکھنؤ، میرٹھ، رام پور، لاہور، کوٹ ڈیجی، خیر پور اور کراچی میں مختلف وقتوں میں کبھی کم کبھی زیادہ اُن کا قیام رہا۔ایسی صورت میں اُن کی تحریریں بھی یکجا نہیں رہ سکیں۔تقسیم کے بعد جب وہ پاکستان آئے تو اُن کے ہاتھ خالی تھے، ان کی کوئی کتاب، کوئی تصنیف، کوئی تالیف اُن کے پاس نہیں تھی۔ پاکستان میں بھی انہوں نے ایک عرصہ دراز تک جو علمی و ادبی کام کیے وہ بھی سب اتنی آسانی سے میسر نہیں آئے۔نسیم صاحب خود بھی ان چیزوں کو کبھی محفوظ نہیں رکھ سکے جس کی ایک بہت بڑی وجہ اُن کے گھریلو حالات تھے۔اُن کے قریبی حلقے کے لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ اُن کی اہلیہ زندگی کے آخری ۳۰ برسوں میں ذہنی طور پر معطل رہیں۔ایک بیٹا بھی زندگی کے نارمل حالات کا ساتھ دینے کے قابل نہیں تھا۔لیکن ان تمام ذہنی اذیتوں کے باوجود اُن کا اتنا ادبی و علمی سفر اُن کے متحرک شخصیت ہونے کی دلیل ہے۔

مواد کی فراہمی کے سلسلے میں اُن کی اولاد اور اُن کے خاندان کے بعض افراد نے میری بہت مدد کی۔کراچی میں مقیم اُن کے ایک فرزند قسیم ابنِ نسیم اور سعودی عرب میں اُن کے چھوٹے بیٹے وسیم حیدر سے مجھے کئی نایاب تحریریں ملیں۔لیکن سب سے زیادہ اُن کا علمی و ادبی سرمایہ مجھے کراچی کی ایک علم دوست شخصیت جناب سید علی کرار نقوی کے کتب خانے سے ملا جس میں اُن کے نایاب قلمی مرثیوں کا بھی ایک ذخیرہ تھا۔

یہ مقالہ سات (۷) ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں نسیم امروہوی کی سوانحِ حیات کے انتہائی بنیادی پہلوؤں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔اسی باب میں اُن کی شخصیت کا بھی

ایک جامع مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سوانح کے ذیل میں ولادت، وطن، شعر گوئی کی ابتدا اور درس و تدریس کی ذمہ داریوں سے لے کر انجمنِ ترقی اردو خیر پور، مراد اخبار، ترقی اردو بورڈ اور پیرانہ سالی اور ضعفِ جسمانی کے دور تک اُن کے روز و شب کا ایک تذکرہ کیا گیا ہے۔

دوسرا باب نسیم امروہوی کے سماجی تصورات پر مشتمل ایک ایسا باب ہے جس میں ہمارے تحقیقی موضوع کی ایک اہم بحث شامل ہو جاتی ہے۔ ادب و سماج، ادب برائے زندگی کی چند بحثوں سے ہم سماجی وابستگی کے ادب تک آئے ہیں اور پھر ہم نے یہ دیکھا ہے کہ خود نسیم کا ذہنی پس منظر کیا تھا؟ اُن کے سماجی تصورات کا خاکہ کن بنیادوں پر قائم ہے؟ اُن کی تحریروں سے معاشرتی ناہمواریوں کے ازالے کی کیا شکل ہمیں نظر آتی ہے؟ اُن کے مذہبی افکار کا سماجیات سے کیا تعلق قائم ہوتا ہے؟ اور اُن کی لغت نویسی کس طرح ایک سماجی مظہر کی حیثیت رکھتی ہے۔

تیسرے باب میں اس عنوان کے تحت ہم آگے بڑھے ہیں کہ تحریکِ پاکستان میں نسیم امروہوی کی قلمی خدمات کیا ہیں؟ قوموں کی سماجی زندگی میں ادب کیا کردار ادا کرتا ہے؟ نسیم صاحب نے معاشرتی انقلاب کے لیے کیا تدبیریں اختیار کیں۔ اُن کے مسدس برق و باراں کی کیا اہمیت ہے جسے انہوں نے قراردادِ لاہور کے زمانے میں لکھا۔ اس اہم نظم میں ایک نئے مسلم معاشرے کی تشکیل کے جو پہلو ہمارے سامنے آئے اُس سے ہمیں ان کی سماجی و تاریخی فکر کو بھی سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ اس باب میں یہ بحث بھی سمیٹی گئی ہے کہ بحیثیت ایک پاکستانی ادیب و شاعر، اُن کا طرزِ فکر کیا رہا ہے۔

چوتھا باب بچوں کا ادب اور سماجی اقدار کی تقسیم سے متعلق ہے۔ نسیم صاحب نے بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس باب میں ہمارے تحقیقی مطالعے کا مرکزی نکتہ یہ رہا ہے کہ بچے کی نفسیات پر نسیم کی نظر کیا وسعت رکھتی ہے اور وہ بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں لکھتے ہوئے کن زاویوں کو اُبھارتے ہیں۔ وہ کیونکہ ہمیشہ لغت نویسی سے وابستہ رہے چنانچہ بچوں کے متعلق ادب میں بھی اُن کے یہاں لفظ کی اہمیت قائم ہوتی ہے تو ہم نے اس عنوان سے بھی ایک بحث کی ہے کہ بچہ، زبان سماجی ضرورت کے تحت سیکھتا ہے اور یہیں سے بچوں

میں ادب کی تعلیم کے سماجی و تہذیبی پہلوؤں پر غور کیا گیا ہے۔ بچے کا وہ ذہنی سفر جو مقامی سماج سے عالمگیر سماج تک پہنچتا ہے اُس پر اس باب کے آخری حصے میں لکھا گیا ہے۔

پانچویں باب میں پاکستانی ادبیات کے تحت سندھی ادب و ثقافت کی ترجمانی کے متعلق نسیم امروہوی کی کاوشوں کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا۔ لوک ادب میں سماج کی جو عکاسی کی جاتی ہے اُسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے سندھی ادب اور ارضی تہذیب کے تعلق سے ایک مطالعہ کیا گیا ہے۔ اردو و سندھی زبان کے لسانی روابط میں سماجیاتی پہلوؤں پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ انجمنِ ترقی اردو خیر پور سے اُن کی وابستگی، سندھی اور اردو پر مشتمل مراد اخبار جس کے نسیم صاحب ایڈیٹر رہے، اُن کی تاریخی و علمی تصنیف تاریخِ خیر پور، ہفت زبان شاعر سچل سرمست پر اُن کے خیالات، سندھی زبان میں تفسیرِ قرآن و فرہنگِ لطیف کے نامکمل خاکے کو ہم نے اپنی تحقیق کا حصہ بنایا ہے۔

چھٹا باب، نسیم امروہوی کا اقبالیات سے جو ذہنی و فکری تعلق ہے اس کے پھیلاؤ کا ہم نے اس باب میں جائزہ لیا ہے۔ نسیم امروہوی کی ادبی خدمات کا اقبال سے بہت گہرا رشتہ رہا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں بھی اقبال سے متاثر ہیں اور اُن کی تحقیقی ذمہ داریوں کا بھی ایک بڑا حصہ اقبال کی شاعری اور اُن کے پیغام کی تشریح و تفسیر سے متعلق ہے۔ نسیم امروہوی کے دورِ آخر کے دو بڑے کارنامے فرہنگِ اقبال اردو اور فرہنگِ اقبال فارسی اسی باب کا ایک اہم حصہ ہیں۔

ساتواں باب اس اعتبار سے زیادہ اہم ہے کہ یہ نسیم امروہوی کی سب سے اہم فنی و ادبی شناخت یعنی مرثیہ نگاری سے متعلق ہے۔ اردو مرثیے کی تاریخ ایک بڑی تاریخ میں شمار ہوتی ہے۔ مولانا شبلی کے موازنۂ انیس و دبیر سے لے کر پروفیسر احتشام حسین کے مقدمہ مراثی انیس تک ایک کثیر تنقیدی سرمایہ ہمارے سامنے ہے۔ لیکن مرثیے کے سماجی مطالعے سے متعلق تحریریں عموماً ہمیں نہیں ملتیں۔ ادھر چند برسوں سے اس صنفِ سخن کو سماجیات کے دائروں میں دیکھنے کا رجحان بڑھا ہے۔ نسیم صاحب کی بیشتر خدمات کیونکہ اپنے سماج سے ایک تعلق رکھتی ہیں اس اعتبار سے اُن کے مرثیے کا سماجی مطالعہ بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اسی باب کے اختتام پر اختتامیہ ہے جس میں پورے مقالے کے مباحث کو سمیٹ کر

ایک نظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سات ابواب کے بعد مقالے میں ایک ضمیمہ بھی شامل ہے جو 'الف' اور 'ب' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ضمیمے کا حصہ الف اس اعتبار سے ایک تفصیلی باب کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ ہم نے اس میں نسیم صاحب کی کم وبیش تمام تالیفات وتصنیفات کا ایک جامع تعارف کرایا ہے۔ ان تمام کتابوں کا حصول ہی تحقیق کے سفر میں ایک بڑی ذمہ داری کی حیثیت رکھتا تھا جسے انتھک محنت اور مسلسل دوڑ دھوپ کے بعد کامیابی سے ہمکنار کیا گیا۔ ضمیمے کے حصہ ب میں نسیم صاحب کی نایاب قلمی تحریروں کے عکس شامل ہیں۔

اس تحقیقی مقالے کے آغاز ہی سے میری یہ کوشش رہی کہ جہاں تک میری رسائی ہو سکے میں اپنے موضوع سے متعلق بہتر سے بہتر تحریروں کو اپنے مطالعے کا حصہ بنا سکوں۔ جو تحریریں یا جو تالیفات وتصنیفات مجھے نسیم امروہوی صاحب کے گھر یا ان کے خاندان سے مل سکیں وہ تو اپنی جگہ پر ہیں لیکن اپنے موضوع کو ایک وسیع تحقیق کے سفر میں آگے بڑھانے کے لیے مجھے کراچی کے کئی کتب خانوں سے مدد ملی۔ کراچی یونیورسٹی کی ڈاکٹر محمود حسین لائبریری اور خود ہمارے سینٹر یعنی پاکستان اسٹڈی سینٹر کی لائبریری تو اسی تعلیمی درسگاہ سے ایک تعلق کے سبب ایک طرح سے دائرۂ اختیار میں تھی جس سے استفادے کے بہت مواقع ملے۔ ہماری سینٹر کی لائبریرین مسز شوکت جہاں صاحبہ نے اس ذیل میں ہر طرح ساتھ دیا۔ کراچی یونیورسٹی سے باہر کی لائبریریوں میں لیاقت نیشنل لائبریری، بیدل لائبریری اور غالب لائبریری اس اعتبار سے بھی زیادہ اہم ہیں کہ ان میں کتابوں کے ساتھ ساتھ نادر ادبی رسائل اور خصوصاً لیاقت نیشنل لائبریری میں نایاب اخبارات کا ایک خزانہ ہے۔ اس سے جس حد تک میں استفادہ کر سکی اس نے میری تحقیق کی مشکلات کو بہت حد تک دُور کر دیا۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں مقالے کے نگراں ڈاکٹر ہلال نقوی صاحب کا نام نہ لوں اور ان کا شکریہ ادا نہ کروں۔ ایم۔اے کی تکمیل کے دوران ان کے لیکچرز نے ذہن کو مطالعے کی طرف راغب کیا۔ پھر ایم۔اے کے اسی سفر میں 'جمیل الدین عالی کی تحریروں میں پاکستانیت' اور ایک دوسرے مقالے 'پروفیسر آفاق صدیقی اور سندھی ادب' کی تکمیل کی ادبی وتحقیقی معاونت کے سفر میں ان کی رہنمائی اور ہدایات کی روشنی

میں صحیح سمت میں تحقیق کو لے کر چلنے کا اندازہ ہوا۔ یہ دونوں مقالے پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی نے شائع کیے ہیں۔ ان سب علمی وادبی مواقع اور آسانیوں کی روداد میں بہت اہم کردار پاکستان اسٹڈی سینٹر کے ڈائریکٹر اور محترم استاد ڈاکٹر سید جعفر احمد صاحب کا رہا ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک اسکالر ہیں۔ اگرچہ ان کا مخصوص شعبۂ فکر سیاسیات ہے لیکن ادب و تاریخ پر بھی ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ کچھ برسوں سے ان کے ساتھ ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنے کے جو مواقع ملے ہیں اس نے تحقیق سے دلچسپی اور مطالعے کی طرف طبیعت کو بہت مائل کیا ہے۔ میں اپنے ان اساتذہ کی بطورِ خاص ممنون ہوں کہ ان کی سرپرستی اور رہنمائی نے اس قابل کیا کہ اپنے موضوع کو ایک باقاعدہ مقالے کی شکل دینے کے قابل ہوسکی۔

مہرالنساء عزیز

یکم جنوری ۲۰۰۷ء

پہلا باب

نسیم امروہوی......سوانح وشخصیت

پاکستان کی خاک میں ابدی نیند سو جانے والی وہ شخصیتیں جنہوں نے اپنی زندگی میں علم وادب کی شمعیں ہمیشہ روشن رکھیں اور اپنی تحریروں میں سماجی مطالعے کو قدر اول کی حیثیت دی ان میں نسیم امروہوی (۱۹۰۸ء۔۱۹۸۷ء) بہت ممتاز اور منفرد ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب، صحافی، نقاد، مورخ، ڈرامہ نگار، فرہنگ نویس، لغت نگار، مدیر، فارسی وعربی کے عالم، ماہر اقبالیات، ماہر لسانیات، مفسر، مترجم اور بچوں کے لیے شعری اور نثری مضامین تخلیق کرنے والی شخصیت ہیں۔

ہمارے ملک میں ایسی شخصیتیں انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ نسیم کا شمار بھی علم وادب کے اسی محدود حلقے میں ہوتا ہے جس نے شاعری اور نثر دونوں میں کام کیا۔ ان کی کثیر مطبوعہ کتابوں کے ساتھ غیر مطبوعہ اور قلمی نوادرات کا بھی ایک ذخیرہ ہے جو ان کے ورثاء کے پاس کراچی اور کوٹ ڈی جی (سندھ) میں موجود ہے اور جن سے استفادے کی مجھے تمام سہولتیں حاصل ہوئی ہیں۔

نسیم صاحب اس اعتبار سے تحقیق کا ایک بڑا موضوع ہیں کہ انہوں نے اردو زبان وادب کے لیے جتنا کام کیا ہے اپنی تمام زندگی اس کی ترویج کے لیے وقف کردی اور پے در پے ان کی تصانیف سامنے آتی رہیں اور جس طرح وہ مسلسل اپنے ملک کے لوگوں کے لیے لکھتے رہے اس انداز سے خود ان کی قلمی خدمات پر کوئی نمایاں کام نہیں کیا گیا۔ ان کے حوالے سے تحقیق کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ انہوں نے تاریخ، تہذیب، ثقافت اور زبان ولسانیات کے مطالعوں میں سماجیات کو بنیادی اہمیت دی۔

نسیم امروہوی پاکستان کے پہلے اخبار نویس اور صحافی ہیں جنہوں نے سندھی اور اردو میں مشترکہ اخبار خیر پور سے جاری کیا...... پاکستانی سماج کے حوالے سے ان کی متعدد نظمیں ایک نیا زاویہ خیال قائم کرتی ہیں......تاریخِ خیر پور، سندھ کی تاریخ سے بحثیت مورخ ان کی وابستگی کا ایک مثالی اظہار ہے۔

نسیم امروہوی تخلیقی ادب میں ایک باشعور اور سنجیدہ ادیب اور شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تخلیقی ادب سماجی مطالعہ کا معاون بھی ہے اور بسا اوقات رہنما بھی۔ سماجی نقطۂ نظر سے اولیت نسیم امروہوی کی کہانیوں اور افسانوں کو حاصل ہے دوسرے درجے پر ان کی درسی کتابیں ہیں جن کی تخلیق میں انہوں نے سماجی بہبود اور قدر افزائی کو سامنے رکھا ہے......انہیں پاکستان کا پہلا لغت نویس بھی کہا جا سکتا ہے۔ لغت نویسی میں بھی سماجی مطالعہ کے کئی زاویے نکلتے ہیں۔ عہدِ جدید کے اکثر و بیشتر ناقدوں نے انہیں بیسویں صدی کے صفِ اول کے مرثیہ نگاروں میں تسلیم کیا ہے۔ ان کی مرثیہ نگاری میں بھی سماجی زاویے موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک ایسی علمی و ادبی شخصیت جس نے اردو زبان و ادب کے لیے اتنی خدمات انجام دیں، ضروری ہے کہ ان خدمات کے ایک وسیع تحقیقی و سماجی مطالعے سے پہلے ہم اس پہلے باب میں ان کی سوانح و شخصیت کا ایک جامع مطالعہ کریں۔

تاریخِ ولادت

ہماری تاریخ میں اکثر ادیبوں، شاعروں، سیاسی و سماجی شخصیتوں اور رہنماؤں کی تاریخِ ولادت تحقیق کا موضوع رہی ہے۔ تاریخِ ولادت کے صحیح تعین نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انیسویں صدی کے آخر بلکہ بیسویں صدی کے نصف اول تک ہماری سماجی زندگی کا جو ڈھانچہ تھا اس میں اہم واقعات، کسی تقریب، خصوصاً بچے کی ولادت کی تاریخ محفوظ رکھنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ کسی خاص واقعے سے پیدائش کا زمانہ یاد کرلیا جاتا تھا مثلاً آندھی، زلزلہ یا ملکوں میں جنگ کی کوئی یادگار، یا خاندان کے کسی بزرگ یا کسی دوسرے کی موت کا زمانہ۔ لیکن لکھنے کا کوئی وہ رواج نہیں تھا جو آج ہمارے معاشرے میں عام ہوگیا ہے۔

> 'ہر خاندان کے بزرگ مختلف بچوں کی تاریخیں یاد رکھا کرتے تھے اور اس معلومات کو ان تک (اپنے بعد کے لوگوں تک) منتقل کردیا کرتے تھے پیدائش کی تاریخوں کے زبانی انتقال کا یہ طریقہ آج بھی برِ عظیم کے ہر خاندان میں جاری ہے۔'[۱]

۱۔ عبدالواحد معینی نقشِ اقبال، آئینۂ ادب (انارکلی لاہور: طبع اول ۱۹۶۹ء)، ص ۲۰

جوش ملیح آبادی اپنی سوانحِ حیات میں اپنے سنِ ولادت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'اس امر کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا اس لیے کہ میرے خاندان میں بچوں کی تاریخِ ولادت کے درج کرنے کا رواج ہی نہیں تھا'[۲]

برصغیر میں البتہ کچھ ایسے خاندان گزرے ہیں جن کی تاریخِ ولادت محفوظ کر لی جاتی تھیں یہ عموماً وہ خاندان ہیں جن کے یہاں آباؤ اجداد کے زمانے سے شعر گوئی کا سلسلہ تھا اور ہوتا یہ تھا کہ بچے کی ولادت کے موقع پر کوئی نہ کوئی شاعر ولادت کی تاریخ کا قطعہ ضرور لکھتا تھا جس کے آخری مصرع کے اعداد سے تاریخ کا اظہار ہوتا تھا۔ نسیم امروہوی کے والد، دادا پردادا سب ہی کا شمار معروف شعرا میں ہوتا تھا۔ خاندان میں کسی خاص موقع پر شعر ضرور کہے جاتے تھے۔ نسیم کے دادا شمیم امروہوی اپنے عہد کے بزرگ اور قابلِ قدر شاعروں میں شمار ہوتے تھے ان کے لاتعداد قطعات تاریخِ ولادت، تاریخِ وفات غیر مطبوعہ شکل میں آج بھی ان کے ورثاء کے پاس محفوظ ہیں۔

نسیم امروہوی کی ولادت پر ان کے دادا شمیم امروہوی نے ایک رباعی[۳] کہی جس کے چوتھے مصرعے کے اعداد ۱۳۲۶ رہوتے ہیں اور یہ ہجری اعتبار سے نسیم صاحب (قائم) کا سن ولادت ہے جس کا سن عیسوی ۱۹۰۸ء شمار ہوتا ہے۔ ان کے والد کی ایک تحریر بھی ان کے گھر میں موجود ہے جس میں ۲۷ر رجب مطابق ۲۴ر اگست بھی لکھا ہوا ہے[۴] انہی شہادتوں کی بنیاد پر نسیم نے اپنی خودنوشت میں یہ جملے لکھے ہیں:

'میں دوشنبہ ۲۷ر رجب المرجب ۱۳۲۶ھ، مطابق ۲۴ر اگست ۱۹۰۸ء کو بمقام ضلع مراد آباد، یو پی، آنحضرتؐ کی بعثتِ مبارکہ کے دن اپنے دادا فرزدق ہند حضرت شمیم امروہوی (شاعرِ دربار ریاست رامپور) کے دیوان خانے میں، جو بڑا امکان کہلاتا تھا فجر کے اس لمحے میں متولد ہوا جبکہ پڑوس کی مسجد کا موذن اذانِ صبح کی پہلی تکبیر دے رہا

۲۔ یادوں کی بارات (لاہور: مکتبۂ شعر و ادب، مئی ۱۹۷۵ء) ص ۲۷

۳۔ نسیم امروہوی کے صاحبزادے قسیم ابنِ نسیم کے قلمی نوادرات میں یہ رباعی محفوظ ہے:

شوقِ ہنر و کمال دائم رکھے
اونچے در خیبر سے عزائم رکھے
اے کاش اجل کا سر قلم کر کے شمیم
قائم کو خدا جہان میں قائم رکھے
(۱۳۲۶ھ)

۴۔ قلمی نوادرات قسیم ابنِ نسیم

تھا۔[۵]

ڈاکٹر صفدر حسین[۶] نے نسیم صاحب کا سن ولادت ۱۹۱۰ء جبکہ ڈاکٹر منظور مہدی رائے پوری[۷] اور مدثر حسین[۸] نے ۱۹۰۹ء لکھا ہے یہ سن تحقیقی طور پر درست نہیں ہیں۔ عظیم امروہوی[۹] مرزا امیر علی جونپوری[۱۰] ڈاکٹر ہلال نقوی[۱۱] ڈاکٹر طاہر حسین[۱۲] اور عنبرین نیازی[۱۳] نے اپنی تحریروں میں ۲۴/اگست ۱۹۰۸ء کی تاریخ درج کی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم بھی یہی درست سن ولادت یعنی ۱۹۰۸ء ہی لکھتے ہیں لیکن انہوں نے تاریخ ۲۴/اگست کے بجائے ۲۷/اگست لکھی ہے جو تحقیقی طور پر غلط ہے۔[۱۴]

نام

حبیب ریاض فاروقی نے لکھا ہے کہ:

"نسیم صاحب کے والدین کے گھر نسیم صاحب سے پہلے کئی بچوں کی ولادت ہوئی لیکن یہ سب کم عمری ہی میں انتقال کر گئے چنانچہ جب نسیم صاحب کی ولادت ہوئی تو دادا نے اس دعا کے ساتھ کہ خدا اس بچے کو قائم رکھے، قائم نام تجویز کیا گیا چنانچہ سید قائم رضا اصل نام رکھا گیا۔"[۱۵]

۵۔ خود نوشت سوانح حیات (لاہور: اظہار سنز اردو بازار ۱۹۸۶ء) ص ۱۲

۶۔ رزم نگارانِ کربلا (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء) ص ۳۵۱

۷۔ مراثی سجاد و منظور رائے پوری (کراچی: جاوید پریس، ۱۹۶۵ء) ص ۶

۸۔ نسیم امروہوی حیات اور کارنامے ایک نظر میں، مشمولہ ڈاکٹر محمد سیادت فہمی، نسیم امروہوی ایک تعارف (امروہہ: بزم حیات، جنوری ۱۹۹۱ء) ص ۲۳۵

۹۔ مرثیہ نگارانِ امروہہ (کراچی: اتحاد کمیٹی رجسٹرڈ کورنگی، ۱۹۸۴ء) ص ۴۹۸

۱۰۔ تذکرہ مرثیہ نگارانِ اردو (لکھنؤ: دانش محل امین آباد، اگست ۱۹۸۵ء) ص ۴۹۰

۱۱۔ مقدمہ فرہنگ اقبال فارسی (لاہور: اظہار سنز اردو بازار، ۱۹۸۹ء) ص ۵

۱۲۔ اردو مرثیہ میر انیس کے بعد (دہلی: غفار منزل جامعہ نگر، ۱۹۹۷ء) ص ۱۳

۱۳۔ اقبالیات اور نسیم امروہوی، مقالہ غیر مطبوعہ برائے ایم اے (مملوکہ پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۲

۱۴۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط (دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۸ء) ص ۲۳۸

۱۵۔ اوراقِ گزشتہ، مشمولہ سہ ماہی، جاوداں، کانپور شمارہ اپریل تا جون ۱۹۵۸ء، ص ۲۷

تخلص

اپنی ابتدائی زندگی میں نسیم صاحب قائم ہی تخلص کرتے تھے دورِ آغاز کی شاعری میں یہی تخلص ہر غزل اور نظم میں نظر آتا ہے: ؎

سنے گا کون امروہہ میں قائم کی غزل آخر
یہاں تو مصحفی امروہوی کا بول بالا ہے

نسیم امروہوی کے دادا شمیم امروہوی کے ایک شاگرد نواب سید باقر علی خاں نسیم نے ایک ادبی محفل میں اعلان کیا کہ وہ اپنے استاد شمیم کا ہم قافیہ تخلص قائم رضا کو عطا کر رہے ہیں آج سے ان کا تخلص نسیم ہوگا۔[۱۶] ان کی بعض کتابوں پر نسیم یزداں تقوی بھی لکھا ہوا ملتا ہے۔[۱۷]

آباؤاجداد

نسیم کے والد سید برجیس حسین، دادا جواد حسین شمیم، اور پردادا حیدر حسن یکتا کا تذکرہ 'شجراتِ امروہہ' میں ملتا ہے[۱۸] یہ تینوں شخصیتیں اہلِ قلم اور اہلِ سخن تھیں۔ والدہ کنیز سیدہ اگرچہ پرانی وضع ہی کی خاتون تھیں لیکن ان کے متعلق یہ ذکر ملتا ہے کہ شوہر اور خسر کے ماحول میں انہیں بھی شعر گوئی سے شغف تھا انیس و دبیر کے مرثیوں سے اتنی مانوس تھیں کہ خاندان کی لڑکیوں کو قرآن پڑھانے اور شرعی مسائل بتانے کے ساتھ مراثیٔ انیس کا درس بھی دیتی تھیں۔[۱۹] نسیم بہت کم عمر تھے کہ والد انتقال کر گئے اور یہ پھر دادا شمیم امروہوی کی سرپرستی میں آ گئے شمیم صاحب اپنے زمانے کے نامور شاعر تھے زبان و بیان پر ایسی دسترس تھی جو ان کے ہم عصر شعرا میں شاید ہی کسی کو حاصل رہی ہو۔ عربی زبان کے مشہور شاعر فرزدق کی مدح خوانی اور علمی شخصیت کی نسبت سے شمیم صاحب کو فرزدقِ ہند کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔[۲۰]

۱۶۔ ارشد امام، امروہہ کے بزرگوں کے کچھ احوال، مشمولہ ہماری خبریں 'خبرنامہ' راولپنڈی، ۱۸ ستمبر ۱۹۶۱ء، ص ۱۱

۱۷۔ نسیم یزداں تقوی امروہوی 'ابوالکمال' (لاہور: کشمیری بازار، جنوری ۱۹۴۹ء)

۱۸۔ مولوی سید بشیر حسین، شجراتِ ساداتِ امروہہ (کراچی: مسلم پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۰ء) ص ۱۳۴

۱۹۔ سید تصویر حسین، نسیم امروہوی کے بنیادی نظریات، مشمولہ عرفان نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۷۴ء)، ص ۳۰

۲۰۔ اشفاق حسین بیکس، فرزدقِ ہند شمیم امروہوی، مشمولہ مجلہ کراچی (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ستمبر ۱۹۶۵ء)، ص ۳۰

نسیم کا وطن امروہہ

نسیم کی ولادت امروہہ میں ہوئی ان کے آباؤ اجداد اور بزرگ صدیوں سے یہاں آباد تھے۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی نے لکھا ہے کہ:

'امروہہ ہندوستان کے صوبے اتر پردیش کی ایک قدیم ترین بستی ہے۔ مراد آباد سرکاری گزیٹر کے مطابق امروہہ کی بنیاد ۴۷۴ سال قبلِ مسیح یعنی ڈھائی ہزار سال پہلے پڑی تھی مشہور مسلمان مورخ مسعودی ۹۱۵ء میں ہندوستان آیا تھا۔ اسلامی عہد میں سپہ سالار مسعود غازی نے امروہہ اور سنبھل کے قلعے فتح کیے تھے۔'[۲۱]

مشہور سیاح ابنِ بطوطہ ۱۳۴۰ء میں امروہہ پہنچا تھا اس نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ:

'پھر ہم امروہہ پہنچے یہ ایک خوبصورت سا چھوٹا سا شہر ہے۔'[۲۲]

قرۃ العین حیدر نے کارِ جہاں دراز ہے میں امروہہ کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

'سارا قصبہ امروہہ ایک وسیع جھیل پر منعکس ہے موسمِ بہار کی شفاف دھوپ میں قصبے کی قدیم مساجد و مقابر اور دو منزلہ مکانات کے گنبد، مینارے اور کنگورے نیل گوں سطحِ آب پر مغل اسکول کے کسی خوش رنگ لینڈ اسکیپ کے مانند جھلکتے ہیں۔'[۲۳]

اہلِ امروہہ کے مورثِ اعلیٰ ایک صوفی بزرگ حضرت شاہ ولایت تھے ۸۳۷ھ میں ان کی وفات ہوئی ان کے مزار کی یہ کرامت مشہور ہے کہ وہاں بچھو نہیں کاٹتے[۲۴]

قدیم تاریخی تذکروں تاریخِ اصغری، تاریخِ واسطیہ، ثمراتِ القدس، عمدۃ الطالب، ریاض الانساب، تواریخِ واسطیہ، گلزارِ شمس تبریز اور تاریخِ سادات امروہہ سے استفادہ کرتے ہوئے ضمیر اختر نقوی نے ان کا نام شرف الدین بتایا ہے۔[۲۵] امروہہ کے متعلق ایک یہ شہادت بھی ملتی ہے کہ پہلے اس کا نام عزیز پور تھا لیکن حضرت شاہ ولایت جو یہاں کے مورثِ اعلیٰ تھے انہوں نے یہاں کی پیداوار آم اور رہو مچھلی کی

۲۱۔ دبستانِ امروہہ، مشمولہ 'آجکل' نئی دہلی، شمارہ جون ۱۹۸۱ء، ص ۳۸

۲۲۔ بحوالہ علی امام، امروہہ کا تاریخی پس منظر، مشمولہ سہ ماہی میراث اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۷

۲۳۔ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء) ص ۱۷۸

۲۴۔ سید قمر رضی، امروہہ فیوض و برکات شاہ ولایت کے سائے میں، مشمولہ 'خبر نامہ' (کراچی: سادات امروہہ، مئی ۱۹۸۱ء) ص ۲۷

۲۵۔ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت، حالات و کرامات (کراچی: ابنِ حسن آفسٹ پریس، ۱۹۸۹ء) ص ۲۵

نسبت سے اسے امروہہ کا نام دیا۔ [۲۶]

احمد حسین صدیقی امروہہ کی بستی کے متعلق لکھتے ہیں:

'ہمالیہ کے دامن میں اس بستی کا کچھ عجیب رنگ ہے یہاں کتنے ہی مذاہب کے لوگ آباد ہیں لیکن ان کے رہنے سہنے کے انداز میں آج بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی وہی بزرگوں کا ادب واحترام وہی سادگی اور وہی قناعت پسندی جو انہیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی۔' [۲۷]

نسیم جس سرزمین پر پیدا ہوئے اس کے سماجی حالات کے متعلق رئیس امروہوی نے لکھا ہے کہ:

'عورتوں پر بالعموم کوئی معاشی ذمہ داری نہ تھی۔ ہر خاندان اپنی جگہ ایک مضبوط اکائی تھا۔ لڑکیوں کو رشتہ ملنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوتی تھی۔ شادی کی رسوم تو بہت سی تھیں مگر جہیز کے مطالبات بہت کم تھے۔ اولاد کی شادیاں ماں باپ کی مرضی سے ہوتی تھیں۔ مختصر یہ کہ صدیوں سے جو نظامِ اقدار، رہنے سہنے کے جو ڈھنگ، کھانے پینے کے جو آداب، سونے جاگنے کے جو معمولات اور مرنے جینے کی جو رسوم سوسائٹی میں رائج تھیں، انہیں لوگ مذہبی شعائر و عبادات کی طرح مقدس و محترم سمجھتے تھے۔ معیارِ زندگی کے نام سے آج کے معاشرے میں جو نشیب و فراز پیدا کیا گیا ہے، لوگ اس سے آشنا نہ تھے۔

مذہبی تعصبات اس زمانے میں بھی تھے۔ گروہی اور جماعتی رشتے اس وقت بھی ناقابلِ شکست تھے۔ رنگ و نسل کا فرق بہ دستور قائم تھا لیکن، وقت کی سیاسی تحریکیں ان جہالتوں اور تعصبات سے گرد آلود نہ تھیں، فقہی عقائد اور سیاسی تحریکیں ایک دوسرے سے آلودہ اور ملوث نہ ہوئی تھیں مسجدیں صرف مسجدیں تھیں، فرقہ وارانہ تصادم کی رزم گاہیں نہ تھیں۔ یہ تھی وہ جمی جمائی، بجی سجائی اور بنی بنائی زندگی جو ہم نے اپنے آباو اجداد سے ورثے میں پائی تھی۔' [۲۸]

۲۶۔ عاشور کاظمی، بیسویں صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، اشاعت دوم، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۷۰

۲۷۔ کشورِ اولیاء (کراچی: فضلی بک سینٹر، ۱۹۹۹ء)، ص ۲۸

۲۸۔ خود نوشت، مشمولہ عبادت، سہ ماہی، حیدر آباد، سندھ، اپریل تا دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۳۳

نسلی سلسلہ

امروہہ میں جو مختلف نسلیں آباد تھیں ان میں سب سے معروف نقوی سادات ہے۔ جس کے مورثِ اعلیٰ حضرت شرف الدین شاہ ولایت ہیں ان صوفی بزرگ کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ نقوی سادات کے بعد وہاں کی دوسری معروف نسل تقوی سادات کی ہے۔ یہ حضرات حضرت علیؓ کی نسل کے ایک فرزند حضرت تقیؓ کی اولاد ہیں ڈاکٹر صفدر حسین انہی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'ایک گھرانہ جو حضرت امام تقی کی نسل سے ہے یہاں ہمایوں بادشاہ کے وقت سے چلا آتا ہے اس خانوادۂ علم وادب کے مورثِ اعلیٰ شہنشاہ بابر کے ہمراہ سبزوار سے ہندوستان آئے تھے ان کی اولاد اول زید پور (ضلع بارہ بنکی) میں آباد ہوئی تھی جہاں سے اشرف دانشمند ترکِ سکونت کر کے امروہہ آ گئے تھے سید اشرف دانشمند کا رشتہ امروہہ کے قدیم نقوی گھرانے میں ہوا تھا اسی لیے یہاں کے سربرآوردہ خاندانوں سے ان کی نسل کا گہرا تعلق رہا ہے۔ سادات کی یہ نئی شاخ اپنے مورث کے بسائے ہوئے محلّہ دانشمند میں آباد ہوئی تھی حضرت نسیم امروہوی اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔'[۲۹]

مرزا امیر علی جونپوری نے انہیں نقوی لکھا ہے[۳۰] جبکہ نسیم تقوی النسل ہیں اور امروہہ کے محلّہ دانشمند سے ان کا تعلق ہے۔ سید محمد اشرف دانشمند جن کے نام سے یہ محلّہ منسوب ہے ان کے متعلق شجراتِ امروہہ کے مولف نے لکھا ہے کہ وہ ایک بڑے عالم تھے ان کا لقب دانشمند تھا اور یہ لقب ان کی دانشمندی کو دیکھتے ہوئے بادشاہ نے عطا کیا تھا[۳۱] ساداتِ امروہہ پر تحقیق کرتے ہوئے سید جرار حیدر نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ 'اصابتِ رائے اور علمی کمالات کے سبب دربار شہنشاہِ ہند سے انہیں دانشمند خطاب عطا ہوا تھا۔'[۳۲]

تربیت و تعلیم

اپنے خاندان کے علمی و ادبی پس منظر کے زیرِ اثر نسیم نے بہت کم عمری میں پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے

۲۹۔ مقدمہ، مراثی نسیم، جلد اول (کراچی: ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک، ۱۹۶۲ء)، ص ۶

۳۰۔ تذکرہ مرثیہ نگارانِ اردو (لکھنؤ: دانش محل، اگست ۱۹۸۵ء)، ص ۴۹۰

۳۱۔ مولوی سید بشیر حسین، شجراتِ ساداتِ امروہہ (کراچی: مسلم پرنٹنگ پریس ۱۹۶۱ء)، ص ۱۲۷

۳۲۔ تعارفِ ساداتِ امروہہ، مشمولہ مجلّہ سادات امروہہ (دہلی: جمال پریس، نومبر ۱۹۷۹ء)، ص ۲۸

متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ ساڑھے تین سال کی عمر میں انہوں نے پڑھنے کا آغاز کیا۔ چھ سال کی عمر میں ختم قرآن اور اردو کی ابتدائی تعلیم مکمل کی[۳۳] ۱۹۲۱ء میں جبکہ ان کی عمر ابھی صرف ۱۳ ربرس تھی انہوں نے شبلی کی کتاب موازنۂ انیس و دبیر اور اقبال کی نظم شکوہ و جواب شکوہ کو اپنے مطالعے کا حصہ بنالیا تھا[۳۴] جامعہ نور المدارس امروہہ میں فارسی و عربی کی تعلیم کے بعد دہلی اورینٹل کالج میں منشی فاضل کا امتحان دیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی مولانا سید مرتضیٰ حسین اور مولانا یوسف حسین مجتہدین کی شبانہ روز محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ مولوی فاضل عالم فاضل، اور نورالا فاضل (درسِ نظامی) کے امتحانات مختلف اوقات میں مختلف نمبروں سے پاس کرلیے اس کے علاوہ بھی انہوں نے تعلیمی میدان میں کئی اسناد حاصل کیں[۳۵] الہ آباد بورڈ اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی، اس کے بعد کامل، مولوی عالم، فاضل ادب مع انگریزی، فاضل فقہ (درسِ نظامی) اور نور اللہ فاضل کی اسناد حاصل کیں۔[۳۶]

شعر کی پہلی خوانند گی

نسیم صاحب کے دادا شمیم امروہوی پر اپنے تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر عظیم امروہوی لکھتے ہیں:

> 'جب شمیم امروہوی دربار رامپور سے وابستہ تھے اور نواب رام پور کے استاد نواب حامد علی خاں کے استاد بھی تھے تو ان کے یہاں ایک مجلس میں نسیم نے اپنی کمسنی میں اپنے دادا کی پیش خوانی کے طور پر چند رباعیات پڑھیں جن سے خوش ہوکر ہمت افزائی کے لیے نواب رامپور نے چاندی کے سکوں کا ایک توڑا انہیں انعام کے طور پر دیا۔ اس موقع پر شمیم صاحب نے اطمینان آمیز انداز میں کہا کہ میرا وارث پیدا ہوگیا ہے اس وقت نسیم کی عمر پانچ یا چھ سال تھی۔[۳۷]

۳۳۔ شمیم رضا ندیم، گلہائے صد رنگ (کراچی: عظیمی پرنٹرز، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۱۲

۳۴۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، سوانحی خاکہ، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۲

۳۵۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن، ترجیحات (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۹۸ء)، ص ۶۶

۳۶۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی، مرثیہ نگارانِ امروہہ (کراچی: اتحاد کمیٹی کورنگی، ۱۹۸۴ء)، ص ۴۹۹

۳۷۔ شمیم امروہوی حیات اور کارنامے (مقالہ غیر مطبوعہ) روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی، ۱۹۹۹ء، فوٹو اسٹیٹ نقل بشکریہ ڈاکٹر عظیم امروہوی مقیم امروہہ یوپی

شعر گوئی کی ابتداء

قسیم ابنِ نسیم اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

'اپنے خاندانی ماحول کے اثرات تھے جب انہوں نے بہت ہی کم عمری میں شعر کہنے کا آغاز کیا۔ اگر چہ انہوں نے اپنی خودنوشت میں یہ لکھا ہے کہ وہ گیارہ سال کے تھے جب انہوں نے نعت کا یہ شعر کہا: ؎

ہمارے محمدؐ تمہارے محمدؐ
سب ہی اُمتی کے سہارے محمدؐ

لیکن میرے پاس بہت بوسیدہ کاغذ پر اپنی پھوپھی مہر بانو کی جو میرے والد کی حقیقی بہن تھیں اور ان سے عمر میں کم از کم دس برس بڑی تھیں، ایک تحریر لکھی ہوئی ملی ہے کہ قائم رضا (نسیم امروہوی) نے ۹ رسال کی عمر میں یہ شعر کہا تھا۔ شاید یہ اس کا پہلا شعر ہے ؎

مرے والد ہوئے شاعر، مرے دادا ہوئے شاعر
مجھے بھی شعر کہنے کا سلیقہ آ ہی جائے گا

ان کی ولادت ۱۹۰۸ء کی ہے اس لیے میرے والد کا یہ شعر ۹ رسال کی عمر کے حوالے سے ۱۹۱۷ء کا ہوا۔'[۳۸]

مشق وریاضت کا دور

ایک تو نسیم صاحب کے خاندان خصوصاً ان کے اپنے گھر کا ادبی ماحول دوسرے خود ان کی طبیعت میں علم و ادب کا پیدائشی وفطری ذوق اور تیسرے امروہہ میں شعر وسخن کی مجموعی فضا ان تمام اثرات میں نسیم نے مشاہدے، مطالعے اور شعری ریاضت پر بڑی توجہ دی امروہہ کے لوگوں میں شعر وادب سے اتنا تعلق پایا جاتا تھا کہ مسجدوں تک میں مذہبی حوالے سے شعری محفلیں ہوتی تھیں، حمد ونعت اور سلام ومنقبت کے ادبی جلسے اکثر منعقد ہوتے تھے اور صرف یہی نہیں ہے کہ شعر ہی پڑھے جاتے تھے۔ ارمغانِ نسیم میں لکھا ہے کہ:

'انجمن اصلاحِ معاشرت امروہہ کے زیرِ اہتمام جامع مسجد کے کتب خانے میں شعر خوانی

۳۸۔ مکتوب قسیم ابنِ نسیم بنام مہر النساء عزیز، مرقومہ ۷ار اپریل ۲۰۰۲ء کراچی

کی محافل ہوتی تھیں اور فوراً بعد ان پر ادبی مباحث کا سلسلہ بھی ہوتا تھا۔' [۳۹]

شعری ریاضت اور ادبی مشقت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ امروہہ میں سخن شناسی، ادب دوستی اور ریاضت شعری کا تذکرہ کرتے ہوئے جون ایلیا نے لکھا ہے کہ:

'ہمارے بزرگوں کے زمانے کا یہ خاص دستور تھا کہ استاد اپنے ہونہار تلامذہ سے ملک الشعراء فیضی کا دیوان قلمی کراتے تھے۔' [۴۰]

اپنی ۱۳ربرس کی عمر کے زمانے کا تذکرہ کرتے ہوئے نسیم صاحب لکھتے ہیں:

'اس وقت میری عمر ۱۳ رسال سے کچھ بیش تھی اور کافیہ، شرح تہذیب، مختصر نافع اور قصیدہ فرزدق وغیرہ پڑھ رہا تھا، فارسی کے دو امتحانات کے کورس میں بیان و بدیع اور قافیہ کی بحثیں بھی میری نظر سے گزر چکی تھیں۔ آبِ حیات، مقدمہ حالی، شعر العجم اور شعر الہند کے مباحث بھی یاد تھے۔ اس حقیقت کے اظہار کی غرض یہ ہے کہ شعر و سخن کے لیے جتنی دماغی تربیت درکار رہے وہ بڑی حد تک اس وقت تک ہو چکی تھی۔' [۴۱]

پہلی غزل

تقریباً ۹ رسال کی عمر میں انہوں نے پہلا شعر کہا تھا پھر جب ان کی عمر ۱۴ رسال کے قریب تھی انہوں نے کچھ ایسے اشعار کہے جس میں اپنے دادا کا ذکر کیا بعد میں چند اور شعر کہہ کر اس میں شامل کر لیے اس طرح اس کا رنگ غزل کا ہو گیا ہم ان اشعار کو ان کے بالکل ابتدائی اشعار یا پہلی غزل بھی کہہ سکتے ہیں: ؎

دکھوں کو میں نے آغوشِ محبت میں جو پالا ہے
اسی سوزِ جگر سے میرے سینے میں اُجالا ہے

تمہارے ہجر میں کیا کیا مصائب ہم نے جھیلے ہیں
کہ اب یہ دل نہیں ہے درد سے لبریز پیالہ ہے

۳۹۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، مطبوعہ فروری ۱۹۹۲ء، ص ۲

۴۰۔ مقدمہ 'کلیاتِ رئیس امروہوی' (کراچی: ویلکم بک پورٹ، اشاعت اول ۱۹۹۵ء)، ص ۳۱

۴۱۔ خودنوشت (لاہور: اظہار سنز اردو بازار، ۱۹۸۶ء)، ص ۵

مرا بچپن بہت تکلیف دہ حالات میں گزرا
مرے والد نہ تھے مجھ کو تو خود دادا نے پالا ہے

میں اپنے دل کی حالت کس طرح دنیا کو بتلاؤں
مقفل ہے مرا سینہ مرے ہونٹوں پہ تالا ہے

سنے گا کون امروہہ میں قائم کی غزل آخر
یہاں تو مصحفی امروہوی کا بول بالا ہے[۴۲]

وطن کے حوالے سے پہلی نظم

۱۹۲۳ء میں جبکہ نسیم کی عمر صرف پندرہ برس تھی انہوں نے اپنے وطن امروہہ کے تعلق سے ایک نظم لکھی یہ ان کی پہلی نظم ہے جو مسدس کی شکل میں تھی بعد میں انہوں نے اسے 'گلِ خوش رنگ' کے عنوان سے مرثیے میں تبدیل کر دیا۔ اس نظم میں انہوں نے اپنے ہم عمر نو جوانوں کے ان خیالات پر تنقید کی ہے جن کا حاصل یہ تھا کہ وہ کسی قسم کی تجارت اور کاروبار کو اپنے لیے برا سمجھتے تھے۔ ان نو جوانوں کا خیال یہ تھا کہ ہم سادات ہیں اور ان کے نزدیک سادات کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس قسم کے کام کرے نسیم کی زندگی کا یہ بہت اہم دور ہے جب ان کے دل و دماغ میں معاشرے کی بدلتی ہوئی قدروں کا احساس اُجاگر ہوا ہے۔

درس و تدریس میں محنت و مشقت کا دور

نسیم امروہوی کے ہم عصر اور ہم وطن معروف شاعر رئیس امروہوی، نسیم کی نو جوانی کے اس زمانے کا ذکر اپنے ایک مضمون میں کرتے ہیں جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے اور درس و تدریس کے انتہائی محنت و مشقت کے دور سے گزر رہے تھے۔ ۱۷، ۱۸ رسال کی عمر کے نسیم کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ:

'وہ تڑکے میں اذان سے پہلے اُٹھتے ہیں اور ضروریات سے اتنی جلد فارغ ہو جاتے ہیں کہ اذان ہوتے ہی فریضۂ صبح ادا کر کے گھر سے نکل پڑتے ہیں اور سیدھے ہمارے محلے

۴۲۔ نسیم امروہوی کی یہ مکمل غزل امروہہ کے ایک بزرگ سید مزمل حسین کی قلمی بیاض سے نقل کی گئی

کی طرف سے گزرتے ہوئے مدرسہ باب العلم نوگانواں سادات میں پڑھانے کے لیے پیدل چلے جاتے ہیں۔ یہ نوگانواں سادات کا ایک قصبہ ہے جو ایک کچی سڑک کے ذریعے ہمارے محلے سے تقریباً ۷ میل کے فاصلے پر واقع ہے نسیم صاحب کے گھر سے کوئی ۲/۱۔۸ میل دور ہوگا راستے میں گنجان بانسوں کا ایک بھیانک بن پڑتا ہے دوپہر تک وہاں عربی کی درسیات پڑھانے کے بعد امروہہ واپس آتے ہیں اور یہاں چار بجے سے مغرب تک دارالعلوم نورالمدارس کے طلبا کو عربی کے مختلف علوم پڑھاتے ہیں اس طرح آپ روزانہ تقریباً ۱۷ میل پیدل چلتے ہیں۔ دن بھر تعلیم میں منہمک رہتے ہیں اور رات کو دس گیارہ بجے تک کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور اسی میں کچھ وقت شعروشاعری کے لیے نکال لیتے ہیں۔' [۴۳]

نسیم نے اپنی نامکمل خودنوشت میں جو کہ ۱۹۳۲ء تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے بعض ذیلی سرخیوں کے تحت اپنی زندگی کے ابتدائی ادوار کے کچھ پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ شیرخواری سے یتیمی تک، والد کی رحلت سے دادا کی رحلت تک، دادا مرحوم کا علمی وادبی اثاثہ، نانا کی سرپرستی کا دور، والدہ کی سرپرستی اور نگرانی کا زمانہ لڑکپن میں شعروسخن کا مشغلہ امروہہ نوگانواں اور میرٹھ کی درسگاہوں میں ملازمت کے ذیل میں انہوں نے بعض حالات و واقعات کا ذکر کیا ہے۔ [۴۴] جس سے ان کی زندگی کی بہت سی تصویریں ہمارے سامنے آتی ہیں جو ان کے تعلیمی ذوق، درس و تدریس میں انتھک محنت، مطالعے اور مشاہدے کی تڑپ اردو کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی زبانوں سے آگہی پر روشنی ڈالتی ہیں۔

بحیثیت استاد

نسیم امروہوی کے صاحب زادے قسیم ابن نسیم نے میرے خط کے جواب میں اپنے والد کی تعلیمی و تدریسی ذمہ داریوں کے متعلق لکھا ہے کہ:

'والد گرامی (نسیم صاحب) پہلے پہل امروہہ کے نورالمدارس میں عربی کے استاد مقرر ہوئے پھر باب العلم نوگاواں میں صدر مدرس ہوئے۔ منصبیہ عربی کالج میرٹھ میں معلم

۴۳۔ نسیم امروہوی کی شخصیت، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۷۴ء)، ص ۳۸۸

۴۴۔ خودنوشت سوانح حیات (لاہور: اظہار سنز اردو بازار ۱۹۸۶ء)، ص ۲۲ تا ۸۸

عربی و فارسی رہے جو بلی انٹر کالج لکھنؤ میں بھی عربی کے استاد رہے۔ چرچ مشن ہائی
اسکول لکھنؤ میں ہیڈ مولوی رہے اور تقسیم سے پہلے ان کی تعلیمی خدمات شعبۂ فارسی
اورینٹل کالج سے وابستہ تھیں یہاں وہ پروفیسر وانچارج تھے۔'[۴۵]

شادی

۱۹۲۷ء میں نسیم صاحب نے فاضل ادب کی ڈگری الٰہ آباد بورڈ سے حاصل کی اس وقت ان کی عمر ۱۹ ربرس تھی اسی سال ان کی شادی امروہہ کی ایک محترم شخصیت سید ریاض الحسن نقوی کی صاحبزادی سیدہ عابدہ خاتون سے قرار پائی۔ شادی میں خاندان کے جملہ افراد کے علاوہ امروہہ کی معزز شخصیات اور علما و شعراء نے بھی شرکت کی۔ یہ شادی نسیم صاحب کی سادہ مزاجی اور سنت رسولؐ کے حقیقی پہلوؤں کی پیروی کا ایک عکس کہی جاسکتی ہے۔ نسیم صاحب نے اپنی خودنوشت میں اس حوالے سے لکھا ہے کہ:

'یہ بات پہلے ہی دو معتبر اشخاص کے ذریعے خسر معظم مرحوم سے طے کر لی گئی تھی کہ یہ شادی نہایت سادگی سے ہوگی اور خوشی کے جوش میں کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جائے گا جو شرعاً یا اخلاقاً ممنوع یا مکروہ ہو اور مرحوم نے صمیم قلب سے اس گذارش کو قبول کر لیا تھا چنانچہ ۲۴ ردسمبر ۱۹۲۷ء کو ساداتِ امروہہ میں شادی کی یہ پہلی اور (شاید) آخری مثال تھی جس میں وہ تمام رسمیں جو مسلمانوں میں دوسری ہم سایہ قوموں کے خلا ملا سے منتقل ہوگئی تھیں (اور اب بھی ہیں) یک قلم نظر انداز کر دی گئیں تھیں نہ کپڑوں اور دیواروں پر گلابی رنگ کا چھڑکاؤ تھا نہ ابٹن نہ مہندی نہ رت جگا نہ ڈھول ڈھولک کا دھوم دھڑکا نہ گیت نہ کوئی ریت۔'[۴۶]

نسیم صاحب کی شادی کی یہ سادگی اور رسوم و روایات سے یہ کنارہ کشی ان کی سوانحِ حیات کا ایک بہت اہم پہلو ہے جس سے آئندہ کے صفحات میں ان کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد مل سکے گی۔

۴۵۔ مرقومہ ۱۷راپریل ۲۰۰۲ء

۴۶۔ خودنوشت سوانحِ حیات (لاہور: اظہار سنز اردو بازار، ۱۹۸۶ء)، ص ۹۰

پہلی نثری تالیف

نسیم کی تعلیمی زندگی اوران کے مطالعاتی دور کا ایک بہت اہم حصہ عربی زبان وادب سے ان کا ذہنی رشتہ ہے۔ انہیں اس زبان پر بہت جلد اتنی دسترس حاصل ہوگئی تھی کہ نہ صرف عام طالب علم بلکہ ان کے وطن امروہہ کے وہ نوجوان جنہیں دینی علوم سے شغف تھا اور جو بعد میں علما کی حیثیت سے جانے پہچانے گئے عربی کی تعلیم میں ان کے شاگرد تھے۔ جون ایلیا نے سید محمد عبادت، مولانا سید صفی مرتضیٰ، مولانا عبدالقدوس اور مولانا نسیم احمد فریدی کو ان کے شاگردوں میں شمار کیا ہے۔[۴۷] اسی زمانے میں عربی کے ساتھ فارسی ادب بھی ان کے مطالعے میں رہا۔شبلی نعمانی کی شعرالعجم اپنی نوعمری کے زمانے میں وہ باقاعدہ پڑھا کرتے تھے۔[۴۸] عربی و فارسی پرانہیں بہت جلد اتنی دسترس حاصل ہو چکی تھی کہ انہوں نے ملامحسن فیضی کی تفسیر صافی اور معیارالاشعار طوسی کے عربی زبان میں خلاصے کیے[۴۹] لیکن باقاعدہ طور پر ان کی پہلی نثری تصنیف اردو کے نامور شاعروں میرتقی میراور مرزاغالب کے کلام کی شرح کا کام ہے۔[۵۰]

نصابی کتابوں کی ترتیب وتدوین کا پہلا دور

'شرح کلام میرو غالب' کی اشاعت کے فوراً بعد اسے الٰہ آباد بورڈ نے اپنے نصاب میں شامل کرلیا اور یہیں سے نسیم صاحب کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو طالب علموں کے لیے ادبی نصاب کی تیاری کا دور کہا جاسکتا ہے۔اس میں بچوں کے لیے بھی نصابی کتابوں کے بڑے پیمانے پر تیاری شامل ہے۔اس مقالے کے چوتھے باب 'بچوں کا ادب اورسماجی اقدار کی تقسیم' میں اس موضوع پر بحث کی جائے گی، اپنی خودنوشت میں نسیم صاحب لکھتے ہیں:

> 'شعروسخن پر ہی منحصر نہیں ہر معاملے میں راقم الحروف کا معاملہ یہ ہے کہ جب مشکل کام در پیش ہوتا ہے اور صمیم قلب سے اسے مکمل کرنے کا عزم کر لیتا ہوں تو پھر طبیعت پوری طرح اسی طرف اور صرف اسی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور جب تک وہ کام سرانجام نہ پا جائے کسی اور طرف رجحان نہیں ہوتا۔ گویا ایک قسم کی ضد پیدا ہو جاتی ہے کہ اس مہم کو سر

۴۷۔ نسیم امروہوی کی شاعری کا علمی پس منظر، مشمولہ عرفان نسیم (کراچی: انجمن سادات امروہہ، ۱۹۷۴ء)، ص ۳۶۹

۴۸۔ ادریس اکبر، امروہہ میری یادوں میں، کتابچہ مطبوعہ، ۱۹۶۱ء خیر پور، ص ۱۷

۴۹۔ ساجد طفیل، اردو میں مشرقی زبانوں کے ماہرین، مجلّہ دفترِ علوم (مرادآباد الیاس پریس، ۱۹۵۸ء)، ص ۱۱

۵۰۔ نسیم امروہوی، شرح کلام میرو غالب (الٰہ آباد: انواراحمدی پریس ۱۹۲۸ء)

کر کے ہی چھوڑوں گا۔ چنانچہ مجھے ہائی اسکول کی ملازمت کے دوران ایک دفعہ اس بات کا شوق پیدا ہوگیا کہ مجھے بورڈ کے امتحان کا ممتحن ہونا چاہیے اس میں سب سے بڑی رکاوٹ تو یہ تھی کہ میں نے فارسی و عربی کی اعلیٰ اسناد تو حاصل کر لی تھیں، مگر انگریزی صرف اسی قدر جانتا تھا، جتنی فاضل ادب (عربی) کے نصاب میں شامل تھی یعنی مڈل اسکالرشپ کے معیار کے برابر۔ پہلے ارادہ پیدا ہوا اور پھر مسلسل جد و جہد شروع کر دی نتیجے میں دو سال کی کوشش کے بعد اول ورنا کیولر فائنل کا پھر میٹرک کا اور آگے چل کر لکھنؤ یونیورسٹی کے دبیر کامل کا ممتحن ہوگیا۔ آج پاکستان میں صدہا اشخاص ایسے ہیں جن کے پرچے میں نے جانچے تھے۔ اسی طرح مجھے ایک بار درسی کتابیں لکھنے اور انہیں محکمۂ تعلیم سے مختلف جماعتوں کے نصاب میں داخل کرانے کا شوق پیدا ہوا کوشش کرتا رہا، مانٹیسوری اصول تعلیم اور ڈالٹن پلان سے لے کر استقرائی طرز تک مہارت حاصل کرنے میں دن رات ایک کر دیے۔ شوق ہی جو تھا۔ عشق ازیں بسیار کرداست و کند۔ محنت اور سعی و کوشش میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی بالآخر کامیابی کی منزل پر پہنچ گیا اور ایک وقت آیا کہ میری کتابیں یو پی کی پرائمری ایجوکیشن، میٹرک، انٹر میڈیٹ اور لکھنؤ یونیورسٹی کے بی اے آنرز تک کے نصاب میں شامل ہوگئیں۔'[۵۱]

منصبیہ کالج میرٹھ میں درس و تدریس

ایک بڑے پیمانے پر نصابی ادب کی تیاری کے اسی زمانے میں نسیم صاحب امروہہ اور نوگانواں کی تعلیمی درسگاہوں میں عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب کی تعلیم دینے سے وابستہ رہے۔ یہ ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء ہی کا دور تھا جب معلم عربی کے طور پر ان کی تقرری منصبیہ عربی کالج میرٹھ میں ہوگئی یہ نسیم صاحب کی علمی و ادبی زندگی کا امروہہ اور نوگانواں کے بعد دوسرا اہم دور تھا۔ ۱۹۳۲ء کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے 'تذکرہ شعرائے میرٹھ' کے مولف نے لکھا ہے:

'حضرت نسیم امروہوی نے ۱۹۳۲ء میں مختلف موضوعات پر نفسیاتی اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نظمیں لکھنا شروع کیں میرٹھ کے اخبار تربیت میں پہلی بار یہ نظمیں طبع

۵۱۔ خودنوشت سوانحِ حیات (لاہور: اظہار سنز اردو بازار، ۱۹۸۶ء)، ص ۸۰

ہوئیں۔'[۵۲]

دوسری شادی

نسیم صاحب کی صاحبزادی سیدہ قائمہ خاتون (مقیم کراچی) نے مجھے بتایا کہ:

'ہمارے والد نسیم صاحب کی پہلی بیوی عابدہ خاتون سے جو اولادیں ہوئیں وہ کمسنی ہی میں انتقال کر گئیں ۱۹۳۳ء میں ان کی دوسری شادی سیدہ معجزہ خاتون دختر سید زاہد حسین امروہوی سے ہوئی نسیم صاحب کی موجودہ اولادیں انہی سے ہیں۔ معجزہ خاتون لکھنؤ کے معروف محقق اور پاکستان میں مراثیٔ انیس کے مرتب نائب حسین نقوی کی حقیقی بہن تھیں۔ یہ ہماری امی تھیں۔' (ملاقات ۲۷ / اکتوبر ۲۰۰۱ء)

لکھنؤ کی تہذیبی اور ادبی فضا کے ۱۸ / رسال

لکھنؤ کے معروف علمی و تعلیمی ادارے جوبلی انٹر کالج میں عربی کے لیکچرار کی حیثیت سے نسیم صاحب کی ۱۹۲۹ء میں تقرری ہوئی[۵۳] جس کے ساتھ ہی وہ میرٹھ سے لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ اس شہر میں نسیم صاحب کے قیام کے ۱۸ / برسوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے کہ:

'۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۸ء تک لکھنؤ کی تہذیبی اور ادبی فضا نے ان کی مشقِ سخن کو جلا بخشی۔'[۵۴]

نسیم صاحب کی زندگی کا وہ دور جو تقسیم سے پہلے ہندوستان میں گزرا اس کے وہ ۱۸ / برس جن کا تعلق لکھنؤ کے دور سے ہے اور جن کی طرف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اشارہ کیا ہے، نسیم کی زندگی کا تہذیبی، علمی اور ادبی اعتبار سے اہم دور قرار دیا جائے گا لکھنؤ کے ایک بہت بزرگ عالم دین جناب ناصر حسین المعروف ناصر الملت کی علمی صحبتوں میں نسیم صاحب کے اٹھنے بیٹھنے کا یہی زمانہ تھا، جوش ملیح آبادی نے جناب ناصر الملت کو لکھنؤ کے سب سے بڑے مجتہد کے طور پر یاد کیا ہے[۵۵] ان کا کتب خانہ اہم ترین کتابوں سے بھرا ہوا تھا وہ خود بھی نسیم صاحب کو بہت اہمیت دیتے تھے ۱۹۳۸ء کے اس زمانے میں:

۵۲۔ نور احمد میرٹھی (کراچی: ادارۂ فکر نو کورنگی، جنوری ۲۰۰۳ء)، ص ۹۰۳

۵۳۔ نسیم کی کہانی نسیم کی زبانی، مشمولہ ارمغان نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ ۱۹۹۲ء)، ص ۲۲۲

۵۴۔ رثائے محسن الحکیم (ناشر ڈاکٹر یاور عباس، کراچی: جولائی ۱۹۷۰ء)، ص ۲۷۵

۵۵۔ یادوں کی برات (کراچی: جوش اکیڈمی ۱۹۷۰ء)، ص ۴

نسیم صاحب کی مولانا ابوالکلام آزاد، جوش ملیح آبادی اور راجہ صاحب محمود آباد سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔[۵۶]

امروہہ نوگانواں اور میرٹھ کے مقابلے میں لکھنؤ کے تعلیمی ادارے جوبلی انٹر کالج میں ان کے تدریسی سفر کے عہد میں انہیں ایک زرخیز علمی وادبی فضا میں اپنی کارکردگی دکھانے کے مواقع زیادہ میسر آئے۔اس علمی درسگاہ کے حوالے سے انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

'ہر ایک جماعت میں چالیس پچاس طالب علم تھے جن میں شوکت تھانوی مرحوم بھی شامل تھے لکھنؤ کی زرخیز زمین پر ایسے ذہین اور باذوق طالب علم اپنی تعلیم وتعلّم کی زندگی میں پہلی بار ملے تھے جنہیں پڑھانے میں لطف آتا تھا۔'[۵۷]

اس زمانے میں وہ چرچ مشن اسکول میں لیکچرار کے طور پر چلے گئے اس کی وجہ خود ان ہی کی زبانی سنیے۔جوبلی کالج لکھنؤ کے تذکرے میں وہ لکھتے ہیں:

'اس زمانے میں ایک نسیم البلاغت (معانی وبیان وعروض) مرتب کی جو یوپی کے محکمۂ تعلیم نے انٹرمیڈیٹ کلاسز کے نصاب میں منظور کر لی مگر سرکاری ملازم ہوتے ہوئے پرنسپل کی اجازت اور وساطت کے بغیر میرا یہ عمل محکمے کی نظر میں ناپسندیدہ اور خلافِ قانون تھا میں نے اپنے ذہن، قلم اور ادبی مشاغل پر اس پابندی کو گوارہ نہ کیا اور جواب دہی سے بچنے کے لیے سرکاری ملازمت کا خیال ترک کر دیا اور جوبلی کالج کو چھوڑ کر چرچ مشن ہائی اسکول میں ملازمت کر لی جہاں مجھے کالج سے بھی زیادہ لطف آیا۔'[۵۸]

لکھنؤ میں نسیم صاحب کے علمی لیکچرز جنہوں نے خود سنے ہیں ان میں سے ایک شخصیت ڈاکٹر حسین محمد جعفری صاحب کی ہے۔اس ذیل میں وہ لکھتے ہیں:

'میں نے ان کو فارسی کی مشکل ترین کتابیں دفتر ابوالفضل اور سہ نثر ظہوری اس طرح پڑھاتے دیکھا ہے جیسے وہ ساری زندگی انہی کتابوں کو پڑھاتے رہے ہیں۔'[۵۹]

۵۶۔ سوانحی خاکہ، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ ۱۹۹۲ء)، ص ۴

۵۷۔ خودنوشت سوانح حیات (لاہور: اظہار سنز ۱۹۸۶ء)، ص ۹۵

۵۸۔ ایضاً، ص ۹۷

۵۹۔ ماخوذ از فرہنگِ اقبال فارسی (لاہور: اظہار سنز ۱۹۸۹ء)، ص ۷

علامہ اقبال سے ملاقات

۱۹۳۶ء میں نسیم امروہوی اپنے چھوٹے بھائی سید صائم رضا سے ملاقات کے لیے پشاور تشریف لے گئے واپسی میں تین چار روز کے لیے لاہور میں سیف شادانی کے یہاں مہمان رہے۔ علامہ اقبال سے پہلی ملاقات ہوئی دوسرے موضوعات کے علاوہ اقبال کی معروف غزل ۔کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں کے متعلق بھی گفتگو رہی ۔[۶۰]

تحریک پاکستان میں قلمی شمولیت

نسیم کی زندگی اور ان کی سوانح کا ایک بہت اہم حصہ وہ دور ہے جب برصغیر میں آزادی کی تحریک نمایاں ہو چکی تھی ان کے مرثیوں کا وہ قومی آہنگ جس کے بارے میں 'سازِ حریت' کے حوالے سے پروفیسر حامد حسن قادری کی رائے گزشتہ مضمون میں نقل کی گئی ہے اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ قلمی طور پر آزادی کی تحریک میں شریک ہو چکے تھے۔ مقالے کے تیسرے باب 'تحریک پاکستان میں نسیم امروہوی کی قلمی خدمات اور ان کا سماجی پس منظر' میں ہم اس کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔ تحریک پاکستان کے حوالے سے ان کی ایک بہت طویل نظم 'برق و باراں' اس زمانے میں منظر عام پر آئی جب ہر طرف ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کا ذکر تھا۔ پروفیسر سید وقار عظیم نے اپنے ایک مضمون [۶۱] میں تحریکِ پاکستان کے حوالے سے نسیم صاحب کی قلمی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

پرنسپل اورینٹل کالج رامپور

قیامِ پاکستان سے دو ماہ قبل ہی یعنی جون ۱۹۴۸ء میں وہ اورینٹل کالج رامپور میں بحیثیت معلم فارسی ادب مقرر کر لیے گئے [۶۲] ادبیاتِ فارسی کے ساتھ ساتھ اس کالج میں انہوں نے مولانا روم کی مثنوی بھی پڑھائی [۶۳] شاداں بلگرامی کی وفات کے بعد وہ یہاں آئے تھے بعد میں والیٔ رامپور نواب سر رضا علی خاں نے انہیں

۶۰۔ سوانحی خاکہ، مشمولہ ارمغانِ نسیم، کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۳

۶۱۔ نسیم امروہوی کی نظم برق و باراں، مشمولہ ارمغان نسیم، ص ۲۳ تا ۲۸

۶۲۔ نسیم امروہوی کے کچھ حالات، ارشد امام مشمولہ خبر نامہ، انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹؍ فروری ۱۹۶۷ء کراچی، ص ۳

۶۳۔ سوانحی خاکہ، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۵

پرنسپل بھی مقرر کر دیا تھا۔[۶۴]

پاکستان ہجرت

برصغیر کی آزادی کے کم و بیش ڈھائی سال بعد نسیم صاحب نے ہندوستان کو خیر باد کہا اور مئی ۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان آ گئے۔ اپنے ایک خط میں اس بات کا وہ ذکر کرتے ہیں:

'میں بغیر کسی سامان کے بچوں کو ساتھ لے کر ۱۴ر مئی ۱۹۵۰ء کو آٹھ بجے شب پنجاب میل میں سوار ہوا اور صبح کو امرتسر پہنچا ۱۵ر مئی کو لاہور کی سرزمین پر قدم رکھا میں بے سروسامانی کے عالم میں آیا تھا نہ کوئی گھر تھا نہ کوئی در چنانچہ وقتی طور پر کہکشاں ہوٹل انارکلی لاہور میں ٹھہرا۔'[۶۵]

لاہور میں عارضی قیام کے بعد خیر پور میں مستقل قیام

نسیم صاحب ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچے تو اس نئے وطن کے ایک مرکزی شہر لاہور میں آ کر اترے یہاں کچھ دنوں ان کا قیام کہکشاں ہوٹل انارکلی میں رہا وہ مئی ۱۹۵۰ء میں لاہور پہنچے تھے اور اسی سال کے آخر میں انہوں نے خیر پور کو اپنی مستقل قیام گاہ بنا لیا۔

پاکستان میں نسیم صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار کا مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سندھ کے شہر خیر پور سے انہیں خصوصی نسبت رہی ہے ان کے دادا شمیم امروہوی ایک زمانے میں یہاں آ چکے ہیں نسیم صاحب کو اس سرزمین اور یہاں کے لوگوں سے ایک دلی وابستگی رہی ہے اپنے ایک مسدس میں جو سندھ کی سرزمین کی خوبیوں اور یہاں کے رہنے والوں کے خلوص و محبت سے متعلق ہے انہوں نے اپنے دادا کی یہ بیت نقل کی ہے: ؂

ہر شخص اہلِ دل ہے عجب یاں کی سیر ہے
یہ خیر پور اصل میں بھر پور خیر ہے

اسی زمانے میں سندھی زبان و تاریخ کی ایک معروف شخصیت کریم بخش خالد نے ان کے متعلق ایک

۶۴۔ ادریس اکبر امروہہ میری یادوں میں، کتابچہ مطبوعہ ۱۹۶۱ء، خیر پور، ص ۱۸

۶۵۔ مکتوب بنام ہلال نقوی، مشمولہ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ (کراچی/لندن: محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلی کیشنز ۱۹۹۴ء)، ص ۵۲۰

مضمون لکھا جس کا عنوان ہے 'ہمارے شہر کا ایک زندہ شاعر و ادیب'۔ [۶۶] یہ نسیم صاحب کی شخصیت اور ان کے ادبی کاموں پر پہلا مضمون ہے جو پاکستان میں ان پر لکھا گیا۔ ڈاکٹر شاہدہ بیگم اپنے مقالے میں لکھتی ہیں کہ پاکستان کے قیام کے بعد جو ادیب و شاعر خیر پور میں آ کر قیام پذیر ہوئے ان میں سب سے معروف نسیم امروہوی ہیں۔ [۶۷]

معتمد اعزازی انجمنِ ترقی اردو خیر پور

خیر پور میں نسیم کی ادبی زندگی کا آغاز ترقی اردو کے ذیل میں ادبی خدمات سے ہوا۔ انجمنِ ترقی اردو پاکستان کے ادبی ماہنامے نے ایک اشاعت میں یہ خبر شائع کی:

> '۵رفروری ۱۹۵۱ء کو خیر پور میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی صدارت میں جلسہ ہوا اور انجمنِ ترقی اردو خیر پور کا قیام عمل میں آیا نسیم امروہوی اس انجمن کے معتمد اعزازی مقرر کیے گئے۔' [۶۸]

معتمد اعزازی کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد:

> 'نسیم نے خیر پور میں اردو کانفرنس منعقد کرنے کا اہتمام کیا۔ اس کانفرنس کی صدارت مرکزی حکومت کے وزیر ڈاکٹر محمود حسین نے فرمائی مولوی عبدالحق صاحب اور پیر حسام الدین راشدی صاحب کے علاوہ بھی معروف شخصیات اس میں شریک ہوئیں۔' [۶۹]

پاکستان میں نسیم امروہوی کا پہلا علمی و تحقیقی کام ــــ نسیم اللغات

پاکستان میں نسیم کی پہلی بڑی ادبی خدمت ستر ہزار الفاظ پر مشتمل نسیم اللغات کی ترتیب و تدوین ہے اس کا پہلا ایڈیشن اگرچہ ۱۹۵۵ء میں لاہور سے شائع ہوا لیکن اس کا آغاز انہوں نے پاکستان ہجرت کے ایک ہی سال بعد کر دیا تھا اس لغت کے پیش لفظ میں ترتیبِ لغت کا پس منظر بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> 'فروری ۱۹۵۱ء میں مرزا امتاز حسن قزلباش وزیرِ اعلیٰ خیر پور کی تجویز سے خیر پور میں ایک

۶۶۔ مشمولہ، اخبار صداقت، جیکب آباد، شمارہ اپریل ۱۹۵۳ء، ص ۹

۶۷۔ سندھ میں اردو (کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۸۰ء)، ص ۱۸۹

۶۸۔ قومی زبان، اشاعت ۱۶رفروری ۱۹۸۱ء، کراچی ص ۱۷

۶۹۔ سوانحی خاکہ، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۵

عظیم الشان کل پاکستان اردو کانفرنس کے دو اجلاس زیرِ صدارت عزت ماب ڈاکٹر محمود حسین وزیر ریاست ہائے پاکستان وزیرِ سرپرستی بابائے اردو مولوی عبدالحق منعقد ہوئے جس میں انجمنِ ترقی اردو خیر پور کا قیام عمل میں آیا انجمن مذکور کے ارکان نے بالاتفاق اس بات پر زور دیا کہ زبان اردو کی خدمت کے سلسلے میں سب سے پہلے ایک لغت مرتب کی جائے جو ان تمام لغات کا نعم البدل نہیں تو کم سے کم بدل ہی بن سکے جو برصغیر کی تقسیم کے بعد بھارت میں رہ گئے۔ چنانچہ ناچیز نے اس کا بیڑا اٹھایا۔"[۰ے]

صحافتی زندگی کا آغاز

نسیم اللغات کی ترتیب و تدوین کے زمانے ہی میں نسیم صاحب نے 'مراد' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جو تین دن بعد شائع ہوتا تھا یہ سندھ کا پہلا اخبار ہے جو بیک وقت سندھی اور اردو زبانوں میں چھپتا تھا اس اخبار نے سندھ خصوصاً خیر پور کی سماجی زندگی کے ارتقا میں بڑا حصہ لیا مقالے کے پانچویں باب میں اس کا تفصیلی ذکر کیا جائے گا۔

خیر پور میں مدّتِ قیام ــــ دس سال

نسیم صاحب ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک یعنی تقریباً دس، گیارہ سال خیر پور میں قیام پذیر رہے اس عرصے میں وہ بعض گھریلو پریشانیوں کے بھی شکار رہے ۱۹۵۷ء میں ان کی اہلیہ معجزہ خاتون ذہنی طور پر معذور ہو گئیں جس سے ان پر گھر کی ذمہ داریاں اور زیادہ بڑھ گئیں لیکن انہوں نے ان تمام مشکلات کے دوران بھی اپنا ادبی سفر جاری رکھا۔ انجمنِ ترقی اردو خیر پور کی ذمہ داریاں، اخبار مراد کی ادارت، تاریخِ خیر پور کی تدوین، دوست بنو دوست بناؤ، ادبی کہانیاں، نسیم اللغات، رئیس اللغات اور بچوں کے لیے بنیادی نصابی اور غیر نصابی کتابیں، یہ ان کے بہت اہم کام ہیں جو انہوں نے خیر پور ہی میں انجام دیے۔

ترقی اردو بورڈ سے وابستگی

قیامِ پاکستان کے دس سال بعد ہی اردو زبان کی ایک ضخیم اور وسیع لغت کی تدوین کا اس نئے ملک میں منصوبہ

۰ے۔ نسیم اللغات (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت اول، ۱۹۵۵ء)، ص ۵

بنایا گیا محکمۂ تعلیم حکومت پاکستان نے ترقی اردو بورڈ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس میں مولوی عبدالحق اور جوش ملیح آبادی جیسی شخصیات شریک تھیں۔لغت نویسی سے متعلق نسیم کی گذشتہ خدمات کو دیکھتے ہوئے انہیں اپریل ۱۹۶۱ء میں اس بورڈ سے وابستہ کرلیا گیا[۱] اس سے پہلے بھی وہ بورڈ ہی کے حوالے سے اس لغت کا کچھ کام انجام دے چکے تھے،جس کا اظہار وہ اپنے ایک مضمون میں کر چکے ہیں:

> 'میں بورڈ کا تھوڑا بہت کام یہاں (خیر پور) بیٹھے بیٹھے بھی انجام دے چکا ہوں کتنی علمی و ادبی کتابوں کا مطالعہ کر کے لغت میں درج کیے جانے کے لیے الفاظ منتخب کر کے بھیجے ہیں۔بورڈ کے سکریٹری جناب شان الحق حقی سے میرے دیرینہ مراسم ہیں انہوں نے مجھ سے لفظ 'اب' کی تشریحات بھی لکھوائی تھیں۔'[۲]

کراچی میں ذاتی گھر

لغت نویسی کے ایک انتہائی وسیع کام کے لیے ترقی اردو بورڈ سے وابستگی کے ساتھ ہی نسیم صاحب نے خیر پور کا مکان فروخت کردیا اور کراچی منتقل ہوگئے۔عارضی طور پر وہ جیکب لائن میں رہے پھر فیڈرل بی ایریا کے بلاک ۱۷ میں انہوں نے اپنا ذاتی گھر بھی بنالیا۔[۳]

کُل پاکستان فروغِ مرثیہ کا قیام

لغت نویسی،نصابی کتب کی تدوین اور شعر گوئی کے ساتھ ساتھ نسیم کی ادبی زندگی کی ایک بڑی وابستگی مرثیے کی شاعری کے ساتھ رہی یہ ان کی ایک بڑی شناخت ہے اور اس فن میں انہیں برصغیر میں بڑی انفرادیت حاصل رہی ہے کراچی میں مستقل قیام کے بعد انہوں نے صنفِ مرثیہ کے فروغ کے لیے کراچی میں کل پاکستان فروغِ مرثیہ کا ادارہ قائم کیا۔اس کے قیام کا سن ۱۹۶۷ء ہے۔[۴]

۷۱۔ نسیم امروہوی،اردو لغت ایک داستان دیدۂ دل،مشمولہ روزنامہ جنگ،کراچی ۱۹رمئی ۱۹۷۸ء،ص۵

۷۲۔ ایضاً ص۵

۷۳۔ زبانی بیان قسیم ابنِ نسیم،بتاریخ ۱۵رفروری،۲۰۰۲ء،کراچی

۷۴۔ نسیم امروہوی دستورِ اساسی (کراچی:کل پاکستان فروغِ مرثیہ،۱۹۸۲ء) ص۳

نسیم کے پہلے سوانح نگار، ڈاکٹر صفدر حسین

ترقی اردو بورڈ سے وابستگی (۱۹۶۱ء) کے دوسرے ہی برس نسیم کے ۱۳ منتخب مرثیوں کا پہلا مجموعہ کراچی سے شائع ہوا۔[۷۵] محکمۂ تعلیم پنجاب کی ایک معروف شخصیت ماہر تعلیم، شاعر اور محقق ڈاکٹر صفدر حسین نے اس مجموعے کا مقدمہ تحریر کیا۔ ڈاکٹر صفدر حسین ان دنوں گورنمنٹ کالج کراچی کے پرنسپل تھے۔ اس مقدمے میں جہاں نسیم کے فنِ مرثیہ پر تنقیدی رائے شامل تھی وہاں پہلی بار نسیم کی سوانحِ حیات کے بعض پہلو سامنے آئے۔ یہ سوانحی حصہ نسیم پر تحقیق کرنے والوں کے لیے بنیادی سیڑھی کی حیثیت رکھتا ہے اگرچہ اس میں بعض باتیں تحقیقی طور پر غلط بھی ہیں مثلاً ڈاکٹر صفدر حسین نے ان کا سنِ ولادت ۱۹۱۰ء لکھا ہے[۷۶] جبکہ صحیح سنِ ولادت ۱۹۰۸ء ہے۔

پچاس سالہ شعری خدمات کا اعتراف

نسیم کی شعر گوئی کا آغاز ۱۵ سال کی عمر میں ہوا تھا اور یہ ۱۹۲۳ء عیسوی کا سن تھا اس حساب سے ۱۹۷۳ء میں ان کی شعری خدمات کے پچاس برس مکمل ہوئے چنانچہ آرٹس کونسل کراچی میں ان کے جشنِ زریں کا اہتمام کیا گیا اس وقت کے وزیرِ مملکت برائے صنعت پاکستان سید قائم علی شاہ نے اس جشنِ زریں کی صدارت فرمائی۔ جن ادیبوں اور تنقید نگاروں نے اس موقعے پر مقالے پڑھے ان میں پیر حسام الدین راشدی، سید وقار عظیم، رئیس امروہوی، پروفیسر طاہر نقوی، عبدالرؤف عروج، ہلال نقوی، جون ایلیا، مولانا شبیہ الحسن، ساحر لکھنوی اور حسین اعظمی کے نام شامل ہیں۔ یہ تمام مقالات انجمنِ ساداتِ امروہہ نے ۱۹۷۴ء میں 'عرفانِ نسیم' کے نام سے شائع کر دیے۔

اہلیہ کی وفات

۱۹۷۴ء میں اچانک ان کی اہلیہ معجزہ خاتون انتقال کر گئیں اس موقع پر شہر کے کئی شاعروں نے تعزیتی نظمیں لکھیں قطعات تاریخ بھی کہے گئے خود نسیم امروہوی نے بھی سن عیسوی میں تاریخ نکالی۔ یہ چار مصرعے آج بھی ان کی اہلیہ کی قبر پر محفوظ ہیں: ؎

۷۵۔ مراثی نسیم جلد اول (کراچی: لیاقت آباد، ۱۹۶۲ء)

۷۶۔ ایضاً، ص ۹

ہے نسیم امروہوی کی یہ شریکِ زندگی
دخترِ کلثوم و زاہد سید عالی حسب
سالِ رحلت عیسوی میں قبر پر لکھ دو نسیم
خواب گاہِ معجزہ خاتون، پاکیزہ نسب [۷۷]

تدوینِ لُغت سے سبکدوشی

۱۸؍سال تک وطنِ عزیز میں اردو کی سب سے بڑی لغت کی تدوین کے کام میں رات دن مصروف رہ کر نسیم صاحب یکم ستمبر ۱۹۷۹ء کو ترقی اردو بورڈ سے سبکدوش ہو گئے۔ [۷۸]

سفرِ حج

ترقی اردو بورڈ سے سبکدوشی کے ایک سال بعد اگست ۱۹۸۰ء میں انہوں نے حج کے لیے سعودی عرب کا سفر اختیار کیا۔ [۷۹] تکمیلِ حج کے بعد جدہ میں ان کے اعزاز میں کچھ ادبی تقریبات بھی منعقد ہوئیں۔

کوٹ ڈیجی اور لاہور میں قیام اور ادبی و علمی مصروفیات

ترقی اردو بورڈ سے سبکدوشی اور سفرِ حج کی تکمیل کے بعد نسیم نے سندھ کے ایک گاؤں کوٹ ڈیجی اور پنجاب کے شہر لاہور میں قیام کو ترجیح دی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کوٹ ڈیجی میں نسبتاً آرام و سکون سے وہ لکھنے پڑھنے کے کام کر سکتے تھے اور لاہور میں ٹھہرنے کی وجہ یہ تھی کہ اقبال کی فرہنگ کی اشاعت سے متعلق ان کا لاہور کے ایک اشاعتی ادارے اظہار سنز سے معاہدہ ہو گیا تھا۔ جدہ میں مقیم حبیب اصغر کو کوٹ ڈیجی سے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

> 'میں کراچی کے شور و شر سے محفوظ رہ کر اطمینان کے ساتھ کام کرنے کے لیے یہاں کوٹ ڈیجی میں رہتا ہوں جو صاحب میرے میزبان ہیں وہ ریاست کے زمانے میں ہز ہائنس

۷۷۔ قلمی تاریخ بہ خطِ نسیم امروہوی، بحوالہ نوادرات قسیم ابن نسیم
۷۸۔ روزنامہ حریت، کراچی اشاعت ۲؍ستمبر ۱۹۷۹ء، ص ۶
۷۹۔ روزنامہ حریت، کراچی اشاعت یکم ستمبر ۱۹۸۰ء، (ادبی صفحہ)

کے سکریٹری تھے اب ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔'[۸۰]

فرہنگ اقبال کی ترتیب وتدوین

کم وبیش ۹۰۰ سے ایک ہزار صفحات پر مشتمل اردو اور فارسی میں فرہنگِ اقبال نسیم کے دورِ آخر کے بڑے کاموں میں شمار کی جائے گی، ۶رفروری ۱۹۸۲ء کے ایک خط میں وہ کوٹ ڈیجی سے ڈاکٹر ہلال نقوی کو لکھتے ہیں:

'تم خیال کرتے ہو گے کہ میں یہاں فارغ بیٹھا ہوں اس لیے فرصت ہی فرصت ہے حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے میں بیک وقت کئی کام کر رہا ہوں۔ اردو اور سندھی میں تفسیر قرآن، فرہنگِ اقبال اردو، فرہنگِ اقبال فارسی، فرہنگِ نسیم جو نسیم اللّغات سے زیادہ ضخیم ہوگی، نئے سے نئے حسب ضرورت مرثیے، پرانے مرثیوں کی ترتیب اور ان کے پرچوں پر لکھے ہوئے مسوّدے یکجا کر کے ان کی کتابت، یہ سب کام روزانہ ایک تقسیمِ اوقات کے ساتھ انجام دیتا ہوں۔'[۸۱]

اس خط کے اقتباس سے ہم ترقی اردو بورڈ سے سبکدوشی کے بعد نسیم کی مصروفیات کا اندازہ کر سکتے ہیں اپنی زندگی کے اس آخری دور میں بھی وہ لغت نویسی جیسے مشکل کام میں مشغول رہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری جو آج کل (۲۰۰۲ء) اردو ڈکشنری بورڈ (سابقہ ترقی اردو بورڈ) کے صدر ہیں وہ نسیم کی زندگی کے آخری برسوں کے ذیل میں لکھتے ہیں:

'یہ لغت نویسی سے طبعی لگاؤ اور شغف ہی تھا جس کے سبب نسیم اللّغات جیسی قیمتی تالیف مرتب کر دینے اور اردو لغت بورڈ کے عظیم منصوبۂ لغت پر برسوں عالمانہ اور رہنمایانہ کام کرنے کے بعد بھی ان کی طبیعت لغت نویسی سے بے نیاز و سیراب نہ ہو سکی اور انہوں نے پیرانہ سالی وضعفِ جسمانی کے باوجود اپنی زندگی کے آخری برسوں میں فرہنگِ اقبال کے عنوان سے اردو کو دو ایسی گراں قدر تالیفات دے دیں جو صرف یہی نہیں کہ اردو فرہنگ نویسی کی تاریخ میں ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی بلکہ اقبال شناسی کے

۸۰۔ مکتوب غیر مطبوعہ بشکریہ حبیب اصغر صاحب مرقومہ ۱۱ردسمبر ۱۹۸۰ء

۸۱۔ مکتوب مشمولہ ارمغان نسیم (کراچی: انجمن سادات امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۴۱

سلسلے میں بھی آئندہ نسلوں کی مستقل رہنمائی کرتی رہیں گی۔'[۸۲]

نامکمل خودنوشت سوانحِ حیات

نسیم کی زندگی کے آخری دور کی ادبی مصروفیات میں ایک اہم مصروفیت خودنوشت سوانحِ حیات ہے جو نامکمل ہے یہ سوانح انہوں نے غالباً ۱۹۸۲ء کے آخر میں لکھنی شروع کی اس کا اندازہ ۳رفروری ۱۹۸۲ء کے ایک خط سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

'فرہنگِ اقبال اردو مکمل ہوگئی اب فارسی کی فرہنگ شروع کروں گا جو کم وبیش چار پانچ ماہ میں مکمل ہوگی اس کے بعد اپنی سوانح خود لکھوں گا۔'[۸۳]

یہ سوانحِ حیات ان کی وفات سے ایک سال قبل ۱۹۸۶ء میں لاہور سے شائع ہوئی اس کے بالکل آغاز میں انہوں نے لکھا ہے:

'ابھی وہ چند لوگ بقیدِ حیات ہیں جنہوں نے میری زندگی کے بعض ادوار و شباب اور پیری کو دیکھا ہے اور براہِ راست حالات اور واقعات کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے۔ ان حضرات کی تعداد روز بروز کم ہوتی چلی جارہی ہے اور میں بھی اب چراغِ سحری ہوں مگر ایسے بزرگ تقریباً عنقائے معدوم کا حکم رکھتے ہیں جو میری پیدائش اور نشو ونما کے حالات سے واقف تھے۔ بنابریں بہتر سمجھتا ہوں کہ جو کچھ مجھے یاد ہے اور گھرانے کے بزرگوں نے جو کچھ بھی مجھے یاد دلایا اور بتایا تھا اور ابھی تک لوحِ حافظہ پر ثبت ہے ہوش وحواس گم ہونے سے پہلے اسے کاغذ پر منتقل کردوں۔'[۸۴]

نسیم صاحب نے خودنوشت سوانحِ حیات کے اس حصہ اول میں ۱۹۳۲ء تک کے حالات لکھے ہیں اس کے بعد کی زندگی کے تقریباً ۵۵ سال کے حالات وہ نہیں لکھ سکے۔

'نسیم کی کہانی، نسیم کی زبانی' کا عنوان قائم کر کے نسیم کی لکھی ہوئی 'خودنوشت سوانحِ حیات' کے کچھ حصے ڈاکٹر ہلال نقوی نے ارمغانِ نسیم میں شامل کیے ہیں [۸۵] اور بعض افراد وواقعات کی تشریح میں حاشیے بھی

۸۲۔ فلیپ، ایضاً

۸۳۔ بنام ہلال نقوی (غیر مطبوعہ)

۸۴۔ خودنوشت سوانحِ حیات حصہ اول (لاہور: اظہار سنز اردو بازار، ۱۹۸۶ء)، ص ۷

۸۵۔ ناشر انجمن ساداتِ امروہہ، کراچی فروری ۱۹۹۲ء، ص ۲۱۱ تا ۲۳۰

لکھے ہیں جس سے نسیم کی زندگی کے کچھ اور واقعات اور حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے [۸۶] لیکن ۱۹۳۲ء کے بعد کی ۵۵ رسالہ زندگی ایک بڑا دور ہے جس کا احاطہ اگر چہ مشکل ہے لیکن اگر محض ان کی سوانح کو ترتیب دینے کے حوالے سے تحقیق کی جائے تو یہ ایک بڑا کام ہوگا۔

پیرانہ سالی وضعفِ جسمانی کا دور

۱۹۸۰ء کے بعد کا دور نسیم کی پیرانہ سالی اور ضعفِ جسمانی کا دور کہا جائے گا۔ان کے لکھے ہوئے بعض خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحتِ جسمانی کے اعتبار سے انہیں کئی تکالیف کا سامنا تھا۔

اپنے فرزند وسیم حیدر مقیم جدّہ کو کوٹ ڈیجی سے ایک خط (مرقومہ ۶ راپریل ۱۹۸۰ء) میں لکھتے ہیں:

'مجھ پر لو بلڈ پریشر کا دورہ پڑا تھا پرسوں سے کسی قدر افاقہ ہے یہاں دوائیں بھی اچھی نہیں ملتیں اس لیے اختر صاحب کو کراچی بھیجا ہے دوائیں لے آئیں تو جلد ہی تکلیف دور ہو جائے گی فی الحال تو اعصاب پر اتنا اثر پڑا ہے کہ یہ خط میں اندازے سے لکھ رہا ہوں آنکھیں پوری طرح کام نہیں کرتیں۔غذا کی یہ صورت ہے کہ صرف بکری کا گوشت کھاتا ہوں جو کوٹ ڈیجی میں نہیں ملتا خیر پور آدمی بھیج کر روزانہ منگوایا جاتا ہے' [۸۷]

۴ رجولائی ۱۹۸۳ء کے لکھے ہوئے ایک خط سے جوان کے قدیم دوست کاظم جگر کے نام ہے ان کی گرتی ہوئی صحت کی ایک اور تصویر بھی سامنے آتی ہے:

'میں اپنی عمر کی آخری منزل تک پہنچ چکا ہوں غالب نے جو خود کو ستر ّہ بہتر ّہ لکھا تھا میں

۸۶۔ نسیم صاحب کی اولاد میں تین افراد بقیدِ حیات ہیں۔ایک بہن اور ان سے چھوٹے دو بھائی۔قسیم ابنِ نسیم اور وسیم حیدر۔ مجھے ان سے ان کے والد کے جو خطوط ملے ہیں وہ ان کی سوانح کا ایک بہت اہم حصہ ہو سکتے ہیں۔(م،ن،ع)

۸۷۔ نسیم امروہوی کے چار فرزند ہیں جن میں سید وسیم حیدر تین بھائیوں سے چھوٹے ہیں ایک طویل عرصے سے سعودی عرب میں رہتے ہیں بنیادی طور پر سول انجینئر ہیں اور ایک فرم سے وابستہ ہیں۔اس تحقیقی مطالعے کے سلسلے میں انہوں نے بھر پور تعاون کیا اور میرے کئی خطوط کے جوابات دیئے۔اپنے والد کے کم وبیش ۱۵۰ رخطوط جوان کے نام ہیں انہوں نے مجھے بھی ارسال کیے۔نسیم کی سوانح کے ذیل میں یہ ایک بہت نایاب ذخیرہ ہے ان خطوط میں سے چند کے حوالے بھی مقالے میں دیئے گئے ہیں۔یہ تمام خطوط راقم سطور کی ترتیب وتدوین کے ساتھ عنقریب شائع ہو کر منظرِ عام پر آ جائیں گے(م۔ن۔ع)

چھیتر ہ ہوں بصارت کم ہوگئی ہے، قویٰ مضمحل ہو چکے۔'[۸۸]

خودنوشت سوانحِ حیات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

'میں اپنی عمر کے اسی سال پورے کر چکا ہوں صحت بھی زوال پذیر ہے اور عمر بھی اختتام پذیر۔ رات تھوڑی رہ گئی ہے اور داستان ابھی شروع بھی نہیں ہوئی۔'[۸۹]

ہندوستان کا سفر

۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۶ء کے دوران کئی باران کی صحت گری اور کبھی کبھی وہ سنبھل بھی گئے ۸؍جنوری ۱۹۸۶ء کے ایک خط میں اپنے ہومیو پیتھک ڈاکٹر کو لکھتے ہیں:

'پھیپڑوں میں جو پانی آ گیا تھا اس کا مکمل علاج جناح ہسپتال والے کر چکے، کل یا پرسوں گھر کو رخصت کر دیں گے۔'[۹۰]

تھوڑی سی توانائی ملی اور وہ کچھ سنبھلے تو انہوں نے اپنے سابقہ وطن امروہہ جانے کا ارادہ کر لیا اس کمزوری اور علالت کے باوجود امروہے کی طرف ان کا سفر اپنے ماضی کی ان گنت یادوں سے نسبت کا ایک اظہار ہے۔ اخبار امرتسر اور قومی آواز نے اس موقع پر جو خبریں شائع کیں ان میں سے دو کے اقتباس یہ ہیں:

'ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں کے مسلسل اصرار پر پاکستان کے مشہور شاعر، ماہرِ لسانیات اور جدید مرثیے کے بانی علامہ نسیم امروہوی ۳؍ستمبر ۱۹۸۶ء کو ہندوستان کے دورے پر شام ۶؍ بجے بذریعہ طیارہ دہلی پہنچ رہے ہیں۔ وہ پاکستان اردو بورڈ کے سربراہ رہے ہیں۔ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں دو سو سے زیادہ مرثیے تصنیف کر چکے ہیں اردو کی سب سے ضخیم لغت جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے انداز پر حکومتِ پاکستان کی جانب سے چھپ رہی ہے اس کے مدیرِ اعلیٰ رہے ہیں جو تقریباً ۳۰؍ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔'[۹۱]

۸۸۔ عکسی خط، مشمولہ ارمغانِ نسیم، (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ فروری، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۵۵

۸۹۔ خودنوشت سوانحِ حیات، حصہ اول (لاہور: اظہار سنز اردو بازار، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۰

۹۰۔ مکتوب بنام ڈاکٹر علی نظر بشکریہ ڈاکٹر علی نظر مقیم کراچی

۹۱۔ اخبار، امرتسر، دہلی اشاعت یکم ستمبر ۱۹۸۶ء، ص ۳

’پاکستان کے ممتاز شاعر، ماہرِ لسانیات اور جدید مرثیے کے اہم معمار علامہ نسیم امروہوی کا اندرا گاندھی ایئر پورٹ پہنچنے پر شاندار استقبال کیا گیا وہ ۳۶ رسال بعد ہندوستان تشریف لائے۔ استقبال کے موقعے پر سکریٹری غالب اکیڈمی، ذہین نقوی، واجد سحری، اسرار علی عباس نقوی اور عظیم امروہوی نے معزز مہمان کی گلپوشی کی۔‘[۹۲]

ہندوستان میں نسیم امروہوی کے ایک شاگرد ڈاکٹر عظیم امروہوی نے جنہوں نے نسیم امروہوی کے دادا شمیم امروہوی کی ادبی خدمات پر ڈاکٹریٹ کی سند لی ہے اپنے ایک مضمون ’۳۶ رسال بعد امروہہ میں نسیم امروہوی کی آمد‘ میں ان کے قیامِ ہندوستان کی پوری روداد لکھی ہے[۹۳] نسیم صاحب ۳ر ستمبر سے ۱۵ ر ستمبر تک ہندوستان میں رہے ان تمام دنوں کی صبحیں اور شامیں ان کی علمی و ادبی خدمات کے لیے وقف رہیں۔

کراچی میں پوتے کی ہلاکت

ہندوستان سے واپس آکر نسیم نے کوٹ ڈیجی اور لاہور کے بجائے کراچی میں اس لیے قیام کو ترجیح دی کہ ان کے بیشتر ادبی کام لاہور اور کوٹ ڈیجی میں مکمل ہو چکے تھے۔ ۱۹۸۶ء کے آخری دو مہینوں میں ان کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی اسی دوران دسمبر کے مہینے میں ان کے بڑے پوتے نعیم رضا کراچی کے لسانی فسادات میں گولی لگنے سے ہلاک ہو گئے اس حادثے کا ان پر بہت گہرا اثر ہوا۔ ’خبر نامہ ساداتِ امروہہ کراچی‘ میں اس حوالے سے یہ خبر درج ہے:

’دسمبر ۱۹۸۶ء میں ان کے بڑے صاحب زادے کے سب سے بڑے بیٹے نعیم رضا گولی لگنے سے جاں بحق ہو گئے جس کا ان کے دل و دماغ پر شدید اثر ہوا اس کے چند ہی روز بعد وہ کراچی کے میڈیکون اسپتال میں داخل کر دیئے گئے۔‘[۹۴]

وفات

طبیعت کی مسلسل خرابی کے باعث نسیم فروری کے آغاز میں کارڈیو ویسکلر ہسپتال کراچی میں داخل ہوئے۔

۹۲۔ قومی آواز، لکھنؤ اشاعت ۴ر ستمبر ۱۹۸۶ء، ص ۱

۹۳۔ مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی انجمن ساداتِ امروہہ، فروری ۱۹۹۲ء) ص ۱۳۸ تا ۱۴۳

۹۴۔ اشاعت ۲۱ ر دسمبر، ۱۹۸۶ء ص ۳

۲۸ر فروری ۱۹۸۷ء ہفتے کے روز صبح ۵ ر بجکر ۳۵ رمنٹ پر ان کی رحلت ہوئی۔[۹۵] اسی روز مغرب کے بعد تدفین عمل میں آئی۔[۹۶]

تعزیتی پیغامات

نسیم امروہوی کی وفات پر وزیر اعظم پاکستان محمد خاں جونیجو، گورنر سندھ اشرف ڈبلیو تابانی، شیخ الجامعہ کراچی ڈاکٹر جمیل جالبی اور ملک کے اکثر اہلِ قلم کے تعزیتی پیغامات اور خبریں ایک تعزیتی میگزین کی صورت میں کراچی سے شائع کی گئیں۔[۹۷]

اولاد

نسیم امروہوی کی پہلی اہلیہ سے جو اولادیں ہوئیں وہ بہت کم عمری میں انتقال کر گئیں۔[۹۸] دوسری بیوی معجزہ خاتون سے جو اولادیں ہیں ان میں چار بیٹے شمیم حیدر، نسیم حیدر، قسیم حیدر اور وسیم حیدر ہیں۔ بیٹی قائمہ خاتون ہیں جو بڑے بیٹے شمیم حیدر سے چھوٹی ہیں۔ دوسرے بیٹے ذہنی طور پر معذور تھے اور کئی برس تک حیدر آباد (سندھ) کے 'گدو بندر' میں داخل رہے۔ شمیم حیدر اور نسیم حیدر کا انتقال نسیم کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔

سراپا و حلیہ

نسیم امروہوی کو جنھوں نے نوجوانی میں دیکھا ہے ان میں پروفیسر ممتاز احمد کا بیان ہے کہ:

> 'عالم شباب میں بھی وہ دبلے پتلے تھے رنگ ان کا ہمیشہ سے گورا تھا۔ آنکھیں بھی خوبصورت تھیں اور چہرہ بھی خوبصورت تھا، قد بھی لمبا تھا دیکھنے والوں کی ان پر نظر ضرور پڑتی تھی۔'[۹۹]

۹۵۔ نوائے وقت، کراچی اشاعت یکم مارچ ۱۹۸۷ء، ص ۲

۹۶۔ اخبار نوائے وقت (یکم مارچ ۱۹۸۷ء) کراچی نے وفات کی خبر میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی تدفین کراچی کی ایک مسجد آل عبا (فیڈرل بی ایریا) کے احاطے میں ہوئی۔

۹۷۔ تعزیت نامہ تاریخ اشاعت ۲۰ر مارچ ۱۹۸۷ء، کراچی

۹۸۔ بحوالہ حواشی، نسیم کی کہانی نسیم کی زبانی، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ ۱۹۹۲ء)، ص ۲۲۹

۹۹۔ میرے دوست قائم رضا نسیم، مشمولہ قومی آواز لکھنؤ، ۱۲ر اپریل ۱۹۸۷ء، ص ۶

ڈاکٹر ہلال نقوی جو نسیم کی زندگی کے آخری ۲۰ ربرسوں میں ان سے بہت قریب رہے انہوں نے اپنے ایک مضمون میں ان کے سراپا و حلیہ کا بیان ان لفظوں میں کیا ہے:

'چھریرا بدن، قد درازی مائل، ہاتھوں کی انگلیاں لمبی، کلائی، بازو اور پنڈلیاں جیسے گوشت سے خالی، ماتھا چوڑا، رنگ گورا اور سرخی مائل، آنکھیں درمیانی، متوازن بلکہ خوبصورت ناک نقشہ، ناک قدرے لمبی، باچھا چوڑا، بھری ہوئی داڑھی، گردن لمبی اور پتلی، حلقوں کی ہڈی ابھری ہوئی چال میں تیزی، آنکھوں پر جز و لاینفک کے طور پر عینک، آواز میں ٹھہراؤ، گفتگو میں متانت اور دلنشینی، لباس میں سادگی، علیگڑھ کٹ پاجامہ، اکہرے گلے کی لمبی قمیض جس میں سینے پر بائیں طرف ڈھکن دار جیب اور بائیں ہی جانب کھیسا، اس کے اوپر لمبی شیروانی گھٹنوں سے خاصی نیچے، جس کا دامن منبر پر بیٹھنے کے بعد تقریباً پنڈلیوں تک دراز، اونچی باڑھ کی کالی ٹوپی جو ہندوستان میں کمالا کیپ کہلاتی تھی۔'[۱۰۰]

تصنیفات وتالیفات

شاعری، تحقیق وتنقید، نصابی کتب اور بچوں کے ادب کے حوالے سے نسیم کی ۱۲۵ سے زیادہ تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔[۱۰۱] مقالے کے آخر میں ان تصانیف کا تعارف شامل ہوگا۔

شخصیت کا مطالعہ

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے غالب کی شخصیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

'غالب کی شخصیت کو سمجھنے میں سہولت ہوگی اگر ہم تعصب یا خوش عقیدگی سے علیحدہ اور بلند ہو کر ان کی ذہنی پرداخت کا جائزہ لیں۔'[۱۰۲]

کسی بھی ادیب وشاعر کی شخصیت کا مطالعہ یقیناً اس اعتبار سے بہت کٹھن ہے کہ ہم اس کے بارے میں یا تو بہت مبالغہ اختیار کر لیتے ہیں یا بالکل اسے اس کے مقام سے گرا کر اپنے تعصبات میں

۱۰۰۔ منتشر سطریں، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ ۱۹۹۲ء)، ص ۱۵۷

۱۰۱۔ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۹۲

۱۰۲۔ خطبات (کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۹۱ء)، ص ۳۹۲

ایسے اسیر ہو جاتے ہیں کہ انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے۔ڈاکٹر محمود الٰہی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

'شخصیت نگاری کا فن جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی۔آسان اس لیے کہ اگر کسی کی قوتِ مشاہدہ تیز ہو تو وہ شخصیت کے ہر نقش اور ہر لکیر کو پہچان سکتا ہے لیکن مشکل اس لیے کہ نقشِ باطل اور نقشِ حق میں امتیاز کرنا سب کا کام نہیں یہی وہ منزل ہے جہاں باریک بین شخصیت نگار بھی دھوکہ کھا جاتا ہے اور وہ زمانے کے سامنے شخصیت کا رطب و یابس سب کچھ رکھ دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شخصیت مجہول ہو کر رہ جاتی ہے۔'[۱۰۳]

شخصیت کے مطالعے میں ایک پیمانہ یہ بھی سامنے رکھا جاتا ہے کہ ہم فن کار کے فن یا ادیب وشاعر کے ادبی سرمائے کے رجحانات سے اس کی شخصیت کا اندازہ کر سکتے ہیں یہ اہمیت اور ضرورت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے (یعنی فن کے ذریعے فنکار کی شخصیت کو سمجھنا) جب وہ فن کار اور وہ اہلِ قلم کسی گذشتہ دور کا شخص ہو یعنی اب وہ نظروں کے سامنے نہ ہو اور پھر یہ بھی کہ اسے کبھی دیکھا بھی نہ ہو اس کی گفتگو اس کے رویوں اور میل جول سے کوئی واقفیت نہ ہو تو پھر دو صورتیں اس کی شخصیت کو پہچاننے کی رہ جاتی ہیں یا تو اس کے فن سے اس کی شخصیت کو جانا جائے یا پھر اس کے ہم عصر ایسے افراد جن سے اس کا براہِ راست تعلق رہا ہو ان کی رائے سے نتائج اخذ کیے جائیں مثلاً ہم اسی صورتِ حال سے دوچار ہیں کہ ہم نے نسیم امروہوی کو نہ سنا ہے (ان کی ریکارڈ آواز ضرور سنی ہے) نہ دیکھا ہے ایسی صورت میں ایک تو ان کے ہم عصر احباب، اہلِ خاندان اور شاگردوں کے توسط سے کچھ باتیں سامنے آتی ہیں اور کچھ فن کے ذریعے فنکار کی شخصیت سمجھی جاسکتی ہے۔فن پارے کے ذریعے فنکار کی شخصیت کو سمجھنا پروفیسر رشید احمد صدیقی کے نزدیک گمراہ کن بھی ہوسکتا ہے اس ذیل میں ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ:

'فن پارے سے فن کار کی سیرت و شخصیت کے نقوش جمع کرنا تنقیدِ ادب کا دلچسپ لیکن خطرناک یا گمراہ کن مشغلہ رہا ہے جہاں تک Lyric اور کسی حد تک غزل کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ وہ فن کار واردات قلبی، اس کی بصیرتوں، مسرتوں اور محرومیوں کی اکثر غماز ہوتی ہے لیکن اس کا اطلاق بیانیہ یا ڈرامائی شاعری پر نہیں کیا جاسکتا اس لیے ان

۱۰۳۔ ڈاکٹر عبدالحق کی شخصیت نگاری، مشمولہ نقدِ عبدالحق، مرتبہ سید معین الرحمٰن (لاہور: نذر سنز، طبع اول اگست، ۱۹۶۸ء)، ص۲۳۹

اقسام کی شاعری میں شاعر کو بیشتر دوسروں کا قالب اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جمالیات کے نئے نظریے سے ثابت ہے کہ فن شخصیت کا ظاہر ہوتا ہے لیکن اس میں شخصیت پر قطع و برید کا عمل بھی لازم آتا ہے میں نے جو کہیں یہ بات کہی ہے کہ ایک نامعقول شخص معقول شاعر نہیں بن سکتا اس کا مفہوم یہ ہے کہ فن کار کم سے کم اپنے تخلیقی لمحات میں کریم النفس اور معقول ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کی زندگی کے بیشتر لمحات کا تعلق لین دین کی اس دنیا سے ہوتا ہے جو اس کے اردگرد پھیلی ہوتی ہے اس لیے وہ عملی اور اخلاقی لحاظ سے اکثر و بیشتر نامعقول نظر آئے تو عجیب نہیں۔' [۱۰۴]

یہ اقتباس اگرچہ طویل ہو گیا لیکن اس میں شخصیت شناسی اور شخصیت نگاری کے بارے میں ایسی نازک باتیں کہی گئی ہیں جو پیشِ نظر رہنا ضروری ہیں خصوصاً یہ پہلو کہ جب کوئی شاعر یا ادیب تخلیقی لمحات میں ہوتا ہے تو وہ ایک دوسری دنیا میں پہنچا ہوتا ہے لیکن جب وہ تخلیقی لمحوں میں نہیں ہوتا اور اپنی اردگرد کی دنیا میں ہوتا ہے تو پھر اس کی شخصیت کے اصل روپ نظر آنے لگتے ہیں۔ اردگرد کا ماحول انسان کے لیے بہت اہم ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کے بننے اور بگڑنے کے راستے اسی ماحول سے نکلتے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین ہمیں بہت بہتر طور پر یہ بات سمجھاتے ہیں:

'بات یہ ہے کہ ہر انسان کو پیدا ہوتے ہی ایک دنیا ملتی ہے جو زبان و مکان کی پابند ہے اس کے گرد و پیش ایک (یا کئی) زبان استعمال کی جاتی ہیں، رہن سہن کے کچھ طریقے رائج ہوتے ہیں، کچھ عقائد ورثے میں ملتے ہیں، کچھ تہذیبی روایات سے واسطہ پڑتا ہے، ایسے اداروں میں تعلیم حاصل کرنا ہوتا ہے جو اس زمانے اور اس سماج میں رائج ہوتے ہیں اس کے بعد انسان کے اپنے ذاتی تجربے ہوتے ہیں، جن کی مدد سے وہ زندگی کے نشیب و فراز سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور جو دنیا اسے ملتی ہے اس کے متعلق اپنے تجربات کی روشنی میں نئے سرے پر غور کرتا ہے، سامنے آنے والی نئی چیزوں پر نگاہ ڈالتا، انہیں پرکھتا، جانچتا اور قبول یا رد کرتا ہے اسی درمیان میں مشاہدے اور مطالعے کی مدد سے دوسرے انسانوں کے تجربات اور خیالات سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے اور حالات کو پرکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، ہر نارمل انسان کے ذہنی

۱۰۴۔ خطبات (کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۹۱ء)، ص ۴۰۴

ارتقا کی کم و بیش یہ عام صورتیں ہیں۔ انفرادی اثرات و تجربات مشاہدے اور مطالعے سے وسیع تر ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے خیالات میں تدریجی، اضافی یا بنیادی فرق پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ بات فرد کے اندر بھی ہوسکتی ہے اور دوسروں کے مقابلے میں بھی اسی اختلاف کی بنیاد پر انفرادیت کے پہلو نمایاں اور واضح ہونے لگتے ہیں اور شخصیتوں کی الگ الگ تشکیل ہوتی ہے۔'[۱۰۵]

پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر محمود الٰہی کی آراء کے ان اقتباسات کی روشنی میں نسیم امروہوی کی شخصیت کا ہم بہت بہتر طور پر مطالعہ کرسکتے ہیں۔ نسیم امروہوی اپنی کمسنی ہی سے ایک حوصلے، لگن اور محنت و مشقت کے انسان رہے ہیں۔ جس کے نفسیاتی اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ بہت کم عمر تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، دادا نے پرورش کی، اور ان کے زمانے کا امروہہ (جہاں ان کی ولادت ہوئی) جہاں جاگیرداری اور زمینداری کے بھی اثرات تھے وہاں ایسے خاندان بھی تھے جن کے پاس نہ زیادہ دولت تھی اور نہ زمین۔ نسیم کا خاندان بھی ایسے ہی خاندانوں میں شمار ہوتا تھا، علم و ادب اور فکر و فن کی دولت تو آباؤ اجداد کے پاس بہت تھی لیکن دنیا کے مال و زر نہیں تھے ایسے میں محنت و مشقت کے بغیر زندگی گزارنا آسان نہیں تھا نسیم اس پس منظر میں بڑے ہوئے چنانچہ حوصلے اور لگن سے زندگی کا سفر طے کرنا انہوں نے ابتدا ہی سے سیکھا۔ ۱۹۲۳ء میں جبکہ ان کی عمر صرف ۱۵ ربرس تھی انہوں نے 'گلِ خوشرنگ' کے عنوان سے جو مسدس لکھا اور جسے بعد میں مرثیے کا چہرہ بنالیا اس میں انہوں نے محنت اور لگن ہی کو زندگی کی بنیاد قرار دیا۔ اسی باب میں ہم نے ان کی سوانح کا جو ابتدائی حصہ لکھا ہے اس میں ان کی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہوں نے زندگی بھر قلم کی محنت سے اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی کا سفر آگے بڑھایا۔ انہیں ہمیشہ اپنے قلم پر اعتماد رہا ہے البتہ اس ذیل میں کہیں کہیں ان کا لہجہ تلخ بھی ہوگیا ہے۔ مثلاً ان کے یہ فقرے:

'اگر کج بحثی یا بحث برائے بحث سے کام لیا گیا تو یہ نہ بھولیں کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں پنسل سے نہیں لکھتا۔ لوہے کے قلم سے لکھتا ہوں جس کا ٹوٹنا کوئی آسان کام نہیں۔'[۱۰۶]

اگر فن سے فنکار کی شخصیت کے مختلف رنگ در وپ سمجھے جاسکتے ہیں تو نسیم کے فن یعنی ان

۱۰۵۔ جدید ادب منظر اور پس منظر (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکاڈمی، اکتوبر ۱۹۷۸ء)، ص ۱۳۲

۱۰۶۔ فرہنگِ اقبال پر اعتراضات اور ان کے جوابات 'کتابچہ' (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۴ء)، ص ۳

کی شاعری پر جو جذبہ اور جو پیغام حاوی ہے وہ ہے عمل اور مسلسل عمل کا جذبہ۔ انہوں نے غزلیں اگر چہ بہت کم لکھی ہیں لیکن اس سے ان کی شخصیت کے جوہر خوب پہچانے جا سکتے ہیں: ؎

ناخدائے عشق میری ہمتوں کی داد دے — میں وہاں کشتی ڈبوتا ہوں جہاں ساحل نہیں

انقلاب اے مقصدِ تخلیق ہستی انقلاب — یہ جہانِ آب وگلِ اب تک مرے قابل نہیں

جب وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ جہان آب وگل اب تک مرے قابل نہیں، تو یہ دنیا سے گریز یا ترکِ دنیا کا کوئی ڈھنگ نہیں بلکہ اپنی مشکلات اور اپنے راستے کی رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لا کر آگے بڑھتے رہنے کا ایک جذبہ ہے۔ وہ دنیا میں رہنا سہنا جانتے تھے لیکن دنیا دار نہیں تھے اس لیے نام ونمود کے بجائے انہیں گوشہ نشینی میں لطف آتا تھا ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

'ان کی طبعی خود پوشی وگوشہ گیری نے انہیں گمنام رکھا ہے اور انہیں وہ شہرت بھی حاصل نہ ہوسکی جو ان سے کمتر درجے کے شاعروں اور ادیبوں کو آج کل ابلاغِ عامہ کے وسائل کی ارزانی کے سبب حاصل ہے لیکن ادب کی دنیا میں اس طرح کی شہرت دیر پا نہیں ہوتی۔ لوگ جتنی تیزی کے ساتھ سامنے آتے ہیں اتنی ہی تیزی سے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ زندہ رہنے کا شوقِ بے جا انہیں بہت جلد مار دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ سستی شہرت سے بے نیاز رہ کر صرف اپنی صلاحیت اور محنت کے سہارے جینا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور اپنے عہد کی ناقدریوں کا شکار رہ کر بھی نظیر اکبر آبادی اور غالب کی طرح امر ہو جاتے ہیں اس لیے نسیم امروہوی کی گمنامی اور ان کے کمالاتِ فن کے باب میں زمانے کی ناقدری میرے لیے حیرت انگیز نہیں۔ خود کو ڈھکائے چھپائے رکھنے والے اہلِ علم کے ساتھ دنیا نے عام طور پر اسی طرح کا ظلم کیا ہے لیکن وقت نے آگے چل کر انہی لوگوں کے حق میں فیصلے دیئے ہیں اور یہی لوگ تاریخ کے صفحات میں زندہ رہے ہیں۔'[۱۰۷]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے یہ درست کہا کہ نسیم صاحب صرف اپنی محنت اور صلاحیت کے سہارے زندہ رہنا چاہتے ہیں اگر ہم امروہہ سے لکھنؤ، لکھنؤ سے رامپور، میرٹھ اور لاہور و خیر پور سے کراچی تک ان کی زندگی کے مختلف ادوار کو دیکھیں تو ہمیں محنت اور صلاحیت کے سہارے زندہ رہنے کی تصویریں نظر

۱۰۷۔ مقدمہ صبحِ ازل (لاہور: ظفر شارب، ۱۹۸۱ء)، ص ۳

آتی رہیں گی ان کی محنت اور صلاحیت کا راز ان کے قلم کی طاقت میں پوشیدہ رہا۔ انہوں نے دن رات مطالعہ کیا۔ اردو زبان تو اپنی جگہ پر وہ تو ان کی مادری زبان تھی انہیں عربی و فارسی پر اتنا قابو تھا کہ موجودہ تعلیمی نظام کی ڈگریاں نہ رکھتے ہوئے بھی بڑے بڑے سند یافتہ دورِ جدید کے اہلِ قلم ان کی کی بزرگی و علمی برتری کو تسلیم کرتے تھے۔ سندھی زبان کی ادیب و دانشور پیر حسام الدین راشدی جو ترقی اردو بورڈ میں ان کے رفیقِ کار رہے ان کی علمی فضیلتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> 'فارسی اور عربی زبان پر انہیں قدرتِ کاملہ حاصل تھی چنانچہ جب آپ نے بورڈ میں کام کا آغاز کیا تو رفتہ رفتہ آپ کے جوہر کھلتے گئے اور علمی فضیلت آشکار ہوتی گئی کچھ ہی عرصے کے اندر معیار اور رفتار کے لحاظ سے نہ فقط اپنے ہم کاروں کو کوسوں پیچھے چھوڑ دیا بلکہ ارکانِ بورڈ کے دلوں پر بھی آپ کی علمیت اور فضیلت کا سکہ بیٹھ گیا اور تمام ممبر ایک وقیع، ذہین، پُر مایہ، عالم اور بزرگ کی حیثیت سے ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو گئے۔[۱۰۸]

نسیم امروہوی کی شخصیت کے حوالے سے ڈاکٹر اسلم فرخی نے لکھا ہے:

> 'ان کی شخصیت کا وہ پہلو جس پر توجہ کم ہوئی وہ ہے ان کا معلمانہ ذوق وشوق، جذبۂ تحقیق و جستجو اور نئی نسل کی علمی و ادبی پرورش و تربیت، میرا خیال ہے کہ وہ بزرگ قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ اول تا آخر ایک معلم تھے بااصول صحیح تربیت دینے والے، جوہر کو اُجاگر کرنے والے ان کے تلامذہ اور ان کی درسی کتب دونوں سے ان کی شخصیت کے اس پہلو کا اظہار ہوتا ہے۔'[۱۰۹]

نسیم امروہوی کی دوسری اہلیہ معجزہ خاتون اپنی زندگی کے آخری تیس برسوں میں ذہنی اعتبار سے نارمل نہیں تھیں ان کے ایک بیٹے نسیم رضا بھی ذہنی معذوری کا شکار تھے۔ ایک صاحبِ فکر، حساس اور ہمہ وقت علم و ادب سے تعلق رکھنے والے شخص کے لیے گھر کا خوشگوار ماحول بہت اہمیت رکھتا ہے لیکن نسیم اس اعتبار سے بدقسمت تھے کہ انہیں گھر کی طرف سے سکون و آرام نصیب نہیں تھا اس کے باوجود وہ ان تمام مشکلات کو مسکرا کر جھیلتے رہے ترقی اردو بورڈ میں لغت سازی کے ایک رفیقِ سفر شان الحق حقی اسی حوالے سے کہتے ہیں:

۱۰۸۔ نسیم کو جیسا میں نے پایا، روزنامہ حریت، کراچی اشاعت ۷/اکتوبر،۱۹۷۴ء، ص ۵

۱۰۹۔ ارمغانِ نسیم کے حوالے، مشمولہ میراث، ششماہی، کراچی شمارہ جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء، ص ۱۹

'وہ بڑے گھمیر اور بُرد بار انسان تھے اپنی نجی پریشانیوں کا ذکر نہیں کرتے تھے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی خانگی زندگی بڑی ناخوشگوار تھی جسے انہوں نے بڑے صبر وسکون کے ساتھ جھیلا۔'[۱۱۰]

رئیس امروہوی جوان کے صرف ہم عصر ہی نہیں ہم وطن اور قریبی دوست بھی رہے نسیم کی زندگی کے کئی رخ ان کے سامنے بے نقاب تھے گھریلو زندگی سے دفتری زندگی تک بیشتر معاملات ان کی نظروں میں تھے وہ نسیم کی شخصیت اور ان کے کردار و اخلاق کے حوالے سے مراثی نسیم کے مقدمے میں[۱۱۱] جن باتوں کا اظہار کرتے ہیں ان میں سے چند کے اقتباس دیکھیے:

'آپ نے اپنی زندگی میں محنت شاقہ اور عرق ریزی سے ہزاروں روپے کمائے مگر کبھی سرمائے کی صورت میں ایک جھنجی کوڑی جمع نہیں کی، احباب یا اعزا کی ضرورت میں بطور نذر جو کچھ انہیں دے دیا پھر کبھی واپسی کی تمنا نہیں کی، اور بیگانے طالب علموں کی فیس ادا کردی، کتابیں منگوادیں، سردی کے کپڑے بنوادیے، کتنی ہی بیواؤں اور یتیموں کی مستقل اور عارضی اعانت کردی۔ لاوارث بچیوں کو جہیز مہیا کردیا، مساکین کے لیے آزوقہ فراہم کردیا۔' (ص،۶)

'گھر جا کر دیکھیے تو معمولی پلنگ، بستر، کرسی، ضروری برتن اور سیدھے سادے سامان کے علاوہ ریڈیو تک نظر نہ آئے گا جو آج کل لازمۂ زندگی ہے یہ سادگی دیکھ کر کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی کلاس ون گریڈ کے ملازم کا گھر ہے۔' (ص،۶)

'جس محلّے میں جا کر رہتے ہیں وہاں کے لوگ اپنے معاملات میں آپ سے مشورہ لیتے ہیں اور باہمی نزاعات کے فیصلے میں آپ کو حکم بناتے ہیں۔' (ص،۷)

'بچوں کی آسائش اور گھر کے کام کاج کے لیے ایک دو ملازم ضرور رکھتے ہیں لیکن اپنی چلم خود بھرتے ہیں، اپنا راشن بازار سے آپ لاتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر کھانا بھی خود ہی پکا لیتے ہیں۔' (ص،۷)

نسیم صاحب کی زندگی اور ان کے روز و شب کے معمولات میں سادگی اختیار کرنے کا

۱۱۰۔ تعزیت نامہ (کراچی: ۱۹۸۷ء)، ص ۱۶

۱۱۱۔ مقدمۂ مراثی نسیم 'جلد دوم' (کراچی: پاکستان رائٹرس گلڈ، ۱۹۷۶ء)

تذکرہ جو رئیس امروہوی صاحب کے ان اقتباسات میں ہے اس کا اندازہ ہمیں ان کی ابتدائی زندگی ہی سے ہوتا ہے۔ ان کی شادی کے موقع پر جو سادگی اپنائی گئی تھی جبکہ وہ اس وقت بالکل نوجوان تھے ایک ایسی قابل تقلید مثال ہے جس سے ہمارے معاشرے کی اس بڑی خرابی کو دور کیا جاسکتا ہے جس نے اقتصادی مشکلات میں بہت اضافے کر دیے ہیں۔

کراچی میں ان کے بہت ہی قریبی ساتھی سبط حسن انجم کہتے ہیں:

"گفتگو کیسی ہی تلخ ہو، تحمل، شائستگی، افہام وتفہیم سے بگڑی ہوئی بات بنانے کی کوشش کرتے تھے کسی کی کوئی بات ناگوار بھی گزرتی تو ہنس کر ٹال دیتے تھے دل آزاری کو کفر سمجھتے تھے انسان دوستی، تالیفِ قلب، عزتِ نفس، اتحاد، محبت، خلق، مروت، تواضع، انکساری اور رواداری ان کا مسلک تھا۔"[۱۱۲]

نسیم صاحب کے رہن سہن، اوقاتِ کار اور لین دین کے معاملات میں بہت ڈسپلین تھا ان کے تیسرے صاحبزادے قسیم ابن نسیم کی اہلیہ یعنی ان کی بہو معصومہ خاتون نے مجھے بتایا کہ نسیم صاحب روز کے جو اخراجات ہوتے اسے روزانہ شام کے بعد ایک ڈائری میں لکھتے[۱۱۳]

نسیم ایک مذہبی پس منظر کی شخصیت تھے لیکن ان کا یہ تعلق محض جذباتی تعلق نہیں تھا انہوں نے بہت محنت، توجہ اور شعور کے ساتھ مذہب کا مطالعہ کیا تھا اس معاملے میں وہ صرف باتوں کے آدمی نہیں تھے عمل کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے یعنی گفتار کے نہیں کردار کے آدمی تھے بعض لوگ تو انہیں عالم وفقہیہ کا درجہ دیتے تھے۔

صحفیہ کاملہ کا ترجمہ اور ارمغانِ نسیم میں عراق کے سب سے بڑے عالم ومجتہد آقائے خوئی کے نام ان کے فارسی میں جو خطوط شائع ہوئے ہیں[۱۱۴] اس سے مذہبیات میں ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ سادات کے ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن کسی دوسرے عقیدے یا فرقے کے شخص کو کبھی بھی خود سے کمتر نہیں سمجھا ان کی کشادہ خیالی ان کی اسی طبیعت اور رویے کی عکاسی کرتی ہے: ؎

فراتِ دہر کا پانی سب ہی کو پینے دو
یہی ہے رازِ بقا دوسروں کو جینے دو

۱۱۲۔ مولانا نسیم امروہوی میری نگاہ میں، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۵۲

۱۱۳۔ ۱۷ رمارچ ۲۰۰۳ء کو معصومہ خاتون سے ایک ملاقات میں اس ڈائری کی ورق گردانی کا مجھے موقع ملا

۱۱۴۔ عکسی خطوط، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۲۸ تا ۳۳۰

'نماز روزے کے پابند تھے لیکن ظاہری عبادت سے زیادہ روحانی تقوے کو اہمیت دیتے تھے۔' وہ چاہتے تھے کہ مذہب کا مطالعہ کیا جائے تو پہلے ذہن سے ہر تعصب کو نکال دیا جائے لوگوں کو مذہب کی تعلیم سے پہلے روشن خیال بنایا جائے۔

ترقی اردو بورڈ میں انہوں نے جوش ملیح آبادی کے ساتھ بہت عرصے تک اردو لغت کے لیے مل کر کام کیا۔ سب جانتے ہیں کہ جناب جوش مذہب کے معاملے میں بے احتیاط تھے جو چاہتے تھے برملا کہہ دیتے تھے، لیکن نسیم صاحب کے اور ان کے درمیان اس معاملے میں کبھی کوئی تلخی اس لیے نہیں ہوئی کہ وہ گفت وشنید سے کسی بھی معاملے کو سلجھانے کے قائل تھے۔ جوش صاحب اسی لیے ان کے قدر دانوں میں تھے۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے لکھا ہے کہ فارسی اور عربی پر نسیم کو بڑی قدرت تھی اور اردو تو ان کی مادری زبان تھی لیکن اس مادری زبان پر بھی انہیں اتنا قابو تھا کہ بڑے بڑے اساتذہ ان سے زبان کے مسائل دریافت کرتے تھے۔ جوش ملیح آبادی جیسی شخصیت جنہیں زبان و بیان پر بہت زیادہ قدرت حاصل تھی ان کا کہنا تھا کہ:

'میں لفظ پر نسیم امروہوی کی علمی گرفت کا معترف رہا ہوں۔'[115]

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ۱۹۴۲ء میں نسیم کے نام ایک خط میں یہ لکھا تھا کہ آپ کو زبان پر بڑی قدرت ہے۔[116] وہ اردو کے بہت سچے اور ہمدرد دوست تھے اس زبان کی علمی وادبی ترقی میں ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ صرف ہوا۔ کراچی میں جب بھی لسانی جھگڑے ہوئے انہوں نے اسے انتہائی ناپسندیدہ قرار دیا سبط حسن انجم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

'زبان جو انسانوں کے درمیان محبت اور اتحاد و اتفاق کی راہیں کھولتی ہے کیا اس کے نام پر اب انسانوں کا خون اتنی ارزانی سے بہے گا۔'[117]

ہندوستان میں اردو کے ایک ممتاز شاعر مہدی نظمی ۱۹۴۷ء سے پہلے کی یادیں سمیٹتے ہوئے نسیم صاحب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'نسیم امروہوی مرحوم ماہرِ لسانیات تھے اس لیے اردو کے حال و مستقبل کے بارے میں تبادلۂ خیال بھی ہوتا اور کچھ لسانی معلومات بھی میسر آتیں وہ اردو کے حال و مستقبل کے

۱۱۵۔ فلیپ فرہنگِ اقبال فارسی (لاہور: اظہار سنز ۱۹۸۹ء)

۱۱۶۔ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ (کراچی: محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۵۱۲

۱۱۷۔ تعزیت نامہ، کراچی ۱۹۸۶ء ص، ۱۱

بارے میں بحیثیت زبان مایوس نہیں تھے لیکن اپنا یہ اندیشہ بھی بے تکلف ظاہر کرتے تھے کہ اردو کو اگر بطور زبان کبھی کوئی نقصان پہنچے گا اردو کے مخالفوں اور ہندی کے کٹر اور متعصب حامیوں کے ہاتھوں نہیں پہنچ سکے گا ان کا کہنا تھا کہ پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کو لارڈ کلایو نے شکست نہیں دی تھی اس غیور اور وطن دوست بادشاہ کو شکست دی تھی میر جعفر اور میر قاسم کی غداری نے۔ اردو بڑی طاقتور زبان ہے وہ ہر طرح کے جارحانہ حملے کا مقابلہ کرسکتی ہے اور کتنی ہی طاقت سے حملہ کیا جائے اسے پسپا کرنے کی توانائی رکھتی ہے لیکن مزاجاً اتنی نازک ہے کہ بغلی گھونسہ برداشت نہیں کرسکتی۔'[۱۱۸]

مہدی نظمی نے لکھنؤ میں نسیم کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کے حوالے سے ان خیالات کا اظہار کیا لکھنؤ ہی کی یادوں کے سلسلے سے ڈاکٹر حسین محمد جعفری لکھتے ہیں:

'مجھے ان سے بہت ہی قریبی تعلقات کا شرف ان کے قیامِ لکھنؤ کے زمانے سے حاصل ہے...... وہ ان نابغہ روزگار شخصیات میں سے تھے جن کا بدل اس زمانے میں ملنا مشکل ہی نہیں محال ہے آپ کہاں سے ایک ایسی ہستی لائیں گے جو بیک وقت ایک عظیم شاعر بھی ہو، ایک عظیم ترین لغت کا خالق بھی ہو، عربی و فارسی پر مکمل عبور بھی رکھتا ہو۔ علوم اسلامیہ پر پوری طرح دسترس ہو، اردو کے نصاب میں بھی برصغیر میں اس کی لکھی ہوئی کتابیں انتہائی مستند اور مقبول ہوں۔ نسیم صاحب کو لوگ عام طریقے سے بحیثیت ایک مرثیہ نگار شاعر اور لغت کا عالم سمجھتے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ تھے میں نے ان جیسی جامعیت کے لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔'[۱۱۹]

ایسی شخصیت جس میں انسانیت وشرافت کی اعلیٰ روایتیں موجود ہوں اور جس نے اپنے علم وادب سے اپنے اطراف کے ماحول اور پورے سماج کو فائدہ پہنچایا ہو۔ اس کی ادبی خدمات کا سماجی مطالعہ بہت اہمیت کا حامل ہے دوسرے باب میں ہم یہ مطالعہ کریں گے کہ ان کی تحریروں میں سماج کے متعلق کیا خیالات پائے جاتے ہیں اور ان کی شاعری، نثری مضامین، لغت نویسی، صحافت، مذہبی ادب اور دوسری ان گنت تحریروں میں سماجی تصورات کا کیا خاکہ ہے۔

۱۱۸۔ نسیم امروہوی کچھ یادیں، کچھ باتیں، مشمولہ ڈاکٹر سیادت فہمی، نسیم امروہوی ایک تعارف (امروہۂ بزمِ حیات، جنوری ۱۹۹۱ء)، ص۴۶

۱۱۹۔ تعزیت نامہ (کراچی: ۱۹۸۷ء)، ص۱۷

دوسرا باب

نسیم امروہوی کے سماجی تصورات

- ادب اور سماج
- ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی
- سماجی وابستگی کا ادب
- نسیم کا سماجی پس منظر
- سماجی تصورات کی بنیادیں
- سرسید اور حالی کے تصورات اور نسیم
- نسیم کی تحریریں ادب برائے زندگی کے نظریے کی ترجمان ہیں
- نسیم امروہوی اور ترقی پسندی
- پہلی طویل نظم میں سماجی پہلو
- سماجی احساسات اور گلِ خوشرنگ
- معاشرتی ناہمواریوں کا ازالہ کس طرح ممکن ہے
- انسانی رشتوں کا محور اور اس کا سماج سے رشتہ
- رثائی سماج
- مذہبی افکار اور سماجیات
- لغت نویسی......ایک سماجی مظہر

دوسرا باب

نسیم امروہوی کے سماجی تصورات

پس منظر

پیش نظر باب جو نسیم امروہوی کے سماجی تصورات کو سمجھنے اور سمجھانے سے متعلق ہے ہم مقالے کے اس دوسرے باب میں اس بات کا خاص طور سے مطالعہ و تجزیہ کریں گے کہ معاشرے کی قدر و قیمت اور اقدارِ انسانی کے بارے میں نسیم صاحب کی شاعری، نثری تحریروں اور ان کی دیگر ادبی خدمات میں ہمیں کیا کیا پہلو ملتے ہیں۔

انسانی سماج انسانوں کے آپس کے تعلقات اور ان کے باہمی ربط و ضبط سے قائم ہوا لاکھوں سال کی مدت میں یہ ارتقائی مراحل سے گزرا اور اب بھی گزر رہا ہے۔ انسان ہی اس سماج کو پستی سے بلندی پر لے کر آیا۔ انسان کی ایجادی اور تخلیقی کوششیں اور کاوشیں ہی سماج کے خدوخال مرتب کرتی ہیں۔ سماج میں زندگی کا ارتقا انسانی ذہن کی نشو و نما کے بغیر نہیں ہوسکتا اس لیے ہم کسی بھی ادیب و شاعر کی ادبی خدمات کا مطالعہ کرتے ہوئے خصوصاً اپنے تحقیقی موضوع کے پیشِ نظر اس پہلو پر بھی خصوصیت سے غور و فکر کریں گے کہ نسیم امروہوی نے انسانی ذہن کو نکھارنے اور سماج کو ترقی کی راہوں پر رواں دواں کرنے کے بارے میں کیا حصہ لیا۔

ہمیں اس زاویے سے ضرور سوچنا چاہیے کہ ادیب اپنے سماج سے علیحدہ ہے یا وہ اپنے ہی معاشرے کا ایک فرد ہے۔ جب ہم اسے معاشرے کا ایک فرد تسلیم کرلیں تو پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے معاملات و مسائل سے آنکھیں کس طرح چرا سکتا ہے فیض احمد فیض کی ایک تحریر سے یہ

اقتباس ہماری بات کواور واضح کر دیتا ہے:

'کسی معاشرے کے فرداور رکن یا کسی ملک کے ایک ذمہ دار شہری ہونے کے اعتبار سے ایک ادیب کی حیثیت کسی اور رکنِ معاشرہ یا شہری سے مختلف نہیں اس لحاظ سے معاشرے کی اصلاح وتطہیر کے متعلق ادیب کے فرائض بعینہ وہی ہیں جو کسی غیر ادیب کے ہیں اور کوئی پروانۂ شاعری (Poetic Lieense) اسے ان فرائض سے مستثنیٰ نہیں کرتا۔'[۱]

ادب اور سماج

ادب کا سماج سے کیا رشتہ ہے؟

اس موضوع پر ہماری زبان و ادب کی تاریخ میں بہت بحثیں ہو چکی ہیں۔ اس حوالے سے کافی تنقیدی ذخیرہ ہے جس سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں۔ اگر اس کی تفصیلات میں جائیں تو ایک نہ تھمنے والی بحث میں الجھ جائیں گے لیکن نسیم امروہوی کے سماجی تصورات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں بحث کے چند بنیادی نکات کوضرور سامنے لانا چاہیے۔

ادب اور سماج کے رشتوں کو سمجھنے کی کوشش کا آغاز دراصل سر سید احمد خاں اور مولانا الطاف حسین حالی کے زمانے سے بلکہ یوں کہیں کہ ان کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ سر سید کے رسالے 'تہذیب الاخلاق' اور حالی کی کتاب 'مقدمۂ شعر وشاعری' سے اس کی ابتداء ہوئی۔ سر سید نے اپنے مضامین میں جو نکات اٹھائے حالی اس سے بہت متاثر ہوئے:

'سر سید احمد خاں کے یہی خیالات منظم و مربوط اور مکمل و مدلل شکل میں مقدمہ شعر و شاعری کی صورت میں مولانا حالی سے ظہور پذیر ہوئے۔'[۲]

ڈاکٹر سید عبداللہ تو مسدس حالی کو بھی 'تہذیب الاخلاق' کی منظوم شرح قرار دیتے ہیں۔[۳] حالی سر سید کے افکار ہی کے زیرِ اثر اس نظریے کو لے کر آگے بڑھے تھے کہ شاعری سماج سے متاثر ہوتی ہے، اس کو متاثر بھی کرتی ہے اور قوم کی تعمیر میں ایک وسیلے کی حیثیت رکھتی ہے۔

پروفیسر احتشام حسین 'مقدمۂ شعر وشاعری' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ بات کہتے ہیں:

۱۔ متاعِ لوح وقلم (کراچی: مکتبۂ دانیال، دسمبر ۱۹۷۳ء)، ص ۱۴۱

۲۔ سید الطاف علی بریلوی، علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں (کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۷۰ء)، ص ۳۱

۳۔ وجہی سے عبدالحق تک (لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب، اشاعتِ ثانی، ۱۹۷۷ء)، ص ۱۱۵

'حالی، سماج، اخلاق اور شاعری کے تعلق سے بحث کرتے ہیں یہ بحث اس لیے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ یہاں ادب میں مقصدیت کے اس عام خیال سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو انیسویں صدی کے آخری پچیس، تیس سال میں ہندوستان کے ادبی تصورات کا جز بن رہا تھا۔'[۴]

سرسید تحریک سے ترقی پسند تحریک تک ہماری ادبی و سماجی زندگی نے جو منزلیں طے کی ہیں اس کے اثرات میں یہ پہلو سب سے نمایاں ہو کر سامنے آیا کہ اب زندگی اور سماج سے ادب کے تعلق کا شعور عام ذہنوں میں بھی اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ضروری ہے کہ ہم ایک بالکل الگ حیثیت سے ادب کا سماجی مطالعہ کریں۔ عبدالحق اس ذیل میں لکھتے ہیں:

'ادب کا سماجی مطالعہ اس دور میں خاص طور پر مقبول ہوا کیوں کے اس سے فن کو پرکھنے کا ایک نیا زاویہ نظر ملا۔ فن کی تخلیق کا سرچشمہ سماج کے گرد و پیش کے حالات قرار پائے ضروری سمجھا گیا کہ ادب و شعر کے سماجی رشتوں کو زیر بحث لایا جائے۔'[۵]

سرسید اور حالی کے زمانے سے ادب اور سماج کے تعلق کو سمجھنے اور سمجھانے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ بیسویں صدی میں آ کر اور نمایاں ہوا اور پھر جب ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک ظاہر ہوئی تو نئے ماحول اور نئی فضا میں ادب اور سماج کے تعلق پر نئے نئے افکار سامنے آنے لگے۔

ان افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی ذہن جو بھی کہتا ہے بلکہ یوں کہیں کہ اس کی جتنی بھی تخلیقی کاوشیں ہوتی ہیں وہ سب مقصدیت ہی کی پیداوار ہوتی ہیں وہ شاعری ہو، مجسمہ سازی ہو یا رقص و موسیقی۔ یہ فنونِ لطیفہ کسی اندرونی تحریک ہی کے نتیجے میں اظہار کا لباس پہنتے ہیں اور شعوری اور مقصدی طور پر ان کا ظہور ہوتا ہے۔ فنونِ لطیفہ کی سماجی افادیت تو عہدِ سرسید ہی سے موضوعِ بحث بن گئی تھی لیکن کارل مارکس کے خصوصی نظریے کے تحت اس کا مفہوم ایک بالکل دوسرے تعارف کے ساتھ سامنے آیا۔ اس حوالے سے رئیس امروہوی نے اپنے ایک مضمون میں یہ وضاحت کی ہے:

'فنونِ لطیفہ کی سماجی افادیت کی وہ مارکسی اصطلاح جو اس عہد کے بعض یا اکثر ناقدانِ فن کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے۔ اپنے مفہوم اور عمل کے لحاظ سے بالکل مختلف چیز ہے۔

۴۔ عکس اور آئینے (لکھنؤ: فروغ اردو، ۱۹۷۰ء)، ص ۱۵۰

۵۔ جائزے، تبصرے اور تعارف، مشمولہ ماہنامہ کتاب نما (نئی دہلی: جامعہ نگر، جولائی ۱۹۷۵ء)، ص ۸۶

شعروادب کی حد تک سماجی افادیت کا کیا مفہوم ہے؟

ادبی اور شعری (یا دوسرے لطیف فنون کی تخلیق کے) وائرے میں سماجی افادیت کا مفہوم یہ ہے کہ نظم ونثر کی شکل میں جو کچھ لکھا اور کہا جائے وہ اس واضح نصب العین اور شعوری مقصد کے ساتھ لکھا جائے کہ ہم اپنی ذہنی تخلیقات کے ذریعے اُن سماجی نصب العینوں کی تکمیل کررہے ہیں۔ جو ایک مطلوبہ معاشی، ثقافتی اور فکری نظام کو وجود میں لانے کے لیے ضروری ہیں یعنی ایک ایسے سماج کا قیام، جس میں معاشی بنیادوں پر طبقوں کا وجود نہ ہو۔[۶]

بیسویں صدی کے تنقیدی مضامین میں اس موضوع پر کافی لکھا گیا کہ آیا شاعری یا ادب کا کوئی سماجی مقصد ہونا بھی چاہیے یا نہیں؟ اور پھر کیا اس مقصد کی حد بندی کی وجہ سے شاعری، ناول، افسانہ، ڈرامہ یا کوئی اور نثری تحریر محدود نہیں ہوجائے گی! ممکن ہے اپنے کسی خاص سیاسی مقصد یا سماجی افادیت کی وجہ سے وہ کسی خاص حلقے میں ایک مخصوص ذہنیت کے لوگوں کے سامنے کامیاب شاعری کا تاثر پیدا کردے لیکن جب وقت کا تیز رفتار پہیہ آگے نکل جائے اور پورا ماحول ہی دوسرا ہوجائے تو کیا یہ تخلیقات اپنا اثر قائم رکھ سکیں گی! اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ان تخلیقات میں اگر شعری ہنر اور ادبی وصف موجود ہوا اور ایسی اقدار ان میں باقی رہیں جن میں تمام انسانیت شریک ہے تو وہ یقیناً اپنا اثر باقی رکھیں گی۔ ٹی ایس ایلیٹ اس ڈھنگ کی شاعری کو حقیقی شاعری قرار دیتے ہوئے بہت واضح طور پر اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرتے ہیں:

'بعض اوقات لوگ باگ ایسی شاعری کو جس کے سامنے کوئی خاص مقصد ہوتا ہے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں مثال کے طور پر ایسی شاعری جس میں شاعر کسی سماجی، اخلاقی، سیاسی یا مذہبی نظریے کی تبلیغ کررہا ہو۔ ایسے میں وہ لوگ یہ بات کہنے میں بھی تامل نہیں کرتے کہ جب شاعر مخصوص نظریوں کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگتا ہے تو شاعری شاعری نہیں رہتی۔ برخلاف اس کے کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ ایسی شاعری حقیقی شاعری ہوتی ہے کیونکہ اس میں ایک ایسے نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے جسے وہ پسند کرتے ہیں۔ میں یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ سوال کہ آیا شاعر اپنی شاعری کو کسی سماجی رویے کی تبلیغ یا مخالفت کے لیے استعمال کررہا ہے بذاتِ خود اتنا اہم نہیں ہے۔ ممکن ہے

۶۔ ادب اور سماج، مشمولہ ماہنامہ انشا، کراچی شمارہ فروری ۱۹۶۰ء، ص ۱۸

جب شاعر کسی خاص لمحہ کے مقبول رویے کو اپنی شاعری میں پیش کر رہا ہو تو ایسے میں اس کی خراب شاعری بھی عارضی طور پر مقبول ہو جائے۔ لیکن حقیقی شاعری کا معیار یہ ہے کہ وہ کسی رویے کی عام مقبولیت کے بدلنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے بلکہ یہاں تک ہوتا ہے کہ جب اس مسئلے میں کسی کو ذرہ برابر بھی دلچسپی نہ رہے جس پر شاعر نے پُر جوش طریقے پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی تھی، اس وقت بھی اس کی شاعری میں وہی توانائی اور وہی تازگی برقرار رہتی ہے۔'[۷]

یہ جب ہی ہو سکے گا جب شاعری اپنے سماجی تعلق کے باوجود شاعری رہے سماجی دستاویز نہ بن جائے۔ شاعر یا ادیب کیمرے یا رپورٹر کا کام نہ کریں بلکہ اپنے تخلیقی ہنر سے وہ مشاہدات اور تجربات سے گزریں۔ ادب کا سماجی تعلق ضروری نہیں ہے کہ ادب کے تاثر کو عارضی کر دے لکھنے والے کی تخلیقی توانائی اسے زندہ رکھ سکے گی۔

اردو میں اگر چہ ہم سرسید کے زمانے سے اور پھر خصوصاً ترقی پسند تحریک کے بعد سے ادب وسماج کے تعلق کا زیادہ مطالعہ کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر محمد حسن مشرق ومغرب کے تنقیدی تصورات کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کا رشتہ افلاطون کے زمانے سے جوڑتے ہیں ان کی تحریر کا ایک اقتباس یہ ہے:

'یوں تو ادب کے سماجی مطالعہ کی روایت افلاطون سے شروع ہوتی ہے جس نے حقیقت اور فنونِ لطیفہ کے رشتے پر غور کر کے فن کو نقل کی نقل قرار دیا تھا اور دوسری طرف سماج پر فن کے مضر اثرات کے پیشِ نظر فن کاروں کو مثالی معاشرے سے نکال باہر کر دیا تھا لیکن سائنس کے عروج کے بعد ادب کا رشتہ سماج سے اور گہرا ہو گیا یہ کوشش کی جانے لگی کہ جس طرح سائنسی طریق کار مادی حقیقت کے مختلف اجزا کو معروضی طور پر جانچنے اور پرکھنے میں کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ اسی طرح ادب کی پرکھ میں بھی دوٹوک اور قطعی فیصلوں تک پہنچا جائے۔'[۸]

۷۔ ایلیٹ کے مضامین، مترجم، جمیل جالبی (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰ء) ص ص ۳۱، ۳۲

۸۔ مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو پہلا ایڈیشن ۲۰۰۰ء) ص ۳۸۲

ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی

یہ سوال ایک تو ترقی پسند تحریک کے سبب اور دوسرے مغرب کے نئے ادبی تصورات کی وجہ سے ہر جانب اکثر ادبی تحریروں میں بحث کا حصہ بن گیا۔

ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی؟ اس بحث سے جو نتائج نکلتے ہیں ان کی تفصیلات کسی بھی ادیب وشاعر کے خیالات اور اس کے افکار کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی کتاب 'ادب وانقلاب'[۹] سے اس بحث کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد اردو کے بڑے نقادوں اور ادیبوں کی تحریریں نئے افکار اور نئی تعبیرِ حیات کے ساتھ کوئی نہ کوئی نیا پہلو سامنے لاتی رہیں اگرچہ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب، یا فن برائے فن کی بحثیں اب بہت پرانی ہو چکی ہیں لیکن کسی بھی اپنے مخصوص پس منظر میں جب کوئی بڑی ادبی شخصیت (جیسے نسیم امروہوی) تحقیق یا تنقید کا موضوع بنتی ہے تو ہمیں اس بحث میں پھر شامل ہونا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے درست کہا:

> 'فن برائے فن کے دن تو بیت گئے اور اب یہ بحث بے معنی ہوگئی ہے لیکن اب بھی ادب اور سماج کے رشتوں کے متعلق ادیب کے حسّاس ذہن پر اپنے اطراف واکناف کے کوائف کے ارتسامات، ادیب کا ردِعمل اور پھر اس کشمکش سے پھوٹنے والا اس کا تخلیقی ادب اور اس ادب کا اردو کے قاری کس طرح استقبال کرتے ہیں یہ سب امور زیرِ بحث ہیں اور رہیں گے۔'[۱۰]

سماجی وابستگی کا ادب

سماجی وابستگی کا ادب کیا ہے۔ یعنی کون سی تحریریں ہیں جن کو ہم سماج کے معاملات سے قریب کہیں گے ادب کی سماج سے وابستگی کے متعلق رسالہ معیار کے اداریے میں کی گئی یہ وضاحت ہمیں اس موضوع کو مختصر مگر جامع انداز میں سمجھنے میں آسانی پیدا کر دیتی ہے:

> 'سماجی وابستگی کا ادب دراصل سماج کو بدلنے کی تحریک کا ادب ہے سماج کو بدلنے کے معنی

۹۔ (بمبئی: نیشنل ہاؤس، ۱۹۴۵ء)

۱۰۔ سماجی تقاضے اور ادیب کے فرائض مشمولہ طلوعِ افکار، کراچی شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۶

ہیں انسان کے مقدر کو بدلنے والی قوت سے وابستگی انسان کے مقدر کو بدلنے والی قوت سے وابستگی کے معنی ہیں زندگی کی گہری معنویت کی تلاش اور خوابوں کو حقیقت بنا دینے کی جدو جہد۔''[۱۱]

نسیم کی تحریروں کے سماجی مطالعے اور ان کے سماجی تصورات کو ہمیں درجِ بالا اقتباس کی روشنی میں بھی دیکھنا چاہیے۔ اس اقتباس سے ہی یہ خیال ہمارے ذہن میں آیا کہ ایک تو ہوتی ہے خوابوں کو حقیقت بنا دینے کی خواہش اور ایک ہوتی ہے خوابوں کو حقیقت بنا دینے کی جدو جہد۔ خوابوں کو حقیقت بنا دینے کی 'خواہش' عموماً ان شاعروں کے دل میں ہوتی ہے جو کسی نہ کسی رومانی تصور سے وابستہ ہوتے ہیں اور جن میں سے اکثر ہجر و وصال کے قصوں میں الجھے رہتے ہیں۔ لیکن خوابوں کو حقیقت بنا دینے کی جدو جہد ایک بالکل دوسری چیز ہے۔ خواہش اور جدو جہد میں بڑا فرق ہے۔ 'نسیم اللغات' میں نسیم امر وہوی خواہش کے مفہوم کے لیے آرزو، تمنا، ارمان، شوق اور رغبت کے لفظ لکھتے ہیں جبکہ جدو جہد کی تشریح میں وہ کوشش، دوڑ دھوپ، محنت، مشقت اور جانفشانی کو بنیاد بناتے ہیں۔[۱۲] خوابوں کو حقیقت بنا دینے کی جدو جہد سے دراصل وہ ہی اہلِ قلم وابستہ ہوتے ہیں جو ادب و سماج کے رشتے پر یقین رکھتے ہیں۔ اردو کے وہ نقاد جو ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند طرزِ فکر سے زیادہ قریب رہے انھوں نے ادب و سماج کے تعلق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ادب و ادیب کے فرائض کے بارے میں دوٹوک باتیں کہیں۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل کا نقطۂ نظر اس بارے میں یہ ہے:

'ادب تو انسانوں کی تہذیبِ نفس کے لیے، انھی کے بیچ سے' ان کے حالات کے تحت آتا ہے اور انہیں زندگی کا آئینہ دکھا کر ایک بہتر، منظم اور شائستہ زندگی کے لیے تیار کرتا ہے اور اگر یہ سب ادب کا مقصد نہیں تو ساری ادبیت، جمالیات، سماجیات، فن اور فنون اور اسی طرح کی وہ تمام تہذیبی صورتیں جو انسانیت کو بناتی سنوارتی ہیں سب بیکار ہیں۔'[۱۳]

ہریش چندر اگروال روایتی ادب کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'ہم ادیب اور فنکار اتنے بے بس اور لاچار کیوں ہو گئے ہیں کہ اپنی آنکھوں کے سامنے

۱۱۔ نشاط شاہد، اداریہ معیار، نئی دہلی سہ ماہی، پہلا شمارہ مارچ ۱۹۷۷ء، ص ۶

۱۲۔ نسیم اللغات (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت اول ۱۹۵۵ء) ص ص ۳۲۶، ۴۳۰

۱۳۔ ادبی سیمینار، مذاکرے، ادبی تھیوریوں کی چپقلش اور وقت کی آواز، مشمولہ ماہنامہ، شاعر، ممبئی شمارہ جولائی ۲۰۰۱ء، ص ۱۰

زندگی اور انسانیت کے تقدس کو پامال ہوتے دیکھ کر بھی کچھ کرنے کی سکت ہم میں نہیں ہے اگر ہم اب بھی روایتی قسم کے تعیش پسند ادب کی تخلیق میں مشغول رہے تو حالات ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے پہلے ہی سماج میں غیر اہم ہو چکے ہیں اب ادیب کا وجود بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔'[۱۴]

نسیم امروہوی کی تخلیقی زندگی کا تعلق روایتی قسم کے تعیش پسند ادب سے کبھی نہیں رہا ان کی نثری اور شعری دونوں طرح کی خدمات زندگی اور سماج کے رشتوں سے ہم کنار نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے عہد کی بدلتی ہوئی ذہنی اور فکری روش سے بھی متاثر ہوئے جس کا اثر ان کی تخلیقات پر بھی پڑا یہاں تک کے دوسری ادبی کاوشوں کے ساتھ ساتھ ان کا مرثیہ بھی انہی تبدیلیوں کے زیر اثر آیا۔ مرثیہ جو بظاہر ایک روایتی صنفِ سخن نظر آتا ہے اسے انہوں نے اپنے عہد اور اپنے سماج کے احساسات کا آئینہ بنا دیا۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ[۱۵] نے سیاسی واقتصادی حالات، ادب وزیست کے بدلتے ہوئے تصورات اور تغیرِ اقدار کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والے نئے مرثیے کے ذیل میں جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، عزیز لکھنوی، جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے نام کو اہمیت دی ہے۔ نسیم امروہوی کے ہم عصر غزل گو شاعر محشر بدایونی نے نسیم کے تذکرے میں یہ بات لکھی ہے کہ:

'انہوں نے اصنافِ ادب کو کہنہ اور تصنع آمیز رسوم سے نکال کر انہیں ایک زندہ اور سچی تب وتاب سے ہم کنار کیا۔'[۱۶]

زیرِ مطالعہ باب میں جہاں ہم ادب وسماج کے تعلق کو ذہن میں رکھتے ہوئے نسیم کی ادبی خدمات کے تجزیے میں ان کے سماجی تصورات کو دیکھ رہے ہیں وہاں اس موقع پر یہ ضروری ہے کہ ان کے سماجی پس منظر کا بہت تفصیل سے نہ سہی لیکن ایک مختصر ذکر ضرور کیا جائے۔[۱۷]

۱۴۔ اکیسویں صدی کے چیلنج اور ادیب، الہ آباد نیا سفر شمارہ جنوری تا جون، ۲۰۰۰ء، ص ۶۲

۱۵۔ (لاہور: دانش گاہ پنجاب، جلد ۲۰ طبع اول ۱۹۸۴ء)، ص ۴۰۳

۱۶۔ لوگ رخصت ہوئے اور لوگ بھی کیسے کیسے مشمولہ، ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ ۱۹۹۲ء)، ص ۱۳۰

۱۷۔ ڈاکٹر گیان چند نے اپنے تحقیقی مقالے 'اردو کی ادبی تاریخیں' میں یہ بات لکھی ہے کہ:
'ترقی پسندی کے زیر اثر اردو کی تحقیقی کتابوں بالخصوص ڈاکٹریٹ کے مقالوں میں یہ رواج ہو گیا کہ تاریخی وسیاسی پس منظر کی طویل داستان درج کی جائے گو اس کا مذکورہ ادبی تخلیقات پر براہِ راست اثر پڑا ہو کہ نہ پڑا ہو (انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۰۰ء)، ص ۵۲۷

نسیم کا سماجی پس منظر

مقالے کے پہلے باب میں نسیم کے سوانحی حالات کا جہاں بیان ہے وہاں عہدِ نسیم کی سماجی صورتِ حال کے ایک دو پہلوؤں کا ذکر کیا گیا تھا اگر ہم نسیم کی ولادت سے پہلے کے پچاس برس کی زندگی کا وہ دور دیکھیں جو برصغیر سے تعلق رکھتا ہے تو اس میں ایک طرف تو وہ جمود نظر آئے گا جو تعلیم و تربیت اور مذہبی شعور کے فقدان کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگیوں پر حاوی تھا دوسری طرف وہ سماجی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیاں بھی تھیں جن کے ثمرات سرسید تحریک کے زیرِ اثر سامنے آرہے تھے۔

نسیم جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کے پورے پچاس برس بعد (۱۹۰۸ء میں) پیدا ہوئے تھے۔ اس پچاس برس کے سماجی اور تہذیبی اثرات ان کے ماحول میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

نسیم نے ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں آنکھ نہیں کھولی تھی وہ ضلع مراد آباد کے ایک بہت چھوٹے سے قصبے امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ تقسیم کے بعد بھی اگر چہ امروہے نے تعلیم و ترقی کے میدان میں قدم بڑھائے لیکن یہ قصبہ اب بھی اپنے پرانے پن کے ساتھ اپنی پہچان ہے۔ ہمارے عہد کے نامور مصور صادقین جن کا تعلق بھی امروہہ سے تھا تقسیم کے ۳۲/ برس بعد دوبارہ امروہہ گئے تو انہوں نے ایک مسدس میں جہاں اس قصبے کی کیاریوں کا ذکر کیا وہاں کھنڈرات کا بھی تذکرہ کیا:

جو نیک ہیں ایسی رنگ رلیاں دیکھیں
منڈی گیا اور سبزی کی ڈلیاں دیکھیں
کھلتی ہوئی کیاریوں میں کلیاں دیکھیں
صد شکر کہ امروہے کی گلیاں دیکھیں

جو اپنے تھے باہر سے وہ گھر بھی دیکھے
کچھ کاخ و قصور کے کھنڈر بھی دیکھے [۱۸]

نسیم نے اسی بستی میں اپنی زندگی کا ابتدائی زمانہ گزارا اس بستی کے ماحول یہاں کے رہن سہن اور طور طریقوں نے ان کے لڑکپن کی عمر پر بھی اپنے اثرات قائم کیے۔ یہ وہ دور ہے جب انگریزوں کے دورِ اقتدار نے پورے سماجی نظام کو متاثر کیا تھا۔ پروفیسر ممتاز حسین اس ذیل میں لکھتے ہیں:

'ہمارا معاشرہ اس حد تک ایک بند معاشرہ تھا کہ انگریزوں کے دور سے پہلے کوئی بھی

۱۸۔ مشمولہ، سہ ماہی میراث، کراچی شمارہ اپریل تا جون ۱۹۹۱ء، ص ۱۴۱

طوفانِ حوادث اس کی بنیاد کو متزلزل نہ کر پایا تھا سلطنتیں بدلتیں لیکن وہ کوئی سماجی انقلاب پیدا نہیں کر پائیں۔[۱۹]

اس بند معاشرے میں سرسید احمد خاں کی تحریک کے بعد تبدیلی کی لہریں آئیں لیکن برصغیر کے دور دراز کے قصبات، مضافاتی بستیوں اور نسبتاً کم ترقی یافتہ علاقوں میں ابھی سماج کے فرسودہ نظام ہی کا راج تھا پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے:

'معاشرے کی ابتدا روایت سے ہوتی ہے ہر معاشرے کو اپنے ماضی سے وراثت کا ذخیرہ ملتا ہے اس ذخیرے میں تجربات و مشاہدات، اقدار و تصورات، معتقدات و تعصّبات کا ایک جہان ہوتا ہے اور اس کا حصہ معاشرے کے ہر فرد کو حسبِ توفیق ملتا ہے اس لیے ایک معاشرے کے مختلف افراد میں بھی تہذیبی وراثت کا عکس مختلف شکلوں میں پایا جاتا ہے۔'[۲۰]

نسیم کی شخصیت پر تہذیبی وراثت کے جو عکس ہیں ان کی بنیادیں جیسا کہ پہلے لکھا گیا اس دور میں اٹھیں جس پر سرسید احمد خاں کی تعلیمی واصلاحی تحریک کے گہرے اثرات تھے۔

کم عمری اور لڑکپن میں نسیم نے جن درسگاہوں سے تعلیم حاصل کی وہ یکسر روایتی درسگاہیں نہیں تھیں فلسفہ و منطق اور عقلی صداقتیں اس تعلیم کی بنیاد تھیں۔ امروہہ کے بعد اپنی شاعری کے زمانۂ شباب میں نسیم نے ایک طویل وقت لکھنؤ میں گزارا۔ اس ثقافتی، تہذیبی اور ادبی شہر میں اپنے لہجے کی انفرادیت کو ظاہر کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ ڈاکٹر آغا سہیل بیسویں صدی کے دوسرے ربع حصے کا تذکرہ کرتے ہوئے نسیم کے حوالے سے ایک جائزے میں لکھتے ہیں:

'اس لکھنؤ میں سرسید کے پرستار بھی تھے اور اکبرالہ آبادی کے بھی، حالی کے متبع اور اقبال کے شیدائی بھی، مخالف بھی، تہذیب الاخلاق کے چاہنے والے بھی اور اودھ پنچ پر جان چھڑکنے والے بھی، انجمن معیار لکھنؤ کے بھی ایک طرف حلقہ بگوش موجود اور ترقی پسند مصنفین کے بانیان بھی، جہاں ہیئت، مواد، موضوعات، معاشرتی، تاریخی اور روایتی تقاضوں میں اس قدر چپقلش تنازعے ہوں وہاں اپنی پسند کی صنفِ ادب میں اپنا

۱۹۔ نقدِ حرف (کراچی: مکتبۂ اسلوب، اشاعت اول ۱۹۸۵ء)، ص ۱۰

۲۰۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۴۶

اسلوب بنانا بہت مشکل ہے، لیکن نسیم نے اپنا اسلوب بھی بنایا، اس پر چلے بھی۔"[۲۱]

پروفیسر مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ سیاسی و معاشرتی حالات ادیب کو گفتار دیتے ہیں یا سلب کر لیتے ہیں۔[۲۲]

نسیم کی تخلیقی صلاحیتیں سلب نہیں ہوئیں بلکہ انہوں نے اپنے سماج کے نشیب و فراز پر جو سوچا اور اس سے زندگی کی جو حرارت انہیں ملی وہی ان کا زندہ ادبی سرمایہ ہے۔ اس ادبی سرمائے میں ان کے سماجی تصورات کی بنیادیں ہم دیکھ سکتے ہیں۔

سماجی تصورات کی بنیادیں

نسیم امروہوی کی تصانیف کی تعداد ایک سوتیس سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کے لکھے ہوئے تبصرے، دیباچے، مقدمے اور دو سو سے زیادہ مرثیے بھی ہیں جن کے اشعار کی تعداد ۶۰ ہزار سے زیادہ ہے۔ مقالے بھی ہیں جو مختلف ادبی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئے ہیں ان تمام تحریروں میں سماج کے تعلق سے ان کے جو تصورات ہم اخذ کر سکتے ہیں ان میں سے بعض بنیادی تصورات ان عنوانات اور موضوعات کے تحت آتے ہیں:

۱۔ انسانی رشتے۔

۲۔ زندگی کی مثبت اور منفی قدروں کا شعور۔

۳۔ تعلیم و تربیت، اخلاق اور اقدارِ حیات۔

۴۔ زندگی اور معاشرتی ماحول کے ادب و آداب، شادی بیاہ اور رسم و رواج۔

۵۔ نصب العین، اہدافِ زندگی۔

۶۔ مرد، عورت، بڑے بوڑھے، اور احباب وغیرہ کے حوالے سے حقوقِ انسانی۔

۷۔ دین کی اہمیت اور انسانوں سے اس کا رشتہ۔

۸۔ موت، شہادت، جزا اور سزا کا تصور۔

۹۔ زبان، محاورے اور روزمرہ۔

۲۱۔ نسیم امروہوی اور پیروی انیس، ارمغان نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ ۱۹۹۲ء) ص ۶۴

۲۲۔ ہمارے ادب کے بعض مسائل، مشمولہ ماہنامہ نگار، مسائل ادب نمبر ۱۹۶۸ء، ص ۹۳

سر سید اور حالی کے سماجی تصورات اور نسیم

نسیم امروہوی کے سماجی تصورات ان کی تحریروں میں بہت نمایاں ہیں یہ ضروری نہیں کہ انہوں نے ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کی بحثوں میں براہِ راست حصہ لیا ہو۔ ان کی تحریریں یعنی ان کی شاعری اور نثر ان کے نقطہ نگاہ کا مکمل اظہار ہیں۔ ان کی تحریروں کے ابتدائی مطالعے ہی سے یہ اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ان کے ادبی سلسلے اور ادب و سماج کے متعلق ان کا ذہنی رشتہ سر سید اور حالی کی فکر سے جا کر ملتا ہے۔ انہوں نے سر سید کے خطبات کا ذکر کرتے ہوئے سر سیدِ اعظم [۲۳] کے نام سے انہیں یاد کیا ہے۔ سر سید کی شخصیت اور ان کی فکر کو نسیم جس طرح دیکھتے ہیں اور انہیں جو اہمیت دیتے ہیں اس کا اندازہ ہم اسی ایک بات سے لگا سکتے ہیں کہ وہ سر سید کو سر سید اعظم کہتے ہیں۔ سر سید نے علیگڑھ میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو کالج قائم کیا تھا نسیم اسے مسلمانوں کی قومی زندگی کا مرکز قرار دیتے ہیں۔ [۲۴]

نسیم کی ترتیب دی ہوئی نصابی کتابوں میں ان کے بعض مضامین کے عنوانات ہی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان پر سر سید کے رسالے 'تہذیب الاخلاق' کے براہِ راست اثرات ہیں۔ ان کی ایک کتاب میں انجمنِ امداد باہمی، چینیوں کا علم، رعایا پروری، بچوں کی ہمت، اخلاقی باتیں، اور رسم و رواج کے عنوانات پر مضامین ہیں۔ [۲۵] انہوں نے اپنی دو نصابی کتابوں میں سر سید کے مضامین، ہماری قوم، ترکوں کے اخلاق، کاہلی، مصر اور اس کی تہذیب اور تجارت کو انتخاب میں شامل کیا ہے۔ [۲۶]

سر سید کے سماجی تصورات سے نسیم کی اس ذہنی قربت کے باوجود ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ ان کے مقابلے میں مولانا حالی سے زیادہ متاثر ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حالی شاعر تھے جبکہ سر سید شاعر نہیں تھے اور نسیم کی بنیادی شناخت بھی کیونکہ شاعری ہی ہے اس لیے ان کے اصلاحی اور سماجی خیالات نے حالی کے اثرات کو زیادہ قبول کیا ہے۔

نسیم کا مزاج اپنی نوعمری ہی سے اصلاحی و اخلاقی رہا اور علمِ نفسیات یہی بتاتا ہے کہ ایسے ہی مزاج کے لوگ سماج میں خیر اور اخلاق کو ہر طرف دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی وہ نسبت ہے جس کی وجہ سے ہم انہیں ذہنی طور پر حالی سے قریب پاتے ہیں بقول آل احمد سرور:

۲۳۔ مقدمۂ خطبات مشران (لکھنؤ: یونائیٹڈ پریس ۱۹۴۲ء)، ص ۵

۲۴۔ اردو ادب، ساتواں حصہ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء)، ص ۲۶۰

۲۵۔ اردو ادب، پانچواں حصہ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء)، ص ۱۸ تا ۱۲۴

۲۶۔ اردو ادب، چھٹا حصہ اردو ادب، ساتواں حصہ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء)، ص ۴۵/۵۸/۶۳/۲۳۵

'حالی چونکہ ایک اصلاحی اور اخلاقی نقطۂ نظر رکھتے تھے اس لیے انہوں نے شاعر کے لیے سماجی خیر اور قومی اخلاق کی درستی ضروری سمجھی۔'[۲۷]

ہماری ادبی تاریخ میں حالی وہ پہلے ادیب و شاعر ہیں جنہوں نے شاعری اور سماج کے تعلق کو اہمیت دی۔ نسیم کی شخصیت میں بھی ہم یہی پہلو دیکھتے ہیں۔ اپنے ادبی دور کے آغاز میں انہوں نے 'گلِ خوشرنگ' کے عنوان سے جو پہلی نظم لکھی تھی اس پر حالی کے بہت نمایاں اثرات ہیں۔ اس نظم کا ذکر ہم اسی باب میں ذرا آگے کریں گے۔ جب وہ بھارگو اسکول بکڈ پو لکھنؤ کے لیے نصابی کتابیں دے رہے تھے اس دور کی تمام نظمیں حالی سے متاثر بھی ہیں اور سماج سے ایک تعلق کو بھی ظاہر کرتی ہیں پھولوں کا ہار، اسی سلسلے کی پہلی بنیادی کتاب ہے جس میں انہوں نے حالی کی تین نظمیں ملازمت کی برائیاں، جوانمردی کا ایک عجیب کام اور برکھارت شامل کیں۔[۲۸] خود نسیم کی ۲۱ نظمیں اس کتاب کا حصہ ہیں جن میں امید کے کرشمے، پریم سویرا، وطن کی جان، داتا اور کردگار، اٹھ وطن کے سورما، مزدوری کر، ہمارے ملک کا سرتاج، دیہات کی صبح، جنگل کا شہزادہ اور سب سے بڑی طاقت ان کے سماجی تصورات کی تصویریں ہیں اور حالی کے سماجی تصور سے بہت سی مماثلتیں رکھتی ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں جب قرارداد لاہور پیش کرنے کی تیاری ہو رہی تھی نسیم نے 'برق و باراں' کے عنوان سے ۲۷۹ بندوں پر مشتمل مسدس لکھا۔ اپنے مقالے کے تیسرے باب 'تحریک پاکستان میں نسیم امروہوی کی قلمی خدمات اور ان کا سماجی پس منظر' میں اس کا ہم تفصیلی تذکرہ کریں گے اس مسدس پر بھی حالی کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ سید وقار عظیم نے ایک مضمون میں حالی اور نسیم کی ان مماثلتوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی اور لکھا ہے کہ:

'بہت سی مماثلتیں ہیں جو حالی اور نسیم کے فکر، تخیل اور اسلوبِ اظہار میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔'[۲۹]

۱۹۳۶ء میں نسیم نے 'سازِ حریت' کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ جسے اثر لکھنوی نے نئی طرز کا مرثیہ قرار دیا۔[۳۰] اس میں اس وقت کے سماجی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حقوق العباد کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ حالی نے اپنے مسدس میں حضور اکرمؐ کی سیرت کے بیان میں غریب و مفلس کے ساتھ آپ

۲۷۔ فکرِ روشن (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۵ء)، ص ۸۲

۲۸۔ پھولوں کا ہار (لکھنؤ: بھارگو بکڈ پو، ۱۹۳۵ء)، ص ۴۳، ۸۷، ۹۶

۲۹۔ نسیم امروہوی کی نظم 'برق و باراں' مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۲۵

۳۰۔ سازِ حریت (لکھنؤ: نرولی ہاؤس خیالی گنج، ۱۹۴۲ء)، ص ۳

کے برتاؤ کو سماج میں رحم و محبت کی فضا اُبھارنے کا ذریعہ بتایا اور انیسویں صدی کے آخری دور میں رہنے والی مسلم قوم کو یہ بتایا کہ وہ جن پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں اور جن کے قول و عمل کو مشعلِ راہ قرار دیتے ہیں ان کی تعلیمات سماج کو کس طرح محبت، اتفاق اور ترقی کے رشتے میں پرو سکتی ہیں نسیم بھی اپنے طرزِ بیان میں اسی فکر کو اُبھارتے ہیں:

یتیم و بیوہ و محتاج و مفلس و نادار
سبھی کے واسطے دربارِ فیض تھا دُر بار
جو آئے اہل کدورت کبھی پئے تکرار
بچھا کے اپنی عبا دھو دیا دلوں کا غبار

ہر اک سے یوں متواضع سدا حضور رہے
انہیں بھی پاس بٹھایا جو حق سے دور رہے[۳۱]

آخری مصرع میں تو سماج میں غیر مسلموں اور اقلیتوں کے حقوق کی اہمیت کا احساس بھی انہوں نے دلایا ہے۔ لکھنؤ کے قدیم رسالے 'سرفراز'[۳۲] نے سازِ حریت پر اپنے تبصرہ میں لکھا:

'شاعر نے اس خراب حالت کو جس میں قوم آج مبتلا ہے بدل ڈالنے کے لیے ایسے انقلابی خیالات پیش کیے ہیں جو ملّت کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں جن لوگوں نے حالی کا مسدس 'مدوجزر اسلام' پڑھا ہے ان کو سازِ حریت میں حالی ہی کی روح جھلکتی نظر آئے گی اس لیے کہ حضرت نسیم نے بالکل اسی انداز میں جس میں حالی نے اب سے پہلے مسلمان عوام میں اپنے درس سے روح پھونک دی تھی سازِ حریت کے ذریعے مسلمانوں میں ایک نئے دور کے آغاز کی بنیادیں ڈالیں'

نسیم کی بیشتر نظموں میں وہی اصلاحی آہنگ ہمیں ایک جدید طرزِ احساس کے ساتھ نظر آتا ہے جسے حالی نے اپنی نئی طرز کی شاعری میں اُبھارا تھا۔ انقلابی طرز کے شعرا کے یہاں سیاسی عوامل عموماً زیادہ نمایاں ہوتے ہیں جبکہ اصلاحی مزاج رکھنے والے شاعر یا ادیب سماجی زندگی سے قریب تر ہوتے ہیں ان کی طبیعت اور شخصیت میں اپنے اطراف کی زندگی کو سنوارنے کی جو تڑپ ہوتی ہے وہ انہیں اپنے سماج کا ترجمان

۳۱۔ مراثیٔ نسیم، جلد دوم (کراچی: پاکستان رائٹرس گلڈ، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۹

۳۲۔ شمارہ جنوری، ۱۹۳۹ء، ص ۱۷

اور ایک دردمند رشتہ قائم رکھنے پر مجبور کرتی ہے پروفیسر مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ نسیم اصلاحی مزاج رکھنے والے شاعر ہیں انقلابی نہیں ۔[۳۳]

نسیم کی تحریریں ادب برائے زندگی کے نظریے کی ترجمان ہیں

نسیم کی زندگی کا تمام سفر (۱۹۰۸ء۔۱۹۸۷ء) بیسوی صدی سے متعلق ہے یہ دور اردو ادب کی تاریخ کا اہم ترین دور ہے ادب اور سماج کے رشتوں کی ساری بحثیں اسی دور میں ہوئیں ۔ امروہہ اگر چہ ہندوستان کے مرکزی شہروں سے بہت دور ایک قصبہ تھا جاگیرداری نظام کے اثرات اس قصبے پر بھی تھے اور یہاں کے افراد کی سماجی اور اقتصادی سوچ جس کا اظہار نسیم نے 'گل خوش رنگ' میں کیا، اس معاشرے کو اپنے تنگ دائرے میں لیے ہوئے تھی لیکن اس قصبے میں شعروادب کی ترقی شروع سے تھی مصحفی جیسا شاعر اسی سرزمین سے تعلق رکھتا تھا۔ نسیم ہندوستان کے مرکزی شہروں کے افراد کی سوچ اور وہاں ادب کی جدید تحریکوں سے بے خبر نہیں تھے۔ اور پھر نوعمری ہی میں وہ لکھنؤ آ گئے تھے۔ ایک طرف مذہبی علما کی صحبتوں میں بھی ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا اور دوسری طرف وہ ادب کی نئی روشنی کو بھی دیکھ رہے تھے۔ ہندوستان میں ابھی ترقی پسند تحریک شروع بھی نہیں ہوئی تھی جب ۱۹۳۵ء میں انہوں نے اس طرح کے مصرعوں سے اپنی تخلیق کا آغاز کیا۔

میں بزم شاعری میں ترقی پسند ہوں ۔[۳۴]

اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں :

'شاعری سے زندگی اور ماحول کی عکاسی ہوتی ہے چاہے کوئی کتنا ہی ادب برائے ادب کا قائل ہو مگر وہ بھی اپنے شعر میں وہی بات کہتا ہے جو اس کے مشاہدے میں آتی ہے یا اس کے ماحول پر گزرتی ہے۔'[۳۵]

نسیم صاحب کے وہ مضامین اور مقالے جن میں لسانی بحثیں کی گئی ہیں ان میں ادب و سماج کے باہمی تعلق کا اظہار کسی نہ کسی پہلو سے ضرور نظر آتا ہے۔ پنڈت سندر نرائن مشران کے خطبات پر ان کا طویل مقدمہ (۱۹۴۲ء) جس میں لسانیات کے حوالے سے کافی مواد موجود ہے اس میں وہ لکھتے ہیں :

'ہر ادب کی تخلیق کسی نہ کسی تمدنی، معاشرتی یا اور کسی نوع کے اعلیٰ ترین اور عظیم ترین عمرانی

۳۳۔ لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں، مشمولہ، ارمغان نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۳

۳۴۔ ارمغانِ نسیم، ایضاً، ص ۱۴۹

۳۵۔ سید آلِ رضا کی مرثیہ گوئی، مشمولہ ارمغانِ نسیم، ایضاً، ص ۲۴۲

اور انقلابی مقصد کی تحصیل و تکمیل کے ماتحت ہوا کرتی ہے۔'[۳۶]

'ادب عالمگیر انسانی تصور کی نمائندگی کرتا ہے وہ بین الاقوامیت کا ترجمان اور آزاد ضمیر و خیال کا نقیب ہے حقیقی ادب وہی ہے جو اس معیار پر پورا اترے۔'[۳۷]

اس طویل مقدمے میں وہ روسو کے نظریے سے بحث کرتے ہوئے ادب اور سماج کے تعلق کے ذیل میں کہتے ہیں:

'روسو نے ادب کو قوموں کی اجتماعی زندگی اور سوسائٹی کی ذہنی کیفیت اور تدریجی ترقی کا معیار و مظہر قرار دیا ہے وہ کہتا ہے کہ ادب سوسائٹی کی ترقیوں اور سماجی تبدیلیوں کا آلۂ حرکت پیما ہے۔'[۳۸]

ہندوستانی بول چال پر لسانیات کے حوالے سے لکھتے ہوئے انہوں نے ایک جگہ یہ بات کہی ہے کہ:

'ادب انسانوں کے معاشرے میں پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ انہی انسانوں کو زندگی کی حقیقی تصویر دکھا کر انہیں شائستہ بناتا ہے اور اگر ادب اپنا یہ فرض اولین ادا نہیں کر رہا تو پھر اس کی یہ تمام سرگرمیاں رائیگاں جائیں گی۔ شاعری زندگی کی تفسیر ہی تو ہے اور کیا ہے۔'[۳۹]

نسیم صاحب کی اس رائے کے ساتھ اگر ہم سجاد ظہیر کی یہ رائے بھی پڑھیں تو بات بہت واضح ہو جائے گی:

'زندگی سے شاعری کو الگ کر دینے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے ایک پودے کو زمین سے نکال کر زندہ اور ہرا بھرا رکھنے کی کوشش۔ جب تک زندگی، اس کی جدو جہد اور اس کے ارتقا سے شاعری کی وابستگی نہیں ہوگی اس وقت تک اس میں جان، اثر، تازگی اور تنوع پیدا نہیں ہو سکتا۔'[۴۰]

۳۶۔ مقدمہ خطباتِ مشران (لکھنو: یونائیٹڈ پریس، اشاعت اردو ۱۹۴۲ء) ص ۶

۳۷۔ ایضاً، ص ۶

۳۸۔ ایضاً، ص ۷

۳۹۔ کوہ نور ریڈر، دوسرا حصہ، (بنارس: نند کشور بھار گو، ۱۹۳۹ء) ص ۱۷

۴۰۔ شعرِ محض، مشمولہ ادب لطیف، جون ۱۹۴۷ء، ص ۲۱

نسیم امروہوی اور ترقی پسندی

نسیم امروہوی کے سماجی تصورات کو بہت بہتر طور پر جاننے کے لیے جہاں ادب اور زندگی کے متعلق ان کے نظریات ہماری مدد کرتے ہیں وہیں اس بات کو بھی جان لینا ضروری ہے کہ نسیم امروہوی کے نزدیک ترقی پسندی کیا ہے اور ان کے ترقی پسند نظریۂ حیات کے اصل خدوخال کیا ہیں۔ ان کا جاننا ان کے سماجی تصورات سے مکمل شناسائی کے لیے بہت ضروری ہے اس راستے پر چلتے ہوئے ہمیں ترقی پسندی کے متعلق ان بنیادی افکار کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا جو ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے بعد سے ایک عرصۂ دراز تک نقادوں کے درمیان موضوعِ بحث رہے بلکہ اب بھی ادبی تحریروں میں کہیں نہ کہیں یہ موضوع چھڑ جاتا ہے۔

ہماری ادبی تاریخ میں ادب وسماج کے تعلق پر جو اتنی بحثیں ہوئیں ہیں انہی میں ترقی پسند اہل قلم کے تعلق سے یہ بات بھی برابر کہی جاتی رہی ہے کہ وہ ادیب وشاعر یا نقاد جو ادب کا سماج سے رشتہ قائم کرتے ہیں یہ سوشلسٹ اور مارکسٹ نظریے کے افراد ہوتے ہیں اور جو سوشلسٹ اور مارکسٹ نظریے کا نقاد یا شاعر و ادیب نہیں ہوگا ہم اسے ترقی پسند بھی نہیں کہیں گے۔

ہماری زبان کے جن اہلِ قلم نے ادب کو سماج کا آئینہ قرار دیا اور جو ترقی پسند نظریے کے زبردست حامی تھے ان کے بارے میں حتمی طور پر یہ طے کر لینا کہ یہ صرف وہ لوگ ہوں گے جو سوشلسٹ اور مارکسٹ نظریے کے حامی اور مبلغ ہوں گے۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے اس وقت اور مشکل ہو جاتی ہے جب ہم نسیم امروہوی جیسی ادبی شخصیت کے ادب وسماج کے تصورات پر غور کر رہے ہوں کہ جہاں ایک طرف وہ لغت نگار، ماہر لسانیات، محقق، نصابی کتابوں کے مرتب ہیں تو دوسری طرف وہ مفسرِ قرآن اور اپنے عہد کے ایک نامور مرثیہ نگار بھی ہیں۔ یہاں اہم بات یہ ہے کہ ادبیات اور مذہبیات کے اس مشترکہ مزاج کی شخصیت کو ہم کس طرح ادب اور سماج کے تعلق کی ان بحثوں کے درمیان دیکھیں گے۔

کسی حد تک یہ بات درست بھی ہے کہ ترقی پسند نظریات کے حوالے سے جو شخصیات نامور ہوئیں جیسے سجاد ظہیر، سید سبط حسن، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور بعض دوسری شخصیات یہ لوگ یقیناً مارکسٹ نظریے کے علمبرداروں میں رہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ جو لکھنے والے ترقی پسند تحریک کے حامی نہیں تھے انہوں نے ان باتوں کو اور ہوا دی اور یہ طے کر لیا گیا کہ ادب اور زندگی کے تعلق پر جس کا اصرار ہوا اور جو ترقی پسند بھی ہو وہ یقیناً سوشلسٹ اور مارکسٹ نظریے کا حامی ہوگا لیکن جب ہم مارکسٹ نظریے کے انہی اہلِ قلم کی بعض آراء کو بہت غیر جانبدار ہو کر پڑھیں اور دیکھیں تو بحث کسی الجھاؤ کے بغیر ہمارے ذہن میں صاف

ہونے لگتی ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے اپنے ایک مضمون میں مولانا اختر علی تلہری کا یہ اعتراض نقل کرتے ہوئے کہ ترقی پسند ادب کا مقصد اشتراکیت اور اشتراکی ادب کی اشاعت کے سوا اور کچھ نہیں' یہ وضاحت کی ہے کہ:

'اگر ترقی پسند اشتراکی ہے اور اپنی ادبی کاوشوں میں اشتراکیت کی اشاعت کرتا ہے تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ترقی پسندی اور اشتراکیت مترادف ہے۔'[۴۱]

مشہور مارکسٹ ودانشور سید سبط حسن سوشلزم اور مارکسزم کے حوالے سے کہتے ہیں کہ:

'ترقی پسند ادب کے منشور میں اس کا کوئی ذکر نہیں یہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن ہے سوشلسٹ مصنفین کی انجمن نہیں۔'[۴۲]

احمد ندیم قاسمی اور احمد ہمدانی جو کہ ترقی پسند طرزِ فکر رکھتے ہیں اور اپنی تحریروں میں ان کا کمٹ منٹ ترقی پسندی ہی کے ساتھ ہے اس بارے میں بہت کھلا ہوا نظریہ رکھتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے نامور کمیونسٹ دانشور سجاد ظہیر کو ایک خط میں لکھا:

'میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں ہوسکتا صرف ترقی پسند ادیب رہنا چاہتا ہوں۔'[۴۳]

احمد ہمدانی کے ایک انٹرویو سے ان کے نقطۂ نگاہ کا یہ اقتباس بھی دیکھتے چلیے:

'میں نے بہت سوچ سمجھ کر ترقی پسندی کی راہ اختیار کی کارل مارکس نے کہا تھا کہ آدمی جس معاشرے میں رہتا ہے وہاں کی معاشرت اور مذہب کو اختیار کرے تو کوئی حرج نہیں۔ نماز پڑھنا یا مذہبی شعار اختیار کرنا مارکسیٹ کے خلاف نہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہے۔ میں نماز پڑھتا ہوں، مذہبی اقدار سے بھی محبت کرتا ہوں، ترقی پسندی اپنی جگہ ہے۔'[۴۴]

احمد ندیم قاسمی نے ایک اور جگہ اپنے انٹرویو سے یہ بات کہی:

'میں سمجھتا ہوں اگر کوئی ادیب انفرادی طور پر ادب تخلیق کر رہا ہے اور کسی انجمن یا تحریک

۴۱۔ روایت اور بغاوت (لکھنؤ: فروغ اردو، ۱۹۷۸ء)، ص ۳۰۳

۴۲۔ بحوالہ 'ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'، مرتبین، پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی (دہلی: ثمر آفسٹ پریس، ۱۹۸۷ء)، ص ۳۷

۴۳۔ ڈاکٹر احسن اختر ناز، مکالمات، (لاہور: الحمرا انٹر پرائزر، ایڈیشن اول، ۲۰۰۳)، ص ۳۸

۴۴۔ اختر سعیدی، احمد ہمدانی سے انٹرویو، کراچی، جنگ مڈ ویک میگزین، ۲۴ر دسمبر ۲۰۰۳ء، ص ۵

سے وابستہ نہیں ہے تو وہ کوئی گناہ نہیں کر رہا۔'[۴۵]

آل احمد سرور نے بہت تفصیل سے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے جس کا ایک اقتباس یہ ہے:

'اگر شاعری کی مخصوص بصیرت کو تسلیم کر لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ نہ کسی اور علم سے کم تر ہے نہ برتر مگر اس کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے اور رہے گی اور باطنی حقیقت تبدیل بھی ہوگی اور اس تبدیلی کے باوجود انسان کی روح کے بعض تاروں کو ہمیشہ چھیڑتی رہے گی، تو نہ شاعری کی سیاست کے کسی پیرائے میں دیکھا جائے گا نہ سماج کے کسی مخصوص آئینے میں، نہ فلسفے کے کسی نظام میں، نہ مذہب کے کسی مخصوص اوامر ونواہی کے سلسلے میں اور پھر یہ بھی ہوگا کہ بڑی شاعری کے لیے یہ شرطیں نہ لگائی جائیں گی کہ وہ مذہب سے کیوں غذا حاصل کرتی ہے، مارکس سے کیوں نہیں۔ یا مارکس کا نام کیوں لیتی ہے، مذہب کا کیوں نہیں لیتی۔ شاعر سے ہمارا مطالبہ صرف یہ ہوگا کہ وہ اپنی نظر سے وفادار ہو۔ اب اس کی نظر ہمیں سوئے افلاک لے جائے یا دھرتی کے کرب اور اس دور کے انتشار کی طرف، اسے اس کی پوری آزادی ہے۔'[۴۶]

یہ مباحث ہماری تنقیدی تاریخ میں اتنی کثرت سے ہوئے کہ خود ترقی پسند نقادوں کو اپنی تحریروں میں اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت بار بار کرنا پڑی اور یہ بتانا پڑا کہ ان کے نزدیک ترقی پسندی سے کیا مراد ہے۔ پروفیسر احتشام حسین آزادیٔ مساوات، جمہوریت، حقیقت پسندی اور عوام دوستی کو ترقی پسندی کے بنیادی عقائد قرار دیتے ہیں۔[۴۷]

حسن عابدی نے بہت صاف لفظوں میں یہ بات کہی:

'ترقی پسندی ایک طرزِ فکر سے عبارت ہے جس میں سماج کا مطالعہ، انسانیت سے محبت اور انسان کے درمیان اخوت اور مہر و محبت کے اوصاف شامل ہیں، ترقی پسندی اس فکر کا نام ہے جو عمل کے سانچے میں ڈھل کر انسانی معاشرے کو، جہل، ظلم اور بے انصافیوں

۴۵۔ حسن رضوی، گفت و شنید (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۵

۴۶۔ میرا ادبی نقطۂ نظر، مشمولہ ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، دکن، شمارہ فروری ۲۰۰۲ء، ص ۳

۴۷۔ روایت اور بغاوت (لکھنو: فروغ اردو، ۱۹۷۸ء)، ص ۳۰۴

سے نجات دلا سکے اور معاشرے کو زیادہ پُرمسرت اور زیادہ ثروت بنا سکے۔' [۴۸]

سید سبط حسن نے تو اس ایک جملے میں ساری بات سمیٹ دی:

'ہم ان تمام ادیبوں کو ترقی پسند کہتے ہیں جنھوں نے زندگی کو حسین بنانے کا ذکر کیا۔' [۴۹]

سبط حسن کی اس رائے کو معیار تسلیم کرتے ہوئے ہم نسیم امروہوی کو اس لیے ترقی پسند ذہن کی شخصیت کہیں گے کہ ان کی تمام ادبی خدمات جو لغت نویسی سے نظم نگاری تک اور بچوں کے ادب سے، اخبار کی ادارت اور نصابی کتب کی تدوین تک پھیلی ہوئی ہیں ان کا بنیادی مقصد زندگی کو بہتر بنانا اور سنوارنا ہی ہے جس کی مثالیں اسی باب میں ہم آگے پیش کریں گے نسیم ادب برائے ادب کے نظریے کے کبھی حامی نہیں رہے ان کے پیشِ نظر کبھی کوئی پارٹی لائن بھی نہیں رہی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کسی مقصدیت یا کمٹ منٹ سے ربط نہیں رکھتے تھے ان کا کمٹ منٹ ہمیشہ زندگی کے ساتھ رہا یہی ان کی ترقی پسندی ہے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسندی کے رجحانات، ۱۹۴۷ء کے بعد ترقی پسندی کا طرزِ فکر اور اب ہمارے دور میں ترقی پسند ذہن کی راہیں مختلف ہوگئی ہیں۔ سیاست میں اس نظریے کی وابستگی دوسری ہے جبکہ سماجی فلاح میں اس کا برتاؤ الگ ہے۔ نسیم امروہوی کے یہاں یہ تبدیلیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ وفاداریاں بدلنا نہیں ہے بلکہ اپنے عہد اور اپنے سماج کے مختلف تقاضوں کے تحت انسانی معاشرے کو جہالتوں اور ظلمتوں سے نکالنے کا ایک سفر ہے بقول پروفیسر ممتاز حسین:

'ہر دور میں ترقی پسندی کی صورت مختلف رہی ہے۔' [۵۰]

پہلی طویل نظم میں سماجی پہلو

۱۹۲۳ء میں نسیم نے 'گلِ خوشرنگ' کے عنوان سے اپنی زندگی کی پہلی طویل نظم یا پہلا طویل مسدس لکھا۔ اس کی وجوہات دو ہوسکتی ہیں کہ انہوں نے اپنی پہلی نظم مسدس کی شکل میں کیوں لکھی:

۱۔ ایک وجہ تو ان کے والد اور دادا کے شعری اثرات تھے جو اپنے زمانے کے نامور مرثیہ نگاروں میں شمار ہوتے تھے ان کے مرثیوں کی شکل مسدس ہی کی تھی اور یہ میر انیس اور مرزا دبیر سے بہت متاثر

۴۸۔ تعارف ترقی پسند ادب، دستاویزات (کراچی: خرم پریس پاکستان چوک، مطبوعہ ۱۹۸۶ء)، ص ۵

۴۹۔ ادب اور روشن خیالی، مرتب سید جعفر احمد (کراچی: مکتبۂ دانیال، اکتوبر ۱۹۹۰ء)، ص ۱۸۲

۵۰۔ پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال، مشمولہ 'پاکستانی معاشرہ اور ادب' (پاکستان اسٹڈی سینٹر: کراچی یونیورسٹی، اپریل ۱۹۸۷ء)، ص ۱۹

تھے جنہوں نے زندگی بھر مسدس ہی میں شعر کہے۔

۲۔ دوسرا اثر انہوں نے حالی اور اقبال سے قبول کیا تھا۔ حالی کی نظم مسدسِ حالی اور اقبال کی نظم شکوہ و جوابِ شکوہ سے تو انہوں نے اپنے بچپن ہی میں اثرات قبول کر لیے تھے۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ خود حالی و اقبال، مسدس کی صنف میں خود انیسؔ سے متاثر تھے بقول سلیم احمد:

'انیس کا مرثیہ اگر نہ ہوتا تو اقبال کو مسدس کے استعمال میں اتنی کامیابی نہ ہوتی۔' [۵۱]

حالی کا مسدس مسلمانوں کے عروج و زوال کی ایک داستان تھا اسی لیے اس مسدس کو 'مد و جزرِ اسلام' بھی کہا گیا پھر اقبال کی شاعری میں تو اُمت مسلمہ کے زوال کے متعلق اتنی باتیں اور اتنے پہلو تھے کہ ہر وہ لکھنے والا جس کا مزاج اصلاحی و قومی تھا وہ حالی کے ساتھ اقبال سے بھی متاثر تھا۔ نسیم بھی انہی اثرات میں آتے ہیں۔ نسیم کا بچپن جس قصبے (امروہہ) میں گزرا تھا یہ سادات کی بستی تھی۔ نسیم خود بھی اسی سادات گھرانے کے فرد تھے لیکن اپنے اصلاحی مزاج اور دل میں انسانیت کے درد کی وجہ سے وہ بہت کم عمری ہی سے ذات پات کی تقسیم اور سید اور غیر سید کی تفریق کے خلاف تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے سماجی معاملات میں مسائل جس وجہ سے بڑھ رہے ہیں ان میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ ایک کلمہ گو ہوتے ہوئے ہم نسلی و مذہبی گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ان کا نظریۂ حیات یہ رہا:

'عظمت و بزرگی کا سبب یہ نہیں ہے کہ فلاں سید ہے تو وہ بزرگ اور محترم ہے اور فلاں غیر سید ہے تو وہ اس کے مقابلے میں حقیر ہے۔ سید یا غیر سید ہونا باعثِ توقیر نہیں فضیلت تو اس نکتے میں پوشیدہ ہے کہ انسانیت اور خیرخواہی کی راہ میں آپ کے عمل کی مقدار کتنی ہے۔' [۵۲]

سماجی احساسات اور گلِ خوش رنگ

نسیم نے ۱۹۲۲ء کے آخر میں 'گلِ خوشرنگ' کے عنوان سے جس نظم کا آغاز کیا تھا انہوں نے اسے بعد میں مرثیے کا حصہ بنا لیا۔[۵۳] یہاں مختصراً اس مسدس کے ابتدائی حصے سے چند بند نقل کیے جا رہے ہیں۔ یہ ذہن میں رہے کہ نسیم اس وقت نوعمری کے دور سے گزر رہے ہیں:

۵۱۔ اقبال ایک شاعر (لاہور: کتاب گھر، ۱۳۹۸ھ) ص ۹۵

۵۲۔ چراغِ زندگی، دوسرا حصہ (پٹنہ: کدار ناتھ اشاعتی ادارہ، سن اشاعت جولائی ۱۹۵۴ء) ص ۹۵

۵۳۔ گلِ خوشرنگ، مشمولہ پندرہ روزہ مجلّہ (امروہہ: بزمِ حیات، ۱۹۶۷ء) ص ۹۵

ان غیوروں کو یہ سمجھائے کوئی غیرت دار
جو بھی فن اکلِ شرافت ہو نہیں مُوجبِ عار
جد ہمارے جو براہیم نہ ہوتے معمار
کون پھر خانۂ کعبہ کی اٹھاتا دیوار
ہیزمِ خشک کلیمِ صمدی چُنتے تھے
نوح بخّار تھے داؤد زرہ بُنتے تھے

میرے جتنے ہیں بزرگ آج کریں مجھ کو معاف
میرا کیا منہ ہے جو اک حرف کہوں ان کے خلاف
زندگی داغِ تصنع سے رہی ان کی صاف
وقت و ماحول کی دمساز، زروئے انصاف
مختلف ان سے ہمارا ہے فسانہ کچھ اور
اور تھا ان کا زمانہ، یہ زمانہ کچھ اور[۵۴]

ان بندوں میں نسیم نے اپنے معاشرتی ماحول کے حوالے سے جو باتیں کہی ہیں وہ بہت اہم ہیں اور بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں مسلمانوں کی اقتصادی مشکلات کا ایک بڑا سبب کہی جاسکتی ہیں۔ یہ باتیں اگر چہ پہلے پہل تو سرسید، حالی اور نذیر احمد کی تحریروں میں ملتی ہیں لیکن نسیم کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی دوسری تحریروں کے ساتھ مرثیے میں بھی اس کو بہت نمایاں کیا۔

مرثیے کے چہرے میں جو روایتی باتیں ہوتی تھیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ جن معاشی اُلجھنوں کا لوگ شکار رہیں اس کا ذکر کیونکہ مرثیے میں کہیں بھی نہیں ہوتا اس لیے اب اس صنفِ سخن سے لوگوں کی توجہ ہٹ رہی ہے۔ انہی سماجی اور معاشرتی اُلجھنوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنے ایک مکتوب[۵۵] میں لکھتے ہیں:

'یہ سب مرثیے میں نہیں ہوتیں اور یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو جو اس وقت خصوصاً ۱۹۱۸ء تک جاری رہنے والی جنگِ عظیم کے باعث معاشی پریشانیوں سے دوچار رہے اور زمینداروں

۵۴۔ گلِ خوشرنگ، مشمولہ پندرہ روزہ مجلّہ (امروہہ، بزمِ حیات، ۱۹۶۷ء)، ص ۷ تا ۹
۵۵۔ بنام ہلال نقوی، مرقومہ، ۷رفروری ۱۹۸۰ء، کوٹ ڈیجی خیر پور

کے دورِ عروج کی طرح اب دماغی تفریح کے خواہش مند نہیں انہیں مرثیے سے دلچسپی باقی نہیں رہی ضروری ہے کہ ان مسائل کو جن سے عوام دو چار ہیں اور جن کو اسلام میں بھی عبادت پر اولیت اور فوقیت دی گئی ہے مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں شمار کیا جائے۔'[۵۶]

نسیم امروہوی کے ایک ہم عمر دوست سید تصویر حسین جو پاکستان میں فوج کے شعبے سے منسلک رہے اور تحریکِ پاکستان کی معزز شخصیت راجہ صاحب محمود آباد کے قائم کردہ کالج، سراج الدولہ کراچی کے پہلے پرنسپل بھی رہے اس مرثیے کی نشستوں میں موجود تھے انہوں نے اس مرثیے کو سن کر جو نتائج نکالے اس کو 'نسیم امروہوی کے بنیادی نظریات'[۵۷] کے عنوان سے ایک مضمون میں تفصیل سے لکھا۔

اس بحث کے تین بنیادی نکات یہ ہیں:

۱۔ 'نسیم امروہوی کا پہلا مرثیہ جس کا ہم نے ذکر کیا ملک کی اس فضا کا پتہ دیتا ہے جس سے ان کے دور کے اکثر ترقی پسند تعلیم یافتہ نوجوان متاثر ہو رہے تھے۔ اس فضا میں ان کی ذہنیت اور کردار نے نشو و نما پائی اور ان کے نظریات کی داغ بیل پڑی۔' (ص، ۳۳)

۲۔ 'شائستہ لوگ محنت مزدوری اور دستکاری کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے اس طرح کے کام کرنے والوں کو شرفا حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جاگیردارانہ نظام نے یہ ذہنیت پیدا کر دی تھی مسلمانوں کا وہ طبقہ جو شرافت اور شائستگی کا مالک اور تمدن و اخلاق کی اعلیٰ قدروں کا خود ساختہ علمبردار بنا بیٹھا تھا عسرت و بدحالی کی زندگی بسر کرنے کو اپنے ہاتھ سے روزی کمانے سے بہتر خیال کرتا تھا اس ذہنیت کو نسیم صاحب نے بیان کیا۔' (ص، ۳۴)

۳۔ 'حاضرینِ مجلس اہلِ امروہہ تھے اور اہلِ وطن کے الفاظ سے بظاہر ان کو ہی مخاطب کیا گیا ہے لیکن معاشرے کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ کسی ایک شہر یا قصبے کی نہیں بلکہ پورے ہندی معاشرے کی صحیح تصویر ہے۔'

تھا جو سرمایۂ اسلاف وہ سب کام آیا
آفتاب، آج ریاست کا لبِ بام آیا

'یہ بیت کل مسلمانانِ ہند کی اس اقتصادی اور سماجی کیفیت کو جو بیسویں صدی کے اوائل

۵۶۔ اقتباس از 'بیسویں صدی اور جدید مرثیہ' (لندن/کراچی: محمدی ٹرسٹ طبع اول، فروری ۱۹۹۴ء)، ص ۲۰۵

۵۷۔ مشمولہ، عرفان نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، مطبوعہ ۱۹۷۴ء)، ص ۳۳

میں تھی تاریخی پس منظر کے ساتھ بہت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں ظاہر کر رہی ہے۔'

(ص۳۴)

اس مرثیے کے چہرے میں نسیم کا وہ سیاسی وسماجی شعور بہت صاف دیکھا جا سکتا ہے جو اپنے عہد کی تاریخ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

اگر چہ یہ درست ہے کہ نسیم کے 'گلِ خوشرنگ' پر مسدسِ حالی کے اثرات نمایاں ہیں لیکن نسیم جہاں حالی کے طرزِ فکر سے آگے نکل جاتے ہیں وہ ہیں ان کے خیالات میں حوصلہ مندی کے جذبات سید نواز حسن زیدی نے اپنے تحقیقی مقالے میں نسیم کے شعری افکار کو مولانا حالی اور علامہ اقبال کی توسیع قرار دیا ہے۔'[۵۸]

زیرِ شمشیر تڑپتی ہوئی دنیا کو سلام

یہ خیال، یہ احساس اور یہ طرزِ فکر نئی دنیا کا خیر مقدم اور حوصلہ مندی کی ایک علامت ہے۔

ایک پہلو یہ بھی ہمارے پیشِ نظر ہے کہ سماج میں خیر، ترقی، فلاح اور ارتقا کے لیے سوچنے والے شاعر وادیب کے سماجی تصورات میں اگر مایوسیاں اور اُداسیاں حاوی رہیں گی تو اس طرح تو اس کی کوششوں پر پانی پھر جائے گا اس کے پیغام کو پڑھنے والوں یا سننے والوں پر شکستہ دلی چھاتی رہے گی۔ نسیم کے ایک شاگرد نے جب ان سے مسدسِ حالی کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب میں اس مسدس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بات بھی کہی کہ:

'حالی کے اس مسدس کا جو مجموعی تاثر قائم ہوتا ہے وہ اداسی کے جذبات ہیں۔'[۵۹]

انتظار حسین نے سرسید کے حوالے سے تقریباً یہی بات کہی ہے:

'حالی نے جب مسدس لکھی تو سرسید بہت پریشان ہوئے اور کہا کہ اس سے تو مایوسی جھلک رہی ہے۔'[۶۰]

نسیم چاہتے تھے کہ جب وہ اپنے وطن کے لوگوں کی سماجی اصلاح کے لیے قدم بڑھا رہے ہیں تو پھر 'گلِ خوشرنگ' سے کہیں یہ اثر قائم نہ ہونے پائے کہ ان میں مایوسی پھیل جائے اور بجائے بہتری کے انتشار پیدا ہو جائے۔ نسیم نے اپنی ادبی تحریروں پر مایوسی اور بے ثباتیٔ دنیا کے جذبات کبھی غالب نہیں آنے دیئے۔ انہوں نے اگر چہ لکھنؤ میں ایک طویل وقت گزارا لیکن یہاں بھی انہوں نے جو غزلیں لکھیں وہ روایتی

۵۸۔ نجم آفندی، فکر وفن (لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص ۲۹۰

۵۹۔ اطہر پھپھرسری، نسیم امروہوی سے تین سوال مشمولہ فلاحی مجلّہ (کراچی: اشاعتی ادارہ، ۱۹۶۳ء)، ص ۱۳

۶۰۔ ادب اور نا سودگی مذاکرہ مشمولہ، ادبی مذاکرے، مرتبہ شیما مجید (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۹ء)، ص ۱۹۸

طرز کی نہیں ہیں بلکہ اس میں بھی زندگی کی نوید ہے:

انقلاب اے مقصدِ تخلیقِ ہستی، انقلاب
یہ جہانِ آب و گل اب تک مرے قابل نہیں

اردو کے نامور افسانہ نگار پریم چند جنہوں نے ہمیشہ سماج کے مفلس اور نادار لوگوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا انہوں نے یہ بات لکھی ہے کہ:

'جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی غالب ہو اور ایک ایک لفظ یاس اور شکوۂ روزگار اور معاشقہ میں ڈوبا ہوا ہو تو سمجھ لیجیے کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی ہے اور اس میں سعی و اجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی اور اس نے درجاتِ عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔'[۶۱]

پروفیسر ممتاز احمد نے 'نسیم کے شعری رجحانات' میں یہ بات لکھی ہے کہ:

'نسیم کے شعری رجحانات میں معاشرے کو حوصلہ مندی کی نوید سنانا بہت نمایاں احساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے یہاں نا امیدی کے بجائے امید، ذہنی جمود کے بجائے ذہنی ارتقا، بے دلی کے بجائے تدبیر و ترقی کے جذبات اور رجعت پسندی و انفعالیت کے بجائے رجائیت و خود اعتمادی کی لہریں جگہ جگہ نظر آتی ہیں وہ احساس پر غنودگی طاری ہونے نہیں دیتے بلکہ سماج کی بہتری اور اس کی خیر و عافیت کے لیے برابر ایک تڑپ ہے جو نفس نفس پر ہمیں پکارتی ہے۔'[۶۲]

نسیم نے 'گل خوش رنگ' میں ذات پات کی تقسیم، محنت و مشقت سے گریز، جہالت، اخلاقی قدروں کے زوال اور سماج کو زوال کی طرف لے جانے والے عوامل کو اپنے وطن کے لوگوں کے لیے اس طرح پیش کیا کہ ان میں زندگی سے فرار نہیں بلکہ جینے کی امنگ پیدا ہوئی۔

نسیم کی ادبی تحریروں کے سماجی مطالعے اور ان کے سماجی تصورات کی سب سے مضبوط کڑی یہی ہے کہ وہ سماج کے متعلق کسی بھی حوالے سے سوچیں، اپنے مقالوں میں اپنی نظموں یا مرثیوں میں کسی بھی عنوان سے بات کو آگے لے کر چلیں ہر جگہ وہ زندگی و ترقی کی بشارت دیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ گلِ خوش رنگ جو

۶۱۔ ادب کی غرض و غایت، مشمولہ 'ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر' ترتیب پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی (دہلی: ثمر آفسٹ پریس، ۱۹۸۷ء) ص ۱۶۵

۶۲۔ مشمولہ، باقیاتِ امروہہ (کراچی: تہذیب و ابلاغ، ۱۹۸۹ء) ص ۱۳

ان کی سب سے پہلی طویل نظم اور سب سے پہلا مرثیہ ہے وہ سماجی خیر اور سماجی اصلاح کے اعتبار سے ان کے نزدیک اتنا زیادہ اہم ہے کہ باوجود اس کے کہ اس پہلے مرثیے کے بعد انہوں نے ۲۰۰ سے زیادہ مرثیے لکھے لیکن ۱۹۲۳ء میں لکھنے جانے والے اس مرثیے کے متعلق ۱۹۸۲ء میں بھی ان کی یہی رائے تھی کہ وہ اسے سماجی فلاح اور سماجی خیر کے لیے سب سے اہم تخلیق سمجھتے ہیں بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

'سرسید نے کہا تھا کہ جب مجھ سے روزِ قیامت پوچھا جائے گا کہ تم کیا زادِراہ لائے تو میں کہہ دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھا کر لایا ہوں میں کہتا ہوں قیامت میں جب مجھ سے میرے زادِراہ کی بابت سوال ہوگا تو میں اپنا مرثیہ (گلِ خوشرنگ) پیش کروں گا۔'[۶۳]

وہ جس 'گلِ خوشرنگ' کو آخرت کا سامان قرار دے رہے ہیں آخر اس میں ایسی کیا خوبیاں ہیں؟ کہ وہ اپنی زندگی بھر کی ادبی خدمات یعنی ساٹھ سال سے زیادہ عرصے تک لغت کی تدوین کا کام، صحافت ونصابی کتب کی طویل مشقت دوسو سے زیادہ مرثیوں اور کم وبیش ۱۲۵ سے زیادہ کتابوں کی تصنیف وتالیف ان کے نزدیک ایک طرف، اور ایک طرف ان کی نوعمری کی یہ طویل نظم 'گلِ خوشرنگ' ہے تو آخر اس میں ایسے کیا موضوعات ہیں جسے وہ اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔ وہ موضوعات یہ ہیں:

۱۔ ماضی کے طنطنے اور ماضی کے شوکت وحشم کی باتیں تو بہت ہیں مگر مسلمانوں میں اور قوم میں اپنی موجودہ حالت سے بے خبری ہے۔

۲۔ بے عملی نے ہر طرف اپنے پاؤں گاڑ لیے ہیں۔

۳۔ کسبِ معیشت کی طرف سے سب غافل ہیں اگر کسی فن میں ماہر ہیں تو وہ بے ہنری کا فن ہے۔

۴۔ مذہب کی طرف سے ایسے اوہام میں گرفتار ہیں کہ تجارت یا کسی اور ہنر کو جیسے دستکاری، انہیں حرام سمجھا جاتا ہے۔

۵۔ ترقی کے وہ تمام راستے جو تجارت اور کاروبار سے کھل سکتے ہیں ان کی طرف اس لیے نہیں جانا چاہتے کہ اس گمان میں گرفتار ہیں کہ یہ کام سادات کے خلاف ہیں۔

۶۔ مسلمان سید، غیر سید، شیخ، پٹھان اور اسی قسم کی تفریق میں گرفتار ہو کر گروبندی کا شکار ہیں نسلی نفرتیں بلکہ اس سے پیدا ہونے والا تکبر ان میں اتنا زیادہ ہے کہ وہ فاقے تو کرلیں گے مگر کام نہیں کریں گے ان کی اس نادانی نے سماج میں فلاح وترقی کے راستے بند کر دیے ہیں۔

۶۳۔ عکسی مکتوب، مشمولہ، ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۴۵

۷۔ قدامت کے فلک بوس محل تھرتھرا رہے ہیں اور نئی دنیا اپنا وجود ظاہر کر رہی ہے مگر ہم قدامت ہی کے لبادے اوڑھے بیٹھے ہیں۔

۸۔ اپنے عہد کے تقاضوں سے بے خبر در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

۹۔ اب زمینداری باعثِ عزت نہیں وہی لوگ باعثِ عزت ہوں گے جو محنت کش ہوں گے۔

۱۰۔ سماج کا پورا ڈھانچہ ہماری نادانیوں کی وجہ سے گرتا چلا جا رہا ہے۔

نسیم امروہوی کے سماجی تصورات کا ابتدائی خاکہ انہی نکات سے بنتا ہے جن کی ہم نے نشاندہی کی ہے۔

معاشرتی ناہمواریوں کا ازالہ کس طرح ممکن ہے

نسیم کے نزدیک معاشرتی ناہمواریاں کسی ایک حکم نامے یا اعلان کے ساتھ ختم نہیں ہوسکتیں:

'دیکھیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اور نہ قوموں کی تاریخ میں آپ کو یہ ملے گا کہ کسی صبح کو ایک حکم نامہ جاری کر دیا گیا کہ بس کل سے ریاست کے تمام معاملات درست ہو جائیں گے۔' [۶۴]

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے نسیم کے متعلق لکھا ہے کہ ساری خرابیوں کا سبب نسیم کی نظر میں یہی ہے کہ ہم باطل سے ہم رشتہ ہو گئے ہیں۔[۶۵] اصل میں سماجی حوالے سے ان کی ادبی کوششوں کو اسی نکتے میں پوشیدہ دیکھا جا سکتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باطل سے کس طرح رشتہ توڑا جا سکتا ہے وہ لکھتے ہیں:

'ہم نسلی امتیازات، مذہبی گروہ بندیوں اور زبان و لہجے کے فرق سے انسانوں کو تقسیم کرتے ہیں یہ طبقے نہیں ہیں طبقے صرف دو ہیں۔ ظالم اور مظلوم۔' [۶۶]

نسیم ایک ایسے پاکستانی معاشرے کے فرد رہے جس میں معاشرتی ناہمواریاں ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ برسرِ اقتدار طبقے کی طرف سے عام آدمی پر زیادتیوں کا سلسلہ جاری رہا جہاں آئے دن کا یہ معمول ہو جائے کہ عام آدمی پیچھے دھکیلا جا رہا ہو وہاں مظلوم کی تائید کرنے والے اہلِ قلم اپنے ہونٹ سی کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ پاکستانی معاشرے کے تناظر میں اردو شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے

۶۴۔ شاہ ولایت پبلک اسکول میں ایک تقریر، مشمولہ خبر نامہ، انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۷۶ء، شمارہ ۲۱، ص ۱۲

۶۵۔ تعقل پسند مرثیہ گو، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۸۳

۶۶۔ آئینِ اردو، مطبوعہ ۱۹۵۲ء، ص ۳۷

یہ بات لکھی ہے کہ: پاکستانی شاعری چاہے وہ ترقی پسندوں کی ہو یا حلقہ ارباب ذوق والوں کی، روایتی شعرا کی ہو یا اسلام پسندوں کی یہ سب ہمیں خواب اور شکست خواب کی داستان رقم کرتے نظر آتے ہیں۔[۶۷]

نسیم کی شاعری میں بھی یہی چیز ہے یہ ضرور ہے کہ ان کا انداز نظر ایسے ہم عصروں سے ذرا مختلف ہے جس میں مستقبل کے خواب زیادہ ہیں۔

نسیم اپنی سنجیدہ اور باوقار شخصیت کی طرح باوقار اور سنجیدہ فکر کے حامل رہے ہیں۔ معاشرتی ارتقا کے لیے ان کے افکار و خیالات بھی ایک ٹھوس راستے کی طرف سفر کرتے ہیں اور فکری تربیت کو بنیاد قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک:

'قوموں کی فکری تربیت کے لیے ادب سب سے طاقتور ذریعہ ہے۔'[۶۸]

ادیب نہ تو پیغمبروں والا انداز رکھتا ہے نہ وہ بالکل عام آدمی کی طرح خاکے بناتا ہے وہ تو ادب کو بنیاد بنا کر ادب ہی کی زبان میں اپنے فرائض ادا کرتا ہے پروفیسر احتشام حسین نے یہ بات لکھی ہے:

'ادب میں رہنمائی اس طرح نہیں ہو سکتی جیسے پیغمبر اپنی امت کی، پیر اپنے مریدوں کی یا سپہ سالار اپنے سپاہیوں کی کرتے ہیں اس میں سیاسی رہنماؤں کی جذباتی اور شخصی اپیل کا سوال بھی نہیں ہے یہ رہنمائی معیار اور اقدار کی باہم جستجو کی شکل میں ہوگی اور یہ سمجھنے کی کوشش میں ہوگی کہ کیا چیز کس سے بہتر ہے حکم دینے، للکارنے اور انگلی تھام کر اپنے ساتھ چلانے سے نہیں ہوگی۔ راستوں کو ہموار کر کے، اندھیروں میں چراغ جلا کر اچھی اچھی باتیں کرتے ہوئے ساتھ چلنے کی کوشش ہی میں اچھا ادب پیدا ہوگا۔'[۶۹]

ادیب کا سب سے بڑا طریقہ رہنمائی ہی ہے جس کا ذکر پروفیسر احتشام حسین نے ان آخری دو سطروں میں کیا نسیم کی ادبی زندگی کا سفر انہی صفات سے عبارت ہے اور یہی ان کے سماجی تصورات کی روح ہے مثلاً ہم ان کی ادبی تحریروں میں یہ پہلو دیکھتے ہیں کہ:

۱۔ بدی اور جبر کے خلاف مزاحمت ان کے نزدیک ایک دینی فریضہ ہی نہیں ایک ادبی فریضہ بھی ہے یہ فریضہ ظلم و جبر، غیر عادلانہ نظام اور معاشرتی برائیوں کے مٹانے کے لیے اخلاقی قدروں کے ایسے

۶۷۔ پاکستانی معاشرے کے تناظر میں اردو شاعری کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ غیر مطبوعہ، ۱۹۹۲ء، مملوکہ لائبریری، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، ص ۷۱

۶۸۔ نظم اردو (لکھنؤ: مختار پرنٹنگ ورکس، سن اشاعت ندارد)، ص ۷

۶۹۔ اعتبارِ نظر (لکھنؤ: کتاب پبلیشرز چوک، بار اول ۱۹۶۵ء)، ص ۲۷۵

چراغ روشن کرتا ہے جس سے روح بیدار ہو۔

۲۔ اپنے مقالوں، مضامین، خطوط، صحافت وشاعری اور مرثیوں میں وہ ایسے خیالات نمایاں کرتے ہیں جن سے انسان دوستی کی راہیں ہموار ہوں۔

۳۔ ظاہر پرستی کو وہ قبول کرنے کو بالکل تیار نہیں۔ ظاہری چمک دمک کو انہوں نے اپنی زندگی میں بھی کبھی پسند نہیں کیا نہ اپنے اطراف کی زندگی کو وہ اس انداز میں پسند کرتے ہیں نہ اپنے پورے سماج کو نہ اپنے ملک کو وہ ظاہر میں مبتلا دیکھنا چاہتے تھے۔ مکانوں سے زیادہ مکینوں کی اہمیت کے قائل تھے یہ انہی کا مصرع ہے:

مکان اونچے سے اونچے خیال پست سے پست[۷۰]

۴۔ زندگی کی جدوجہد میں ان قدروں کو اہمیت دی جائے جن سے انسانیت کا سر اونچا ہو وہ کسی مخصوص تبلیغی رجحان کو اپنا نظریہ نہیں بنالیتے وہ جس گھر میں پیدا ہوئے جس عقیدے کی فضا میں انہوں نے آنکھیں کھولیں وہ یقیناً ان کا ماحول رہا لیکن اس سے کسی انسانی تفریق کو انہوں نے قریب نہیں آنے دیا:

کہاں باقی رہے گی ارتقا میں پھر یہ جولانی
کہ زنجیرِ تعصب ہے یہی تفریقِ انسانی[۷۱]

۵۔ آزادی، جمہوریت اور امن ان کے یہاں نعرے نہیں ہیں وہ اسے انسانیت کی روح قرار دیتے ہوئے معاشرے میں اس کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں۔

۶۔ مرثیے میں خاندانِ رسالت کے کرداروں پر لکھتے ہوئے ان کی زندگی کے ایسے اعمال اور ایسے انداز جس سے معاشرے کی ترقی اور قوم کی فلاح ہو سکے ان کو نسیم بہت نمایاں کرتے ہیں۔ نواسۂ رسولؐ کے ایک صاحبزادے کی دعاؤں کے بیان میں لکھتے ہیں:

حیاتِ قوم کے ضامن جو تھے امورِ عظیم
دعا میں ان کی بھی ڈنکے کی چوٹ دی تعلیم
کفیلِ قوت و طاقت جوزر کی ہے تقسیم

۷۰۔ اردو نامہ، شمارہ ۴۱، ۱۹۷۲ء، ص ۱۳

۷۱۔ نسیم امروہوی، ارتقا (نظم) مشمولہ اردو ادب، ساتواں حصہ (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۵۲ء)، ص ۱۷

یہ چاہتی ہے معاشی و عسکری تنظیم

دعا میں کہہ گئے جو راہِ حق کا راہی ہو

فضول خرچ نہ ہو، شیر دل سپاہی ہو[۷۲]

۷۔ نسیم کی تحریروں میں اس کا پورا شعور جھلکتا ہے کہ سماجی ڈھانچے کو کہاں کہاں سے زخم لگے ہیں اور ان زخموں کے لیے کس مرہم کی ضرورت ہے۔ مرہم کی ضرورت ان کے اس احساس کا اظہار ہے جس میں حقائق کی تلاش کا سفر برابر جاری ہے:۔

مرہمِ زخم سفر ہے خود حقائق کی تلاش

نسیم اپنی نظموں، کہانیوں، مقالوں میں فرد کی تربیت پر بہت زور دیتے ہیں اسی سے وہ اجتماعی تربیت تک پہنچتے ہیں اور پھر ان کا اگلا قدم قومی سیرت کی تشکیل ہوتا ہے:

'فرد کی ایک ذمہ دارانہ تربیت، پھر اجتماعی ذہنی تربیت یہی راستے قومی سیرت کے لیے صراطِ مستقیم ہیں۔'[۷۳]

نسیم کے نظریات، سماجی تصورات اور ان کے سیاسی افکار کو ہم کسی قومی لیڈر کے طرز میں نہیں سمجھیں گے ادیب و شاعر کے سوچنے کا ڈھنگ ادب کے تقاضوں میں دیکھنا ہوگا۔ ادب کی دنیا دوسری ہے، سیاست کی دنیا دوسری پروفیسر احتشام حسین نے اس نکتے کو بہت بہتر طور پر سمجھایا ہے:

'فلسفۂ سیاسیات میں قوم اور قومیت کا مفہوم بہت ہی بحث طلب سوال بن گیا ہے لیکن شعر و ادب میں اس کی حیثیت اتنی الجھی ہوئی نہیں ہے کیونکہ شاعر کے شعور میں قومیت کا احساس ایک جذبے، ایک منصفانہ حق اور ایک انسانی قدر کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے اس میں یہ عملی پہلو نہیں ہوتے کہ قومیت کن کن چیزوں سے مل کر بنتی ہے۔'[۷۴]

۸۔ نسیم جب قومی سیرت کی تشکیل سے فرد کی ذہنی تربیت پر اصرار کرتے ہیں تو اس کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے بات کرتے ہیں اور ہمیں سمجھاتے ہیں کہ فرد کی تربیت کس طرح ہو سکے گی۔ فرد کی آزادی کا مفہوم ان کے نزدیک یورپ کا طرزِ فکر نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا

۷۲۔ مراثیِ نسیم، جلد دوم (کراچی: پاکستان رائٹرز گلڈ، ۱۹۷۶ء)، ص ۲۳

۷۳۔ نثر اردو (لاہور: انوار بک ڈپو، بندر روڈ، جون ۱۹۴۸ء)، ص ۲۱

۷۴۔ اعتبارِ نظر (لکھنؤ: کتاب پبلیشرز چوک، بار اول، ۱۹۶۵ء)، ص ۷۹

ہے:

'یورپ فرد کی آزادی کو بہت اہمیت دیتا ہے مگر یہ دیکھو کہ انہوں نے فرد کی آزادی کو اعتدال و توازن کے راستے سے ہٹا کر ایک ایسی ڈگر پر لگا دیا کہ ان کی نسلیں بے لگام ہو گئی ہیں۔' ۷۵

۹۔ نسیم کا نظریاتی جھکاؤ اس بات کی طرف ہے کہ سماج کے مظلوم طبقوں کی حمایت کی جائے ایسی تعلیمات اور ایسے اقدار کو ابھارا جائے جس سے کمزور معاشرے کے افراد معاشرے کی کمزوریوں کو دور کرنے میں مدد دیں۔ وہ اقتصادی بنیادیوں پر معاشرے کی بنیادیں کھڑی کرتے ہیں۔ اور اقتصادی پسماندگی کو معاشرے کے کمزور ہو جانے کا اصل سبب قرار دیتے ہیں اسی باب میں ہم نے لکھا ہے کہ اپنی پہلی نظم 'گلِ خوشرنگ' میں فیوڈل نظام میں جکڑے ہوئے ان افراد پر وہ سخت تنقید کرتے ہیں جو اپنی اعلیٰ نسبی کی وجہ سے محنت و مزدوری سے بھاگتے ہیں اور اپنی کھوکھلی شان وشوکت کے لیے اس کام میں ایک ہتک محسوس کرتے ہیں۔

انسانی رشتوں کا محور اور اس کا سماج سے رشتہ

نسیم جب سماج کے مظلوم طبقوں کا ذکر کرتے ہیں تو وہ عورت کو بھی ایک مظلوم فرد شمار کرتے ہیں۔ نسوانی بہبود، شادی، بیواؤں کے ساتھ بدسلوکی عورتوں کی تعلیم اور انسانی رشتوں کی اہمیت و حیثیت کو وہ اپنے مضامین اور مرثیوں میں خصوصی طور پر زیرِ بحث لاتے ہیں۔ ان کے ایک فرزند وسیم حیدر جو سعوی عرب میں ایک عرصۂ دراز سے مقیم ہیں انہوں نے مجھے بتایا کہ ہمارے والد کہا کرتے تھے کہ:

'خاندان کی بہتری اور بہبود کے لیے ماں باپ کو توہم پرستی اور فضول رسم و رواج سے نکلنا چاہیے۔ عورتوں کی تعلیم بہت ضروری ہے لیکن تعلیم کے معنی بھی سمجھنا چاہیں انہیں قدیم طرز کی مذہبی تعلیم تک محدود کر دینا نسلوں کی تباہی کا سبب بنے گا مگر یہ بھی یاد رکھو کہ بی۔اے، ایم۔اے اور بی۔ایڈ، ایم ڈی کی ڈگریاں دلا دینے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ سرسید کے لفظوں میں انہیں سویلائزڈ ہونا بہت ضروری ہے۔' ۷۶

۷۵۔ شاہ ولایت پبلک اسکول میں ایک تقریر مشمولہ خبر نامہ، انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۷۶ء، ص ۱۱

۷۶۔ ملاقات بمقام پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی یونیورسٹی، ۲۷/مئی ۲۰۰۴ء

نسیم امروہوی کی صاحب زادی سیدہ قائمہ خاتون نے مجھے بتایا کہ ان کے والد کہا کرتے تھے کہ مرد نہیں بلکہ عورت انسانی رشتوں کے درمیان ایک محور ہے۔ [۷۷] صاحبانِ علم اور شریف النفس لوگ عورت کو گھر کی باندی یا پست درجہ دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے نسیم بھی انہی شخصیات میں تھے بلکہ بعض اعتبار سے ان کا کردار مثالی حیثیت اختیار کر جاتا ہے مثلاً گھر میں ان کی اہلیہ اپنی زندگی کے آخری ۳۵ برسوں میں ذہنی طور پر معذور و معطل رہیں مگر انہوں نے بڑے تحمل کے ساتھ ان کا خیال رکھا شان الحق حقی جو ترقی اردو بورڈ میں نسیم صاحب کے ساتھ ایک طویل عرصے تک رہے انہوں نے نسیم صاحب کی وفات پر یہ بات کہی تھی کہ:

'وہ بڑے گھمبیر اور بردبار انسان تھے اپنی نجی پریشانیوں کا ذکر نہیں کرتے تھے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی خانگی زندگی بڑی ناخوشگوار تھی جسے انہوں نے بڑے صبر و سکون سے جھیلا۔' [۷۸]

سیدہ قائمہ خاتون کا بیان یہ بھی ہے کہ ہمارے والد نے حقوق کے ضمن میں لڑکی اور لڑکے میں فرق کبھی قائم نہیں کیا جس طرح وہ اپنے بیٹوں کا خیال رکھتے تھے ایسا ہی انہوں نے میرا خیال کیا۔ [۷۹]

نسیم صاحب کے شعری سرمائے میں سہرے، رخصتی کے گیت اور بچوں کی ولادت پر تاریخی قطعات بھی ایک کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ خصوصاً جو گیت یا نظمیں لڑکیوں کی شادی اور رخصتی کے موقع پر کہی گئیں ان سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ معاشرے میں عورت کے متعلق کیا احساسات رکھتے ہیں 'نصیحت کا کرن پھول' ان کی ایک طویل نظم ہے جو انہوں نے ایک غریب لڑکی 'طیبہ' کی رخصتی پر کہی یہ نظم لاہور سے شائع ہوئی۔ [۸۰] اس کے چند اشعار یہ ہیں:

اے عروسِ پاک سیرت اے نگاہِ پاک دل
تیرا ورثہ ہے رہِ ہستی میں عزمِ مستقل

کیا ہوا رفتارِ دنیا ہے اگر بہکی ہوئی
تیری فطرت ہے شمیمِ خلق سے مہکی ہوئی

۷۷۔ ملاقات، ۲۴ راپریل ۲۰۰۳ء، کراچی
۷۸۔ تعزیت نامۂ نسیم (کراچی: مطبوعہ ۱۹۸۷ء)، ص ۱۶
۷۹۔ ملاقات، ۲۴ راپریل ۲۰۰۳ء، کراچی
۸۰۔ نصیحت کا کرن پھول (لاہور: آفتاب عالم پریس، ۱۹۵۹ء)، ص ۵

تیرے ماتھے پر نہ ہو سونے کا گر جھومر نہیں
تابشِ اخلاص سے پُر نور ہے تیری جبیں

ضوفشاں اطوار، افشاں کے ستارے ہیں تجھے
کانِ حکمت کے گہر ہی گوشوارے ہیں تجھے

طیبہ زیور سے انساں کا نہیں ہرگز وقار
جوہرِ اخلاق و سیرت ہے متاعِ افتخار

اس نظم میں ایک غریب باپ کی بیٹی کو یہ اعتماد دیا گیا ہے کہ عورت کا زیور وہ نہیں جو کثیر دولت خرچ کر کے بازاروں سے خریدا جاتا ہے زیور تو وہ ہے جو اخلاق و سیرت کی بلندی سے چمکتا ہے نسیم کے صاحب زادے قسیم ابن نسیم نے ایک ملاقات میں بتایا کہ:

'خاندان میں جب کبھی کسی لڑکی کے رشتے کی بات اٹھتی اور ان سے ایک بزرگ کے طور پر مشورہ لیا جاتا تو سب سے پہلی بات وہ یہ کہا کرتے تھے کہ لڑکے کے پاس بڑا گھر اور مال و دولت نہ دیکھیے، یہ دیکھیے کہ اس کے اور لڑکی کے درمیان ہم آہنگی ہو سکے گی یا نہیں۔ کیونکہ گھر کی بنیاد جب رکھی جائے گی تو پہلی اینٹ یہی ہوگی۔'[۸۱]

لڑکی کی شادی کا یہ سماجی تعلق دراصل ان کے اسی اصلاحی مزاج کا ایک پہلو ہے جس کا سلسلہ مولانا الطاف حسین حالی کے اصلاحی خیالات سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر فاطمہ شجاعت نے لکھا ہے کہ:

'اگر چہ مولانا حالی نے شادی بیاہ سے متعلق ایک ہی نظم لکھی ہے لیکن اس مختصر سی نظم میں ہندوستانی سماج کی جو ذہنیت پیش کی ہے اس کا پرتو اب بھی نظر آتا ہے۔ 'بیٹیوں کی نسبت' نامی نظم میں مولانا نے یہ بیان کیا ہے کہ لوگ اپنی لڑکی ایسے گھرانے میں بیاہنا چاہتے ہیں جو دولت وثروت اور حسب ونسب کے لحاظ سے افضل و برتر ہو مگر جو چیز شادی بیاہ کے بارے میں سب سے زیادہ ضروری اور اہم ہوتی ہے اسی پر ہندوستانی سماج میں سب سے کم توجہ کی جاتی ہے یعنی شادی میں فریقوں کے مزاج کی ہم رنگی، باہمی پسند، طبیعتوں

۸۱۔ ملاقات، ۲۷؍جون ۲۰۰۳ء، کراچی

کی یکسانیت وغیرہ۔ یہ خصوصیتیں نظر انداز کرنے کی وجہ سے ظاہر ہے میاں بیوی میں شکر رنجی پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ شادی بیاہ جیسے موضوع پر ہندوستانیوں کے خیالات اور بھی زیادہ قدامت پرستانہ ہوتے ہیں۔'[۸۲]

رثائی سماج

نسیم امروہوی جیسا کہ گذشتہ صفحات میں لکھا گیا عصرِ حاضر میں اردو مرثیے کے بڑے اور اہم شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں بعض اہل قلم نے انہیں 'انیسِ دوراں' کے خطاب سے بھی یاد کیا ہے۔ مقالے کے ساتویں باب میں ہم ان کی مرثیہ نگاری کا تفصیلی سماجی مطالعہ کریں گے۔ یہاں ان کے سماجی تصورات کے بنیادی مطالعے کے دوران اس حوالے سے بعض پہلوؤں کو سامنے لانا چاہیں گے۔

مرثیے میں انسانی زندگی اور انسانی رشتوں کی ایک جیتی جاگتی دنیا کچھ اس طرح چلتی پھرتی نظر آتی ہے کہ یہ سماج ہر دور کے سماج سے کئی حوالوں سے قریب ہو جاتا ہے۔ زندگی کی مشکلات و مصائب کو سہہ لینا، اپنے نصب العین کے تحفظ کے لیے ہر جبر کو برداشت کرنے کا عزم ہر صورت میں سچ کی حفاظت اور اس کی خاطر اپنے اہلِ خانہ اور رشتے داروں تک کو قربان کر دینے کا حوصلہ، ہر انسانی سماج کی ایک ضرورت ہے اور ہر دور کا سماج اس کے لیے مثالیں بھی تلاش کرتا ہے۔ صنفِ مرثیہ کی بنیاد کیوں کہ رثاء پر ہے شاید اسی سے استفادہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اپنی کتاب 'مرثیے کی سماجیات' میں پہلی بار 'رثائی سماج' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔[۸۳] دیکھا جائے تو مرثیے کے ایک اچھے شاعر کے یہاں انسانی رشتوں کے حوالے ہی سے ایک ایسے سماج کی تصویر بار بار نمایاں ہوتی رہتی ہے جس میں حق و صداقت کی تائید کرنے والوں میں مکر و فریب، ریاکاری، قتل و غارت گری اور جعلسازیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ سماج جب ان تمام برائیوں سے آلودہ ہو جائے گا تو ناانصافیاں بڑھ جائیں گی۔ ایک دوسرے کے حقوق پامال ہوں گے اور پھر وہ سب مسائل پیدا ہونے لگیں گے جن میں مادی مسائل کا بھی ایک حصہ ہوگا۔ نسیم کیوں کے ادب برائے زندگی کے نظریے کے قائل ہیں اس لیے وہ اپنی دوسری تمام تحریروں کے ساتھ ساتھ مرثیے کو بھی زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ سلیم احمد نے لکھا ہے کہ اردو شاعری کی روایت میں انیس پہلے شاعر ہیں جنھوں نے

۸۲۔ حالی اور سماجی انصاف، مشمولہ اردو سہ ماہی، کراچی، شمارہ جولائی ۱۹۶۸ء، ص ۷۷

۸۳۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل، مرثیے کی سماجیات (دہلی: خواجہ پریس جامع مسجد دہلی، ۱۹۹۳ء) ص ۱۸

سماجی انسان کو پیش کیا ہے۔[۸۴] ڈاکٹر آغا سہیل نے نسیم امروہوی کی ایک ادبی اہمیت یہ بھی بتائی ہے کہ انہوں نے انیس کی روایت اور ان کے فن کو پاکستان میں آگے بڑھانے کی نیک تدبیریں کی ہیں۔[۸۵] اس اعتبار سے نسیم بھی مرثیے میں اسی سماجی انسان کو آگے لے کر بڑھے ہیں۔ عہدِ جدید کے ایک نقاد وارث علوی جو ادب کی سماج سے وابستگی کے نظریے کے قائل نہیں ہیں، لکھتے ہیں:

> 'سماج کی تبدیلی کے ساتھ ماضی کا بیش تر 'سماجی ادب' بھی ہمارے لیے ازکار رفتہ ہو جاتا۔ ادب میں جو چیز ہماری دلچسپی کو برقرار رکھتی ہے وہ سماجی پس منظر نہیں ہوتا بلکہ وہ انسانی ڈراما ہوتا ہے جو اس پس منظر میں کھیلا جاتا ہے۔ یہی صفت ادب کو تاریخ سے مختلف اور ممیز بناتی ہے۔ سماجی مسائل والا ادب پچھلی دو صدیوں کا کارنامہ ہے۔ صنعتی تمدن کی آمد کے ساتھ ساتھ آدمی سماج کے بارے میں زیادہ باشعور اور حساس بنتا گیا۔ ایک نئی صورت پیدا ہوئی جس میں آدمی کے روزگار اور زندگی کا پورا دارومدار اس سماج پر تھا جو انسانی آبادی کی منزل سے گزر کر ایک منظم ادارے کی شکل اختیار کر گیا تھا، ہر فرد اس ادارے کا دباؤ محسوس کرتا تھا کہ سماجی قوانین اٹل نہیں ہیں۔ آدمی میں یہ طاقت ہے کہ وہ پورے سماج کو اپنے آدرشوں کے مطابق بدلے۔ آدمی نے سماجی ناانصافی کو آسانی سے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ظلم، بے رحمی اور ناانصافی کے خلاف روشن ضمیر فن کاروں نے احتجاج کیا اور اس طرح سماجی مسائل والا احتجاجی ادب وجود میں آیا ہے۔ اس ادب کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ وہ لوگوں کے ضمیر کو جگاتا ہے اور ان میں سماجی اصلاح کا جذبہ پیدا کرتا ہے لیکن اس کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ مسائل کے ختم ہوتے ہی وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔'[۸۶]

وارث علوی نے اپنی اس تحریر میں 'سماجی ادب' کو محدود معنوں میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک شاید وہی ادب سماجی ادب ہے جس کا تعلق مسائل ہی مسائل سے ہے اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ مسائل ختم ہوتے ہی یہ ادب بھی ختم ہو جائے گا۔ شاعری اور ادبی تخلیقات میں بلکہ خود نسیم کے مرثیے میں اس ظلم و جبر کے خلاف مسلسل آواز اٹھتی رہتی ہے کہ جس کے باقی رہنے ہی نے مسائل کو پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔

۸۴۔ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے، مشمولہ اردو سہ ماہی شمارہ ۳،اور ۴، ۱۹۷۳ء، ص ۲۲۱

۸۵۔ نسیم امروہوی اور پیروئ انیس، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۶۵

۸۶۔ منتخب مضامین (کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، اپریل ۲۰۰۲ء)، ص ص ۱۷۴، ۱۷۵

اس ظلم و جبر سے لڑنے کے لیے نسیم کے مرثیے کا انسان اپنے سارے رشتوں کے ساتھ سچائی کی حفاظت کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ نسیم کی گھریلو زندگی جیسا کہ ان کی سوانح میں لکھا گیا۔ کیوں کے بہت تکلیف دہ رہی ہے لیکن وہ تمام مشکلات کے باوجود سب رشتوں کو نبھا کر چلنے والے انسان تھے اسی جذبے کا عکس ان کے مرثیے میں ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ گھر سے یہی نسبت انہیں اپنے سماج اور اپنے ملک تک لے جاتی ہے۔

مجنوں گورکھپوری کی یہ رائے ہماری بات کو زیادہ واضح کر سکے گی۔ وہ لکھتے ہیں:

'ہم شخصی زندگی والے آدمی نہیں ہیں ہم اجتماعی اور تحریک کے آدمی ہیں جو آدمی اپنے بال بچوں، اعزا، دوست، احباب کی خیر نہیں منا سکتا وہ سارے ملک اور ساری دنیا کی خیر کیسے منا سکتا ہے۔'[۸۷]

جو لکھنے والا ادب برائے زندگی کے نظریے کی تائید نہیں کرتا اس کے متعلق پروفیسر احتشام حسین نے لکھا ہے کہ:

'اگر اس سے پوچھا جائے کہ ادب کیا ہے تو وہ شاید ہی کوئی ایسا جواب دے جس سے ادب زندگی کے مظاہرے سے الگ یا قائم بالذات شے معلوم ہو۔'[۸۸]

ادب اور زندگی اور ادب و سماج کے تعلق سے مرزا ادیب کی یہ رائے بھی اس بحث کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہے:

'میں ادب کو ایک قسم کا سماجی فریضہ سمجھتا ہوں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ یہ سماجی فریضہ ایک شخص کے نقطۂ نظر سے کن اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔ ادیب جو شدید طور پر حساس ہوتا ہے وہ عام انسانوں کی نسبت اس چیز کو زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ جس سماج میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس میں زندگی کو آگے بڑھانے والی قوتیں مجروح ہو گئی ہیں۔ چنانچہ جہاں اس کا ادب موجودہ سماج کا آئینہ ہوتا ہے وہاں وہ لوگوں کو مستقبل کی خوش گوار توقعات کی حیات افروز حرارت بھی دیتا ہے تاکہ ان کی روحیں گرم رہیں اور زندگی کی جد و جہد میں پامال نہ ہو جائیں۔'[۸۹]

نسیم جدید دور کے پہلے مرثیہ نگار ہیں جنہوں نے یہ تجزیہ کر لیا تھا کہ مرثیے میں کیونکہ

۸۷۔ قومی یکجہتی میں ادب کیا کردار ادا کر سکتا ہے (انٹرویو) ابوراشد، مشمولہ، روزنامہ جنگ کراچی، ۵/اپریل ۱۹۸۲ء، ص ۶

۸۸۔ عکس اور آئینے (لکھنؤ: فروغ اردو، ۱۹۷۷ء)، ص ۲۲۹

۸۹۔ شفیع عقیل، ادب اور ادبی مکالمے (کراچی: اکادمی بازیافت، جون ۲۰۰۲ء)، ص ۱۲۷

انسانی رشتوں کا ایک سلسلہ ہے اس لیے اب اسے ماحول اور سماج کے قریب لانا چاہیے اس میں عوامی جذبوں کی عکاسی کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کا کہنا ہے کہ:

'ہم اس وقت ایک عوامی شاعری کو وجود میں لانا چاہتے ہیں اس لیے ہم کو راہ کا سراغ فنِ مرثیہ نگاری ہی میں مل سکتا ہے۔'[۹۰]

عبدالرؤف عروج نے سماجی زندگی سے مرثیے کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

'بیسویں صدی کے اوائل میں لوگوں نے پہلی مرتبہ ادب کے ذریعے تہذیبی و سماجی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی تو اور اصناف کے ساتھ ان کی نگاہ مرثیے پر بھی گئی ان میں پہلا نام نسیم امروہوی کا لیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔'[۹۱]

مرثیے میں نسیم نے اخلاقی اقدار اور زمانے کے احوال کو سماج سے جوڑ دیا ہے۔ انتظار حسین اسے حالی کا اثر قرار دیتے ہیں۔ شاعری کی مشکلات اور اس کے اثرات کے محدود ہو جانے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

'کوئی ایسا لکھنے والا جو ادب میں مقام پیدا کرنے کا خواہاں ہو اور نیا ادیب کہلانا چاہتا ہو اس روایت (مذہبی شاعری) کو ہاتھ لگا کر اپنا ادبی کیریئر خراب کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا مگر آج کے لکھنے والے کو یہ خطرہ نہیں ہے روایتی مذہبی شاعری کے مقابلے میں ان تحریروں کی اہمیت ہے کہ ان میں مذہبی احساس کو زمانے کے احساس سے مربوط کر کے اپنے عہد کی صورت احوال کو سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ ویسی ہی کوشش ہے۔ جیسی مولانا حالی نے اپنے زمانے میں کی تھی۔'[۹۲]

نسیم جب زمانے کے احساس سے اپنے مذہبی احساس کو مربوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ایک طرح اپنے سماج میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں۔ وہ اس سے الگ تھلگ نہیں ہوتے۔ ان کے سماجی تصورات، اپنے سماج کی حقیقتوں سے آنکھ نہیں چراتے۔ جو ہے اور جو ہو رہا ہے اسے وہ نظر انداز نہیں کرتے وہ اپنے موضوع سے موجودہ صورتحال کو ربط دے کر حقیقت نگاری کے سفر کو طے کرتے ہیں۔ نسیم کے مرثیے کا سماجی مطالعہ کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ مرثیے کے سماجی مطالعے میں حقیقت نگاری

۹۰۔ مرثیہ نگاری کا فن، مشمولہ بیپ، انیس نمبر، فروری/ مارچ ۱۹۷۲ء، ص ۵۲

۹۱۔ لغت نویس، صحافی و شاعر نسیم امروہوی، مشمولہ روزنامہ حریت کراچی، ۷/ جنوری ۱۹۸۸ء، ص ۵

۹۲۔ ہمارے عہد کا ادب، مشمولہ معیار (سہ ماہی) پہلا شمارہ مارچ ۱۹۷۷ء، ص ۱۲۷

کا مفہوم یہ نہیں ہوگا کہ واقعے کی بس تصویر کشی کی جاتی رہے اور جو آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اسے ہو بہو نقل کر دیا جائے اس طرح ہم شاعر کے ادبی احساس کو بالکل نظر انداز کر دیں گے ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر، موّرخ یا ادبی رپوٹر نہیں ہے کہ ہر چیز کو جوں کا توں بیان کر دے سلیم احمد نے میر انیس پر لکھتے ہوئے بڑی پتے کی بات کہی ہے:

'زولا کا نعرہ تھا کہ وہ حقیقت کو جوں کا توں پیش کرتا ہے ہمارے یہاں حقیقت نگاری کی اس روایت کی جن لوگوں نے پیروی کی ان کے افسانے دیکھیے وہ ہر سچویشن سے الگ تھلگ کھڑے نظر آتے ہیں بچہ مر رہا ہے مر جائے انہیں تو اس کے تڑپنے کی صحیح تصویر کھینچنی ہے فسادات میں عورتوں کی چھاتیاں کاٹی جائیں تو کیا ہوا وہ ظالم و مظلوم کا ساتھ دینے نہیں آئے صرف حقیقت نگاری کرنے آئے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس خوبی کے باوجود کہ میر انیس حقیقت کو جوں کا توں دیکھتے مگر وہ خود ڈک کمپنی کا ساختہ مال نہیں ہیں وہ زولا قسم کے تماشائی نہیں ہیں جو الگ تھلگ کھڑا ہو۔ [۹۳]

ایک اچھے مرثیہ نگار کو انسانی رشتوں کے درمیان سفر کرنا ہوتا ہے اس لیے اس کی حقیقت نگاری میں صرف رپورٹنگ نہیں ہوتی اس کا وہ احساس بھی شامل ہوتا ہے جس سے سماج میں انسانیت کی قدریں بنتی ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس اعتبار سے نسیم کی مرثیہ نگاری بہت اہمیت کی حامل ہے کہ ایک واقعے سے انہوں نے موجودہ سماج کے لیے زندگی کی قدریں اخذ کی ہیں ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا ہے کہ:

'مرثیے کے بارے میں ادبی سماجیات کے نقطۂ نظر سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ایک ایسا ماضی ہے جس میں حال کی شرکت کسی نہ کسی نہج سے قائم ہے۔' [۹۴]

سماجی ترقی اور سماج میں رہنے والوں کی فلاح و بہبود کے لیے جن جن اصولوں سے کام لیا جا سکتا ہے نسیم ان سب کو پیش نظر ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا ذہن بنیادی اصولوں کی طرف پہلے جاتا ہے۔ وہ وقتی پیمانوں کے بجائے معاشرے کو ایسی توانائی دینا چاہتے ہیں جس سے ان کی بنیاد میں توانائی آئے اور اس کا ان کے پاس ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ قومی مسائل کی کم از کم نشاندہی ضرور کی جائے ڈاکٹر محمد علی صدیقی اسی بات کو اہمیت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

۹۳۔ میر انیس اور کیمرہ، مشمولہ سیپ، انیس نمبر، فروری/مارچ ۱۹۷۲ء، ص ۲۴۰

۹۴۔ اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۸ء) ص ۲۳۱

'نسیم امروہوی نے اپنے مرثیوں میں بعض اہم قومی مسائل کی نشاندہی کی ہے جدید مرثیہ اس لحاظ سے بھی قابلِ توجہ صنفِ سخن ہے کہ آج کے مرثیہ گو معاشرے کی زبوں حالی، افتراق، قومی پریس کی مجبوری ولاچاری، ترجیح یافتہ طبقوں کے ذریعے زیر دستوں کے استحصالی اور اتحاد و یگانگت کی راہ میں حائل رکاوٹوں (Obstacles) پر بڑی دردمندی کے ساتھ سوال اٹھاتے ہوئے ملتے ہیں۔'[۹۵]

خیر وشر کا تصادم اور اس تصادم کے نتیجے میں سماج کے سامنے جو مثالیں قائم ہوتی ہیں اس سے نسیم کے سماجی تصورات زیادہ اُجاگر ہوتے ہیں۔ان کے مرثیوں میں ایک طرف ایک سماج ہے جو خاندانِ رسالت کا ہے دوسری طرف وہ سماج بھی ساتھ ساتھ نمایاں ہوتا ہے جو اس خاندانِ رسالت کا مخالف ہے جس کے تمام اقدامات اور طور طریقے ایسے ہیں جو ایک مثالی سماج کی راہ میں رکاوٹ ہیں صرف مال و زر کو زندگی کا مقصد سمجھنے والوں کے سماج کے مقابل روحانیت کا بھی ایک سماج ہے سماج کی ان تمام تصویروں میں انسانی رشتے اپنی وفاداریوں، سچائیوں اور محبتوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

نسیم کے مرثیے میں جو رثائی سماج نظر آتا ہے وہ اگر چہ ماضی کے واقعے سے اپنا تعلق قائم کرتا ہے لیکن اس میں ایک ایسا انسانی احساس موجود ہے جس میں اپنے ماحول، اپنے سماج اور اپنے لوگوں کا دکھ درد دیکھا جا سکتا ہے اس میں ہر مجبور انسان کی آواز سنی جا سکتی ہے۔انسانیت اور امن دوستی اس کے بنیادی تصورات ہیں۔صفدر ہمدانی لکھتے ہیں:

'آج کا جدید مرثیہ اس پر آشوب عہد میں ان کی آواز اور احترامِ انسانیت و آدمیت کا پیغام ہے مرثیے کی سادگی اور وسعت پذیری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے دامن میں ہر عہد کی کربلا ہے۔ ہر مجبور اور مظلوم انسان کی آواز اس میں شامل ہے۔'[۹۶]

مذہبی افکار اور سماجیات

نسیم امروہوی ہماری ادبی تاریخ کی ان شخصیات کے سلسلے میں شمار کیے جائیں گے جن کی خدمات ادب میں

۹۵۔ نسیم امروہوی، تعقل پسند مرثیہ گو، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، مطبوعہ فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۸۳

۹۶۔ زبان اردو مرثیے کی مقروض ہے، مشمولہ نیا سفر، الہ آباد، شمارہ ۱۵، جنوری تا جون ۲۰۰۲ء، ص ۲۱۴

بھی ہیں اور مذہب میں بھی! ادب میں زیادہ مذہب میں کم۔ جہاں ایک طرف ادبی خدمات میں ان کا حصہ رہا ہے وہاں دوسری جانب مذہب کے ذیل میں بھی ان کی اہم تحریروں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اس اعتبار سے وہ ادب کی تاریخ میں اس سلسلے کے فرد کہلائیں گے جو مولانا شبلی، اور مولانا سید سلیمان ندوی سے ہمارے دور تک آیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنے مضمون 'سرسید کا مذہبی شعور' میں لکھتے ہیں:

'مذہب سب سے بڑی عوامی تحریک ہے جس میں تاریخ کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ عوام کے جذبات، ان کی نت نئی ضرورتوں اور کمزوریوں کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ مذہب کے بانی یا ابتدائی مبلغ ہر ملک میں عوام کے طبقے سے ہوئے یہ اور بات ہے کہ تاریخ کے زیرِ اثر ایک مخصوص طبقے نے مذہب کو اپنی نفسیاتی خواہشوں کا آلۂ کار بنا کر انسانوں کے درمیان ایک اونچی دیوار کھڑی کر دی ہے۔'[۹۷]

نسیم صاحب نے زندگی بھر اس طبقے پر تنقید کی جس نے مذہب کو اپنی نفسانی خواہشوں کا آلۂ کار بنا کر انسانوں کو تقسیم کر دیا۔ وہ مذہب کے معاملے میں اس قدر روشن خیال اور کھلے ذہن کی شخصیت ہیں کہ ان کے ہم عصر علما ان کی اس صفت کے قائل رہے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک عالم دین کی بھی تھی جس میں تدبر و تفکر کو زیادہ دخل تھا۔

نسیم جب بھی مذہب کی تعلیمات کو اُجاگر کرتے ہیں یا کوئی ایسا موضوع چھیڑتے ہیں جس کے سرے مذہبی افکار سے جا کر ملتے ہیں تو وہاں ان کی فکر کا خلاصہ یہ ہوتا ہے:

فروغِ آدمیت اس کا پھر منصب نہیں رہتا
یہ مذہب ہو اگر محدود تو مذہب نہیں رہتا

اسلام اور اسلامی تاریخ پر انہوں نے جو غور و فکر کیا اس کے بعد وہ اپنی تحریروں میں درج ذیل تین پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں ان کے نزدیک یہی تین زاویے ہیں جنہوں نے معاشرتی و قومی زندگی کو شدید دھچکا پہنچایا:

۱۔ ایک یہ کہ مورخوں نے مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ بھی کیا اور بادشاہوں کے قصیدے پڑھے۔

۲۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ گروہ بندیوں اور فرقہ ورایت نے تمام معاشرتی قدروں کو نقصان پہنچایا۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ اقتصادیات کو پسِ پشت ڈال دیا گیا جو قوموں کی ترقی میں روح کا درجہ رکھتی

۹۷۔ مشمولہ برگ گل، مجلّہ سرسید نمبر (کراچی: اردو کالج ۵۵۔۱۹۵۴ء)، ص ۶۳

ہے۔

نسیم کی نظموں، مرثیوں اور قطعات و رباعیات تک میں یہی مسائل ادبی پیرائے میں ظاہر ہوتے رہے ان کی نثری تحریروں میں جگہ جگہ اس کی بحثیں موجود ہیں۔ امام سید سجاد کے اقوال و ارشادات کے مجموعے پر [۹۸] خصوصاً ان کا طویل مقدمہ اس اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔

نسیم صاحب کی وفات پر اپنے تاثرات لکھتے ہوئے پروفیسر سجاد رضوی نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ان کے الفاظ یہ ہیں:

'ناانصافی کی بات ہوتی اگر مرحوم کے ایک اہم کام کی طرف اشارہ نہ کیا جائے اور وہ حضرت امام زین العابدین کی دعاؤں صحیفۂ کاملہ کی تدوین ہے یوں تو صحیفۂ کاملہ کے بہت سے اہم تراجم ملتے ہیں نسیم صاحب کے ترجمے کی شان اور ہے اس ترجمے کی ابتداء میں نسیم صاحب نے جو مقدمہ تحریر فرمایا ہے وہ بذاتِ خود ایک کتاب ہے جس میں انہوں نے اپنی پوری تحقیقی کاوشوں کو اجاگر کیا ہے۔' [۹۹]

صحیفۂ کاملہ کے مقدمہ میں نسیم نے جن اہم پہلوؤں کو مسلمانوں کے زوال کا سبب قرار دیا ہے وہ انہی کے لفظوں میں یہ ہیں:

۱۔ 'اب تک تاریخِ عالم کا مزاج یہ رہا تھا کہ جب بھی غیروں کے نیز بعض اپنوں کے قلم سے اسلامی عظمت و شوکت کا تذکرہ چھڑا انہوں نے بجائے اسلام کی تاریخ بیان کرنے کے مسلمان حکمرانوں کی قصیدہ خوانی شروع کر دی جنہوں نے فوجی تنظیم کی مدد سے اپنے حریفوں کو زیر کر کے وسیع ترین شہنشاہیتوں کی بنیاد ڈالی۔' (ص،۱۲)

۹۸۔ صحیفۂ کاملہ (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، مطبوعہ۱۹۶۲ء) حضرت امام حسینؑ کے صاحبزادے امام زین العابدین کی دعاؤں کے مجموعے 'صحیفۂ کاملہ' کے تعارف میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ نے یہ نوٹ لکھا ہے:

'امام کی ٦١ دعاؤں کا یہ مجموعہ فلسفۂ عبادت، اعتقادات، رابطۂ عبد و معبود، حقوق و فرائض، نفسیات و تعلیمات، انسانی اقدار اور دینی حقائق کا بے مثال مجموعہ ہے اس کا اسلوب عربی ادب کا حیرت انگیز شاہکار ہے عرب و عجم کے فضلا نے اس کتاب پر بہت لکھا ہے اور یہ کتاب بلاترجمہ اور باترجمہ و بشروح، عربی و فارسی، اردو و انگریزی سیکڑوں مرتبہ چھپ چکی ہے اور ہمارے ملک میں بھی متداول ہے اس کی اہمیت کے لیے یہی کافی ہے کہ اسے زبور آلِ محمدؐ کا لقب دیا گیا۔

'(جلد۱۴/۲ دانش گاہ پنجاب، طبع اول۱۹۸۲ء) ص۸٦

۹۹۔ تاثرات مشمولہ مجلّہ بجھی وہ شمع (لاہور: اظہار سنز، مطبوعہ۱۹۸۷ء) ص۳۷

۲۔ 'یورپی تاریخ نگاروں نے مسلمانوں کو اب تک صرف اس روپ میں پیش کیا کہ ننگی تلوار ہاتھ میں لیے کبھی ویانا اور بلغراد پر حملہ آور ہیں اور کبھی جنوبی فرانس اور جنوبی اٹلی کو دھمکا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج تک بالعموم مغربی قومیں اسلام کے خلاف ایک لاشعوری اور لاشعور استکراہ رکھتی ہے۔' (ص،۱۴)

۳۔ مسلمان رہنماؤں اور سلاطین کی بے خبری کے بیان میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

'اقتصادی ترقی اور خوشحالی افراد و قوم کی زندگی میں جو اہمیت رکھتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ایک مصلح جو انسانوں کی اصلاح پر مامور ہے وہ اگر ان کی معاشی حالت درست کرنے کی جانب توجہ مبذول نہیں کرتا تو وہ لوگوں کے ایمان و ایقان کو استوار کرنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا کیونکہ افلاس اور شکستہ حالی سے مجبور ہو کر گمراہی میں مبتلا ہو جانا ایک ایسی فطرت ہے جسے تاریخِ عالم میں معاشی اصلاح کے علاوہ کسی اور ترکیب سے آج تک نہیں بدلا جاسکا۔' (ص،۲۷)

نسیم نے اپنے مرثیوں میں جن کی تعمیر مذہبی احساس سے ہوئی ہے انہی باتوں کو نمایاں کیا ہے ان کی ادبی تحریروں میں جہاں جہاں مذہبی افکار اُبھرے ہیں وہاں وہاں ہم ان پہلوؤں کو زیادہ واضح دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے ایک فلاحی ریاست اور ایک روشن خیال سماج کا نقشہ کھینچا ہے۔صحیفۂ کاملہ کے مقدمے میں مسلم معاشرے کی تشکیل اور سرمایۂ افتخار پر بڑی جامع گفتگو کی گئی ہے۔نسیم مذہب کے معاملات میں ایک فلسفیانہ طرزِ فکر رکھتے ہیں وہ ماضی سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ ماضی پرست نہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے کہ:

'ماضی پرستی اور قدامت پرستی مسلم سائیکی کی گتھی میں پڑی ہیں اسی لیے عہد کا مسلم معاشرہ روایات اور مسلمات کی صورت میں ماضی کو سینے سے لگائے ملتا ہے اس لیے پدرم سلطان کا رویہ جنم لیتا ہے اور ملائیت بطور ادارہ فروغ پاتی ہے۔'[۱۰۰]

نسیم کی مذہبی فکر ملائیت ہی کو مسلم سوسائٹی میں سماجی مسائل پیدا کرنے کا سبب سمجھتی ہے۔

۱۰۰۔ کیا آج سرسید احمد خاں کی ضرورت ہے مشمولہ سرسید شناسی، مرتب طاہر تونسوی (لاہور: الفصیل اردو بازار، دسمبر ۲۰۰۲ء)، ص،۲۶۷

وہ اصل اسلام کی تشریح بھی کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ وہ انقلابی اسلام سے کس طرح الگ ہے۔[۱۰۱] ان کی رثائی نظموں میں بھی یہی موضوعات پھیلے ہوئے ہیں اور مذہبی معاملات میں بھی انہی کا تذکرہ ہے۔ اس اعتبار سے وہ سرسید اسکول کے فکری سلسلے کی شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے لکھا ہے:

'سرسید کی مذہبی فکر کا تقاضا تھا کہ مذہبی تصورات پر مسلسل غور و فکر ہوتا رہے اور زمانے کے مطابق اجتہاد سے گریز نہ کیا جائے۔'[۱۰۲]

نسیم کی اکثر تحریروں میں اس بات پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ سوسائٹی کی فلاح اس نکتے میں پوشیدہ ہے کہ اجتہاد کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ علامہ اقبال کے خطباتِ مدارس کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے اسے علما کی فکر کا محور قرار دیا ہے۔[۱۰۳]

نسیم صاحب کی وہ ادبی تحریریں جن میں مذہبی افکار بھی ظاہر ہوئے ہیں ان میں وہ اسلام کے نظامِ عدل کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور سماج پر اس کے اثرات دیکھنا چاہتے ہیں:

'ایک ایسا پاکستانی معاشرہ جو سماجی، معاشی نظام عدل سے محروم ہو جس میں عوام الناس کی زندگی، جہالت، غربت، ناانصافی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کی چکی میں پس رہی ہو وہاں نظامِ تعلیم کی بہتری ایک بہت سنگین نوعیت کا مسئلہ ہے۔'[۱۰۴]

ایک اور جگہ انہوں نے یہ بات لکھی:

'ہمارے پورے نظامِ حیات کی جڑیں جن فرسودہ عوامل سے کھوکھلی ہوتی ہیں ان میں مذہب کی غیر عقلی تشریحات و توجیہات کو بہت دخل ہے۔ محرک اول اس کا غیر عادلانہ نظام میں نسلوں کی پرورش ہے۔'[۱۰۵]

ایک اور اقتباس بھی اسے سلسلے میں بہت اہم ہے جس میں تعلیم کے تنزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

'تعلیم و تدریس کے غیر موثر طریقے، نصاب کی تربیت و تہذیب میں غیر ذمہ دارانہ

۱۰۱۔ نسیم امروہوی، ترجمہ صحفیۂ کاملہ، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز مطبوعہ ۱۹۶۲ء)، ص ۱۱۰ تا ۱۱۳

۱۰۲۔ سرسید احمد خاں اور جدت پسندی (کراچی: ارتقا مطبوعات، ۲۰۰۲ء)

۱۰۳۔ فرہنگِ اقبال پر اعتراضات اور ان کے جوابات (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۴ء)، ص ۴

۱۰۴۔ شاہ ولایت پبلک اسکول میں ایک تقریر، مشمولہ خبر نامہ، انجمن سادات امروہہ ۱۹۷۶ء، شمارہ ۲۱، ص ۱۲

۱۰۵۔ توضیح المسائل (کراچی: امین مرچنٹ، ۱۹۷۳ء)، ص ۳

ردیے یہ سب غیر عادلانہ نظام ہی کی شاخیں ہیں۔'[۱۰۶]

اپنے عہد کے ادیبوں، شاعروں اور بعض شاگردوں کے مذہبی کلام پر مشتمل مجموعوں پر ان کے تبصرے اور تقاریظ بھی ان کے مذہبی نقطہ نگاہ کو واضح کرتے ہیں۔ اپنے ایک شاگرد ڈاکٹر منظور رائے پوری کی پندرہ نظموں اور پانچ مقالوں پر مشتمل ایک مجموعے پر ان کے دیباچے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

'مذہب کی غلط تشریحات سماجی فلاح کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں کتنی دردناک غفلت ہے کہ ہم نے مذہب کی بعض حیات آفریں اور حیات بخش توانائیوں کو یکسر نظرانداز کردیا۔ فقہی مسائل میں اس طرح اُلجھے کہ اُلجھتے چلے گئے۔ جابر بادشاہوں اور مفسد ملاؤں اور مفتیوں نے دین کے چہرے کو مسخ کرکے پیش کیا۔ ایسا دین لوگوں کے لیے کس کام کا، صحیح تو کہا منظور رائے پوری نے اپنی نظموں میں کہ جو مذہب انسانوں کے کام نہ آئے اور آدمیت وانسانیت کی تعلیم نہ دے وہ مذہب کس کام کا۔'[۱۰۷]

اس سلسلے کا ایک آخری اقتباس بھی ہم پیش نظر رکھیں:

'بے عقل ملاؤں نے بڑے غضب ڈھائے ہیں۔ انہوں نے اپنی جہالتوں کے سبب مذہب اور سائنس میں ٹکراؤ پیدا کردیا۔ کیا یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیوں سے روگردانی کرسکتے ہیں۔'[۱۰۸]

جاہل ملاؤں اور بے علم مولویوں کے بارے میں ان کے لہجے میں کہیں کہیں بہت سختی آ گئی ہے خصوصاً ان کے بعض خطوط میں یہ انداز زیادہ جھلکتا ہے۔ خطوط کی حیثیت نجی بھی ہوتی ہے اور ایسے خطوط جو ہم صحبتوں کو یا بے تکلف دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ان میں اس قسم کا طرزِ اظہار آ جاتا ہے۔ لاہور کے ایک ادیب وشاعر وحیدالحسن ہاشمی کے نام ان کے ایک خط سے یہ اقتباس دیکھیے۔ جس میں وہ سنی، شیعہ اختلاف پھیلانے والوں پر تنقید کرتے ہیں:

'خدارا ان جاہل اور ناسمجھ ملاؤں کو یہ سمجھایئے کہ جو باتیں چودہ سو برس سے طے نہ ہوسکیں وہ اب تم کیا طے کرو گے کیوں بلاوجہ اپنی انا ابھارنے کے لیے 'نحن کا' (یعنی ہمارا) خون بہانے کا اہتمام کرتے ہو۔ یہ بے وقوف لوگ اگر ان فضولیات کے بدلے کوئی تعمیری

۱۰۶۔ شاہ ولایت پبلک اسکول میں ایک تقریر، مشمولہ خبرنامہ انجمن سادات امروہہ ۱۹۷۶ء ص ۱۳

۱۰۷۔ زکوۃ سخن (کراچی: ارباب پبلیشر، ۱۹۶۴ء)، ص ۳

۱۰۸۔ شاہ ولایت پبلک اسکول میں ایک تقریر، مشمولہ خبرنامہ، انجمن سادات امروہہ ۱۹۷۶ء، ص ۱۳

کام کریں اور قوم کو پستی سے اٹھا کر بلندی پر لے جانے کی تحریک چلائیں تو یہ ایک واقعی خدمت ہوگی......مگر یہ کہ فلاں ایسا تھا اور فلاں ویسا بالکل بے معنی بحث ہے جس کا کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا اتحاد المسلمین تقریباً واجب ہے اور اذیتِ ہمسایہ بہر حال حرام ہے آیات سے بھی اور احادیث سے بھی۔ سنیوں اور شیعوں کی ایک انجمنِ اتحاد قائم کیجیے اور خوب نظمیں کہیے اور کہلوایئے۔'[۱۰۹]

نسیم بنیادی طور پر ایک عالمانہ ذہن رکھتے ہیں اس لیے زندگی کے تمام معاملات پر غور وفکر میں ان کی شاعری اور دوسری تحریروں میں ایک پہلو اپنے اطراف کے سماج میں معیارِ علم کو بڑھانا ہے تاکہ نہ صرف یہ کہ سماج میں ترقی ہو بلکہ سماج کی یہی ترقی قوم کو بلندی کی طرف لے جاسکے گی اور یہ سب کچھ علمی کارناموں کے سبب ہوگا۔

سید سلیمان ندوی کسی ملک کے علمی کارناموں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'قوموں کی ترقی صرف خیالات کی بلندی اور اصلاح پر منحصر ہے۔ لیکن خیالات کا تغیر و انقلاب کس کے ہاتھ میں ہے۔ صرف تصنیفات اور ملک کے علمی کارناموں کے ہاتھ میں۔'[۱۱۰]

نسیم کی تصنیفات اور ان کے علمی کارنامے اس اعتبار سے بہت اہمیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے قوم اور سماج کو مہذب بنانے میں بہت بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ مولانا شبلی کے فکر ونظر سے متعلق ان کے شاگرد خواجہ غلام الثقلین کی یہ رائے مفتون احمد نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے:

'انسانوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ جو مذہبی، تخیلات رکھتے ہیں دوسرے وہ جو مذہب سے بالکل بیگانہ و بے پروا رہتے ہیں اور ایک آزاد دماغ رکھتے ہیں تیسرے وہ جن کے دماغ میں مذہب و آزادی مرکب صورت میں پائی جاتی ہے۔ اس گروہ کی دو شاخیں ہیں۔ اول جن میں مذہب غالب ہے۔ دوم وہ جن میں آزادی، قومیت اور مدنیت کا خیال مذہب پر غالب ہے۔ میرے خیال میں مولانا شبلی کا شمار آخری گروہ میں ہے۔'[۱۱۱]

۱۰۹۔ مکاتیب غیر مطبوعہ، مشمولہ 'بجھی وہ شمع'، ترتیب شبیہہ الحسن (لاہور: اظہار سنز، جون ۱۹۸۷ء) ص ص ۵۸، ۵۹

۱۱۰۔ نقوشِ سلیمانی (کراچی: کلیم پریس، طبع اول ۱۹۵۱ء) ص ۱۲

۱۱۱۔ مولانا شبلی ایک مطالعہ (کراچی: مکتبۂ اسلوب ۱۹۸۶ء، اشاعت اول) ص ص ۱۱۹، ۱۲۰

ہم نسیم امروہوی کو بھی اسی آخری گروہ میں شمار کریں گے کہ مذہبی افکار میں جن کا جھکاؤ مدنیت اور آزادی و حریت کی طرف ہے ان کے نزدیک انہی صفات سے ہم کسی سماج کو ایک فلاحی سماج کی طرف لے جا سکتے ہیں۔

لغت نویسی، ایک سماجی مظہر

زبان کا اپنے ماحول اور اپنے اطراف سے اتنا گہرا رشتہ ہوتا ہے کہ ہم اسے سماج کے طور طریقوں، شناخت اور خصوصیات سے ہٹ کر دیکھ ہی نہیں سکتے لفظ اور زبان اپنے سماج کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ لغت نویسی کو ہم اسی لیے ایک سماجی مظہر قرار دے رہے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

'آج جو زبان بولی جاتی ہے سو برس پہلے ایسی نہ تھی اس کے اجزائے ترکیبی میں مسلسل مگر آہستہ آہستہ تحلیل و تجدید کا سلسلہ جاری رہتا ہے پرانے لفظ متروک ہوتے جاتے ہیں اور مرتے جاتے ہیں۔'[۱۱۲]

جوش ملیح آبادی بھی الفاظ کو انسانی حیات کے مماثل قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

'الفاظ بھی آدمیوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، بیمار پڑتے اور تندرست ہوتے ہیں، بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ گوشہ نشیں رہتے ہیں اور سفر کرتے ہیں یہ بھی اپنے اپنے خاص مزاج، عادات، رسوم، روایات اور تاریخی واقعات رکھتے ہیں۔'[۱۱۳]

اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ لغت نویس دراصل اپنے سماج ہی کی مختلف تصویریں پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ لفظ انسان کے سماجی رشتے کا پہلا عمل ہے اور اسی لیے زبان انسان کی سب سے اہم سماجی سرگرمی ہے۔'[۱۱۴]

نسیم امروہوی عہدِ حاضر کے ان چند گنے چنے اہلِ قلم میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی زندگی کا بیشتر حصہ لغت نویسی میں گزرا۔ لفظ کے علم سے گہرا رشتہ یعنی اس کو جاننا، سمجھنا اور پرکھنا دراصل ان کے آباؤ اجداد

۱۱۲۔ مقدمۂ جدید اردو لغت، مشمولہ رسالۂ اردو، انجمن ترقی اردو پاکستان، شمارہ جنوری تا اپریل ۱۹۵۹ء، ص ۳۴

۱۱۳۔ الفاظ اور شاعر، مشمولہ افکار کراچی، جوش نمبر پہلا ایڈیشن، ۱۹۶۱ء، ص ۵۰۲

۱۱۴۔ پاکستانی معاشرہ اور ادب، ادب کا سماجی پہلو، مشمولہ پاکستانی معاشرہ اور ادب، مرتبین ڈاکٹر حسین محمد جعفری/احمد سلیم (کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، اپریل ۱۹۸۷ء) ص ۱۸

کے سلسلے سے ان تک پہنچا۔ ان کے والد، دادا، پردادا سب شاعر تھے ان کے دادا شمیم امروہوی کا ہمارے شعر وادب کی تاریخ میں ایک خاص فنی وادبی کردار رہا ہے۔ محمود حسن قیصر جو کئی برسوں تک رضا لائبریری رام پور سے وابستہ رہے ہیں ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

'شمیم امروہوی کا نام میں نے بہت بچپن میں اپنے والد مرحوم مولوی سیّد مقبول حسن سے سنا تھا۔ یہ ان ہی کی چشم دید روایت ہے کہ شمیم کی قدرت نظم اور بدیہہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ مختلف اصنافِ سخن پر بیک وقت لوگوں کی فرمائش کے مطابق اشعار املا کرواتے تھے۔ رضا لائبریری رام پور میں شمیم کی ہزلیات اور فحشیات پر مشتمل کئی مخطوطہ جلدیں ہیں، جن میں شمیم نے اس خاص رنگ میں خوب خوب دادِ سخن دی ہے۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے جب ان کو دیکھا تو بہت محظوظ ہوئے اور عرشی صاحب ناظم کتابخانہ سے فرمایا کہ ان کو بہت محفوظ رکھا جائے اس لیے کہ اردو کی جب کوئی جامع لغت لکھی جائے گی تو اس کے لیے یہ ایک ماخذ ہوگا۔'[۱۱۵]

نسیم امروہوی کے ذہنی پس منظر میں یہ تربیت تو تھی ہی لیکن اس علم سے ان کی رغبت اور دلچسپی کا بڑا تعلق دراصل ان کے سوالیہ ذہن نے قائم کیا کہ آخر لفظ کا انسان سے کیا رشتہ ہے اور اپنے ماحول اور اپنے سماج میں وہ کیسے کیسے روپ بدلتا ہے۔ لڑکپن میں نسیم امروہوی کے لکھے ہوئے ایک قصیدے کے چند اشعار (تشبیب) رئیس امروہوی نے اپنے ایک مقدمے میں نقل کیے ہیں جس میں نسیم نے اپنے خاندانی پس منظر ولائے رسول و خاندانِ رسول سے لے کر اپنے ذہنی ارتقا، ادبی ذوق اور لفظ سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے:

میرے فطری ذوق سے ہیں باخبر افرادِ قوم
چھوڑ کر آغوشِ مادر میں سرِ منبر گیا
خالقِ ذوقِ سخن مجھ کو نہ رکھ محتاجِ غیر
قابلیت شعر گوئی کی مجھے کردے عطا
شکرِ خالق کھل گیا میرے لیے بابِ سخن
مل گئی سرکارِ عالی سے مجھے طبعِ رسا

۱۱۵۔ یادِ نسیم، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن سادات امروہہ ۱۹۹۲ء)، ص ۸۵

شاعری کے آئینے میں عہد کو دیکھوں گا میں
لفظ سمجھائے گا مجھ کو زندگی کا ارتقا[۱۱۶]

شاعری کے آئینے میں زندگی اور اپنے اطراف کو دیکھنے کا یہ فطری ذوق نسیم کو لغت نویسی تک لے کر آیا انہیں اس فن سے اتنا لگاؤ تھا کہ:

'۱۹۲۸ء میں جب ان کی عمر بیس سال تھی اور وہ الٰہ آباد بورڈ سے فاضل فقہ اور فاضل ادب کے امتحانات سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ انہوں نے ایک بہت مختصر لغت ترتیب دی تھی جس کا نام...... 'طالب علموں کے لیے ایک مختصر لغت' رکھا تھا اس لغت میں صرف پانچ سو الفاظ تھے۔ ہر لفظ کی تشریح میں انہوں نے ایک شعر خود کہہ کر شامل کیا تھا جس میں اساتذہ کے اشعار سے استفادہ کیا گیا تھا'[۱۱۷]

پاکستان میں نسیم امروہوی کی لغت نویسی کا آغاز نسیم اللغات سے ہوا۔ ستر ہزار الفاظ پر مشتمل یہ لغت ۱۹۵۵ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آئی۔[۱۱۸] وزارتِ تعلیمات حکومتِ پاکستان نے جب ۱۹۵۸ء میں ترقی اردو بورڈ قائم کیا[۱۱۹] اور آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی طرز پر اردو میں ایک جامع اردو لغت کی تدوین کا منصوبہ بنایا گیا تو ۱۹۶۱ء میں نسیم امروہوی کو اس ادارے میں لیا گیا۔[۱۲۰] کراچی میں اس کی جلدِ اول ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔

۱۱۷۲ صفحات پر مشتمل اس ضخیم جلد کے تعارف میں ادارے کے صدر نے لکھا ہے:

'پریس کاپی کی نظرِ ثانی اور طباعت کے معاملے میں موجودہ جلد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور مولانا نسیم امروہوی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔'[۱۲۱]

اس لغت کے ابتدائی صفحات میں نسیم امروہوی لکھتے ہیں:

'لفظ جامد نہیں نمو پذیر ہوتے ہیں اور معاشرے کے طرزِ احساس کی تبدیلی کے ساتھ

۱۱۶۔ مراثی نسیم، جلد دوم (پاکستان رائٹرس گلڈ، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۳

۱۱۷۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، مقدمہ، فرہنگِ اقبال، فارسی (لاہور: اظہار سنز اشاعت اول ۱۹۸۹ء)، ص ۷

۱۱۸۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز (لاہور: کتاب منزل)

۱۱۹۔ مرزا نسیم بیگ، اردو ڈکشنری بورڈ ایک اہم علمی ادارے کا تعارف، مشمولہ اخبار اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، شمارہ ۳، مارچ، ۲۰۰۱ء، ص ۱۰

۱۲۰۔ مجلّہ، انجمن ساداتِ امروہہ کراچی، اپریل ۲۱ تا ۲۹، ۱۹۶۲ء، ص ۲

۱۲۱۔ محمد ہادی حسین، اردو لغت، جلد اول (کراچی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۷ء)، ص (د)

ساتھ ان کے معانی کی نئی نئی سمتیں واضح ہوتی چلی جاتی ہیں مثلاً قوم کہ یہ لفظ آج سے دو سو سال پہلے کچھ اور معنی میں استعمال ہوتا تھا لیکن اجتماعی شعور کی ترقی کے ساتھ اس کے معنی میں وسعت پر وسعت پیدا ہوتی چلی گئی اس لغت میں الفاظ کے ان استعمالات کی متعدد عہد بہ عہد مثالیں پیش کی گئی ہیں کتاب کو بہترین رفیق کہا گیا ہے۔ لغت رفیقِ سفر ہی نہیں، خضرِ کارواں کی حیثیت بھی رکھتی ہے کیونکہ لغت کا مطالعہ قومی تاریخ کے ایسے شعبوں کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے جن کی طرف عام مورخین کے نہ قدم اٹھتے ہیں نہ آنکھ۔'[۱۲۲]

نسیم اللغات کو خضرِ کارواں کہہ کر نسیم اس کا رشتہ نسلِ انسانی کے مستقبل سے جوڑتے ہیں اور قومی تاریخ سے اس کا تعلق قائم کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری 'زبان کے عروج و زوال کی داستان کو دراصل قوم کے عروج و زوال کی تاریخ سمجھا جائے۔'[۱۲۳]

نسیم کی لغت نویسی محض الفاظ کے ذخیروں کو ایک جگہ جمع کر دینے کا نام نہیں ہے۔ انہوں نے لفظ و زبان کے معاشرتی بندھنوں کو بہت اہمیت دی ہے۔ ان کے پیشِ نظر لفظ کی پوری تاریخ ہوتی ہے۔ جوش ملیح آبادی جن کی ادبی زندگی لفظ کو پرکھنے میں گزری وہ لکھتے ہیں کہ:

'میں لفظ پر نسیم امروہوی کی علمی گرفت کا معترف رہا ہوں۔'[۱۲۴]

احمد ندیم قاسمی اس ذیل میں یہ رائے دیتے ہیں:

'نسیم اللغات اور ترقی اردو بورڈ کراچی کی لغت کی ترتیب میں انہوں نے علمی و لسانی تبحر کے ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کر دیئے۔'[۱۲۵]

نسیم کا شمار صنفِ مرثیہ کے بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ مرثیے کے صرف شاعر ہی نہیں بلکہ اس صنف کے نقاد اور محقق بھی ہیں۔ پوری تحقیق سے انہوں نے یہ بات کہی ہے:

۱۲۲۔ کچھ اس لغت کے باب میں، مشمولہ اردو لغت، جلد اول (کراچی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۷ء)، ص (خ)

۱۲۳۔ اردو اور دیگر پاکستانی زبانیں، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان، شمارہ اکتوبر، ۱۹۸۸ء، ص ۴۱

۱۲۴۔ ڈاکٹر خلیق انجم جوش ملیح آبادی کے خطوط (نئی دہلی: ثمر آرٹ پرنٹرز، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۷۲

۱۲۵۔ احساسات، مشمولہ بجھی وہ شمع، مجلہ مرتبہ شبیہ الحسن (لاہور: اظہار سنز جون، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۵

کسی بھی صنفِ سخن نے نہ اتنے لفظ دیئے
زباں کو مرثیہ گوئی نے جتنے لفظ دیئے

(ارمغانِ نسیم، ص،۳۰۴)

اور اس سے اگلی منزل میر انیس کی شعری خدمات کے حوالے سے ان کا یہ شعر ہے:

سخن میں جذبہٴ و احساس کو رواج دیا
ہر ایک لفظ کو بالکل نیا مزاج دیا

(ارمغانِ نسیم، ص،۳۰۲)

نسیم کی نگاہ میں ایک بڑا شاعر ہی لفظ کو نیا مزاج عطا کرتا ہے۔ یہ مزاج اپنے زمانے کے مزاج اور اپنے سماجی حالات وخصوصیات سے اپنی تعمیر کرتا ہے۔ یہی لفظ مل کر جب زبان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو پھر وہ سماجی ارتقا میں اپنا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔ محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

'انسان نے اپنے سماجی ارتقا کی تاریخ میں زبان سے جس نوع کے کام لیے ہیں وہ خاص طور پر غور طلب مسئلہ ہے۔ زبان کی تشکیل میں الفاظ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ فکر اور الفاظ کے روابط نے جتنی ترقی کی لسانیات میں اتنا ہی اضافہ ہوتا رہا۔ کسی بھی لفظ کی مستقل بالذات معنویت اپنی جگہ مگر سیاق وسباق سے اس کی مختلف معنویتیں پیدا ہوئیں۔ ایک لفظ سے مختلف معنی نکالے جانے لگے۔'[۱۲۶]

زبان ولغت کے متعلق ذہن میں فوری تصور یہ آتا ہے کہ یہ الفاظ کا علم ہے اور لغت نگار کا کام یہ ہے کہ وہ لغت میں درج الفاظ کے معنی لکھتا ہے سوال یہ ہے کہ کیا زبان ولغت کا علم اسی حد تک محدود ہے یا اس کی راہیں اپنے سماج اور اس کے اطراف تک پھیلی ہوئی ہیں؟ اس سوال کا جواب ہمیں نسیم امروہوی کے ان افکار سے مل جاتا ہے جو انہوں نے لغت کے ذیل میں بیان کیے ہیں اور جن میں زبان ولغت کے حوالے سے ان کے سماجی تصورات کی بہت واضح تصویر ہم دیکھ سکتے ہیں ان کی کچھ تحریروں کے اقتباسات ہم یہاں نقل کر رہے ہیں ایک اداریے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

'ہمارا سر عقیدت وارادت کے ساتھ جھک جانا چاہیے ان بزرگوں کے آستانے پر جن کی پُر خلوص کوششوں نے ہماری قومی زبان کی تشکیل کی ہمیں مشترکہ خیالات واحساسات

۱۲۶۔ زبان کی سماجیات، مشمولہ ماہِ نو، لاہور، جلد اول، ۱۹۸۷ء، ص ۳۴۴

دیئے، مشترکہ سماجی طریقے، مشترکہ رسمیں اور مشترکہ خصوصیتیں عطا کیں۔ ہم نے اپنی پیاری زبان کو پریم کا بندھن اور محبت کا رشتہ بنا کر ٹوٹے ہوئے دلوں اور بکھرے ہوئے دماغوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ اردو کے دامن میں ہر زبان کے لفظ ہیں، پنجابی، سندھی، فارسی، ترکی، عربی، بنگالی، مرہٹی، انگریزی، پرتگالی، لاطینی، فرانسیسی غرض مشرق و مغرب میں جتنی جاندار بولیاں اور ترقی یافتہ زبانیں ہیں سب سے اردو نے استفادہ کیا۔ یہ زبان تمام بندشوں سے بالند تھی اسے ادیبوں اور شاعروں کی کسی جماعت نے پیدا نہیں کیا تھا۔ اسے عوام نے پیدا کیا تھا۔ یہ عوام کی گود میں پلی تھی۔ اسے سوسائٹی کے نچلے طبقے اظہارِ خیالات کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے حقیقت یہ ہے کہ اردو کی تخلیق کا سہرا کسی جماعت کے سر نہیں باندھا جاسکتا۔ وہ خود بخود اس طرح وجود میں آ گئی جس طرح تمام فطری طاقتیں مناسب وقت آنے پر ظہور میں آ جاتی ہیں۔'[۱۲۷]

ایک اور اداریے میں وہ لکھتے ہیں:

'ہر زبان اور ادب کی تخلیق کسی نہ کسی تمدنی، معاشرتی یا اور کسی نوع کے اعلیٰ ترین اور عظیم ترین عمرانی اور انقلابی مقصد کی تحصیل و تکمیل کے ماتحت ہوا کرتی ہے اور اس زبان کے ادبیات میں صرف وہی تصنیف ایک باوقار جگہ پانے کی مستحق سمجھی جاتی ہے، جو اس مقصد سے بعید نہ ہو جائے۔ ہر سوسائٹی کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، ہر قوم کا ایک مخصوص زاویۂ نظر ہوا کرتا ہے اور اس کے ادب میں بھی وہ ہی مخصوص قومی روح پائی جاتی ہے جو اس قوم یا اس سوسائٹی کی خصوصیت ہوتی ہے۔ اردو لٹریچر کے رجحانات اور امکانات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں مختلف ادبی رجحانوں، مختلف سماجی نظریوں اور مختلف دماغی تحریکوں کو اپنانے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ اردو ایک ایسا جاذب ہے جو ہر نقش کو جذب کر لیتا ہے۔ ماضی بعید میں اس نے ہندی اور فارسی کی قابلیتوں کو چوسا، دکن میں پہنچی، تو مرہٹی، تامل، تلیگو اور دوسری مقامی بولیوں کا دودھ پیا۔ دہلی دربار میں ترکوں سے سابقہ پڑا تو ترکی سے مانوس ہوگئی۔ جب اٹھارویں صدی میں دانایانِ فرنگ نے سرزمینِ ہند پر قدم رکھا تو اردو نے ان اجنبیوں کی آؤ بھگت کی اور آج اردو لٹریچر

۱۲۷۔ اداریہ، سہ روزہ اخبار، مراد، خیر پور، ۲۸ر ستمبر تا ۳۰ر نومبر ۱۹۵۸ء، ص ۳

مغربی ادب سے جس قدر متاثر ہو چکا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔'[۱۲۸]

نسیم کے ان خیالات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ زبان کی تاریخ اس کے ارتقا اور اس کے فروغ کو اس کے سماجی، تمدنی اور تہذیبی رشتے سے ہٹ کر نہیں دیکھتے۔ نسیم کی نظمیں، غزلیں، مرثیے اور ان کی تمام نثری تحریریں دیکھ لیجیے یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ وہ زبان کا رشتہ اپنے سماج اور اپنے عہد سے جوڑتے ہیں اس لیے وہ کتابی زبان نہیں لکھتے۔ خواجہ احمد فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

'ہم زبان اور محاورے سے بیگانہ ہوتے جارہے ہیں اور ایسی اردو استعمال کرتے ہیں جو کتابی زیادہ ہے اس کا روزمرّہ کا ادب ہمارے ذہن کا حصہ نہیں ہے اسی وجہ سے ہم لفظ، چیز یا واقعات اور نتائج کا فرق بھول جاتے ہیں حالانکہ قوی جمہوریتوں میں اس قسم کی تربیت کی اشد ضرورت ہے جو صرف زبان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔'[۱۲۹]

نسیم صاحب نے لغت نویسی میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا۔ زبان اور لفظ کی دنیا میں مسلسل سفر کرتے رہے وہ اس کے ارتقا کو ہمیشہ سماج کے آئینے میں دیکھتے رہے۔ زبان کا سماج سے جو تعلق ہے اس کا تذکرہ پروفیسر خلیل صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ ایک اقتباس یہ ہے:

'سماجی زندگی کی کوئی سطح ایسی نہیں جس میں زبان کا سکہ نہ چلتا ہو۔ سماج کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی 'گھرانے' کے افراد بھی زبان کے وسیلے کے بغیر گھریلو زندگی کو استوار اور مستحکم نہیں بنا سکتے۔ بچے کے اکتسابِ زبان کا انحصار گھریلو زندگی کی نوعیت اور خصوصیت پر ہوتا ہے اچھی نگہداشت غور و پرداخت اور افرادِ خانہ کی ہم آہنگی اور حسنِ معاشرت کی بدولت بچہ بالواسطہ زبان سیکھنے کے جو مراحل طے کرتا ہے۔ ان کے طفیل اس کے لسانی ارتقا کی رفتار رسمی تدریس سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ انسانی سماج، گھر کے اندر کا ہو یا محلے کا، کسی طبقاتی یا پیشہ ورانہ سطح کا ہو یا کسی سیاسی، معاشی اور تکنیکی سطح کا، شہری ہو یا دیہی اس کی سطح اور اس کے ہر دائرے میں اظہار و ابلاغ کو بالفاظِ دیگر زبان کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔'[۱۳۰]

۱۲۸۔ اداریہ، سہ روزہ اخبار، مراد، خیر پور، ۷، ۸، ۹ر اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۲

۱۲۹۔ ٹھیٹ اردو اور سماجی علوم، مشمولہ 'عصری ادب'، دہلی ۱۹۷۴ء، شمارہ ۱۷، ۱۸، ص ۷

۱۳۰۔ زبان' سماج اور تہذیب' ماہنامہ نگار، شمارہ نومبر ۱۹۹۱ء، ص ص ۲۸، ۲۹

نسیم کیونکہ ادب اور زندگی کے نظریے کے حامی اور ایک طرح سے اپنے ادبی کاموں سے اس نظریے کو توانائی دیتے رہے ہیں اس لیے الفاظ کا علم ان کے لیے کسی صحرا کا تکلیف دہ سفر نہیں ہے بلکہ اس میں انہیں ایک لطف اور لذت کا احساس ہوتا ہے۔ پاکستان میں تیار ہونے والی اردو کی سب سے بڑی لغت کی جلدِ اول کے ابتدائی حصے میں وہ لکھتے ہیں:

> 'لغت نگاری کی مشکلات مگر لذت آفریں مشکلات کا اندازہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جنہیں اس مرحلۂ مردافگن سے سابقہ پڑا ہے میں ایک لغت نگار کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اس لغت کی تدوین کے کام میں بعض اوقات مجھ پر ایک عجیب لطف انگیز سرشاری طاری ہو جاتی ہے۔'[۱۳۱]

زبان ولسانیات کے پیچیدہ اور مشکل موضوعات سے متعلق نسیم کے کاموں کی فہرست بہت طویل ہے فرہنگ اقبال (فارسی) کے مقدمہ نگار نے ان کی ۱۱ رکتابوں کے نام دیئے ہیں جو لغت و لسانیات کے ذیل میں آتی ہیں۔ وہ نام یہ ہیں:

> نسیم البلاغت، تسہیل القواعد، آئین اردو، حدائق البلاغت، معیار الاشعار طوسی، ہندوستانی بول چال، معراج العروض، نسیم اللغات، رئیس اللغات، فرہنگ اقبال (اردو)، فرہنگ اقبال (فارسی) [۱۳۲]

نسیم صاحب زبان کے بارے میں کبھی کسی تعصب کا شکار نہیں رہے۔ اردو سے انہیں اس لیے لگاؤ ہے کہ یہ سب کو ایک قومی رشتے میں منسلک رکھ سکتی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی وہ اردو کو مرکزی حیثیت دیتے تھے اور ۱۹۴۷ء کے بعد بھی انہوں نے اردو کو سماجی یکجہتی کا ذریعہ قرار دیا تقسیم سے پہلے کی ایک کتاب میں انہوں نے اس وقت لکھا کہ میں اردو کی ایک ایسی قواعد ترتیب دینا چاہتا ہوں جس پر عربی اور انگریزی کے اثرات نہ ہوں:

> 'میں نے جب سے اسکول میں پڑھانا شروع کیا ہمیشہ قواعد کی کتابوں کے نقائص پر غور کرتا رہا اور مولانا صفی لکھنوی کا یہ مصرع ہے 'کھینچ دو مل کر قواعد سے حصارِ عافیت' بار بار دل میں جوش پیدا کرتا رہا کہ کوئی ایسی کتاب لکھوں جس میں عربی یا انگریزی قواعد کی

۱۳۱۔ کچھ اس لغت کے باب میں، مشمولہ اردو لغت، جلد اول (کراچی: ترقی اردو بورڈ ۱۹۷۷ء)، ص (خ)

۱۳۲۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، مقدمہ فرہنگِ اقبال، فارسی (لاہور: اظہار سنز ۱۹۸۹ء)، ص ۲۱

مطابقت کا مطلق لحاظ نہ ہو بلکہ وہ صحیح معنوں میں اردو کی قواعد کہلائے۔'[۱۳۳]

یہ وہ اس لیے چاہتے تھے کہ زبان کے اپنے سماج سے رشتے کی اہمیت کو وہ سمجھتے تھے ان کے نزدیک اس سے قومی یکجہتی بھی وابستہ ہے بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

'زندگی اور سماجی عمل کو آگے بڑھانے کے لیے قومی سطح پر ایک مشترک زبان کا عام رواج اور استعمال بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یہی عمل ہمارے اپنے معاشرے میں بھی ہونا چاہیے۔ اس بات سے یہ بات سامنے آئی کہ جہاں زبان یکجہتی سماج پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے بنیادی سماجی ادارے کی حیثیت رکھتی ہے وہاں ادب، زبان کے ذریعے، اس معاشرے کے ظاہر و باطن، خارجی و داخلی دنیاؤں کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ ہے جس سے اس معاشرے کی روح، اس کی آرزوئیں، اس کا احساسِ جمال، خیر و شر کے تصورات، اس کے تجربے اور مشاہدے، اس کا کرب اور اضطراب، حقیقت اور فریب، حسن و جمال کے ساتھ، ظاہر ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ ادب سماجی عمل کے اظہار کا اسی لیے سب سے بڑا ذریعہ ہے۔'[۱۳۴]

ادب جسے سماجی عمل کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ کہا گیا نسیم صاحب لغت نویسی کو اس ادب کی روح قرار دیتے ہیں۔ ایک ایسی روح جو ماضی اور حال میں، مستقبل کے ارتقا کے لیے ایک رشتہ جوڑتی ہے آقائے محمد علی نے فارسی لغت نویسی پر لکھتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ:

'لغت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسان اپنے آپ کو لفظوں کی صورت میں جلوہ گر دیکھتا ہے کیونکہ یہی لفظ اس کا ماضی تھے اور اب اس کے حال ہیں دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ لغت انسان کے ماضی سے اس کے حال کو مربوط کرنے کا سب سے مستحکم ذریعہ ہے۔'[۱۳۵]

نسیم لغت کی ترتیب و تدوین کو سماج میں رہنے والوں کے احساسات کی زبان کہتے ہیں

۱۳۳۔ نسیم القواعد (آگرہ: گیا پرشاد اینڈ سنز، ۱۹۳۷ء) ص ۱۱

۱۳۴۔ پاکستانی معاشرہ اور ادب، ادب کا سماجی پہلو، مشمولہ پاکستانی معاشرہ اور ادب مرتبین، ڈاکٹر حسین محمد جعفری/احمد سلیم (کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، اپریل ۱۹۸۷ء) ص ۱۷

۱۳۵۔ فارسی لغت نویسی کی تاریخ (مترجم: سید سعید احمد) مشمولہ سہ ماہی اردو، انجمن ترقی اردو پاکستان، شمارہ جولائی تا ستمبر، ۱۹۷۵ء، ص ۱۵۵

اسی لیے وہ قوموں کی تاریخ کو ماضی و حال سے جوڑتے ہیں ان کی تحریر سے دو اقتباس نقل کیے جا رہے ہیں:

'ہر کام کی ایک غرض و غایت ہوتی ہے جس کے حصول کے لیے وہ انجام دیا جاتا ہے، لغت مرتب کرنے کی ایک غرض تو یہ ہے کہ اس کی مدد سے ایک ایک لفظ کی ساخت اور اس کے سفر کی تاریخ معلوم کی جائے۔ بالواسطہ یہ پتا بھی چلایا جائے کہ ہم جس قوم کے فرد ہیں، وہ ماضی میں دنیا کی کن کن قوموں سے تجارتی یا کسی اور قسم کے تعلقات رکھتی تھی۔'[۱۳۶]

'اردو میں سب سے زیادہ عربی و فارسی (اور ان کے توسط سے عبرانی، روما اور پہلوی) کے، ان سے کم برج بھاشا، اودھی، پراکرتوں اور سنسکرت کے اور سب سے کم ترکی، پرتگالی، انگریزی اور فرانسیسی کے الفاظ اپنی اصل شکل میں یا روپ بدل کر شامل ہیں۔ اردو اگرچہ جملوں کی ساخت اور افعال کے استعمال کی صورتِ ظاہر میں برج بھاشا سے مماثلت رکھتی ہے تاہم بجائے خود کسی ایک درخت کا پھل نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ہر لفظ کے معانی و مطالب پر روشنی ڈالنے کے بعد اس کی اصل و نسل سے بحث کی جائے اور لفظ کی تحلیل صرفی کر کے یہ واضح کیا جائے کہ الفاظ نے اپنے اپنے اصلی وطن سے ہمارے دیس تک پہنچتے پہنچتے کتنے روپ دھارے اور کتنی منزلیں طے کرنے کے بعد وہ اردوئے معلّٰی کے دربار میں باریاب ہوئے اس تحلیل سے قاری و ناظر کو ضمناً یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ماضی میں اس کے اسلاف اور آبا و اجداد کے تعلقات دنیا کی کس کس قوم سے رہ چکے ہیں۔'[۱۳۷]

نسیم نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں نسیم اللغات کو ازسرِ نو ترتیب دیا۔ اضافوں کے ساتھ یہ لغت ان کی وفات کے نو سال بعد لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں ان کے لکھے ہوئے مقدمے کے بعض پیراگراف سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ زبان کو کس بلندی پر جا کر اپنے سماج کے تمام طبقوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لغت صرف شہری زندگی کے لفظوں ہی کو اپنے دامن میں نہ سمیٹے بلکہ دیہات کے اہلِ قلم ادیبوں اور شاعروں کی زبان کو بھی اپنی شناخت بنائے:

۱۳۶۔ جامع نسیم اللغات (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت اول ۱۹۹۶ء)، ص ۵

۱۳۷۔ جامع نسیم اللغات (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت اول ۱۹۹۶ء)، ص ۵

'بچہ پیدا ہوتا ہے غوں غوں کی آواز نکالتا ہے، لغت نویس اسے سنتا ہے اور درجِ لغت کر کے اس کا مفہوم اور محل استعمال درج کر لیتا ہے۔ مگر یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایک اچھا بھلا، بالغ و عاقل اور سمجھ والا آدمی (جو جبرِ فطرت سے صرف اس بنا پر مجرم ہے کہ دیہات میں پیدا ہوا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی) اپنے شعر میں یا مضمون میں کوئی خاص مفہوم ادا کرنے کے لیے ایک لفظ استعمال کرتا ہے جو اہلِ زبان (یعنی شہر والوں) کے نزدیک فصیح نہیں، لیکن اس زبان کے بولنے اور سمجھنے والے سب متفقہ طور پر، یا اکثریت کی صورت میں اس لفظ کے وہی معنی سمجھتے ہیں جو دیہات کے شاعر یا ادیب نے مراد لیے ہیں، دریں صورت اس کا کیا جواز ہے کہ غوں غوں (مُہمل لفظ) تو درجِ لغت کیا جائے اور یہ بامعنی لفظ لغت میں اندراج پانے سے محروم ہو جائے۔'[۱۳۸]

تدوینِ لغت کے ذیل میں ان کا درج ذیل نظریہ ان کے سماجی تصورات میں عوامی رابطوں کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے:

'کاریگروں اور پیشہ وروں کے استعمال کی لفظیں مثلاً معماری، بخاری، بُنائی، سلائی اور دوسرے صد یا پیشوں میں کام دینے والے اوزار یا ان کے کاموں کے جزئیات کے لیے جو لفظ مستعمل ہیں یا مستعمل تھے اور اب غیر زبانوں کے الفاظ نے ان کی جگہ صرف اس وجہ سے لے لی ہے کہ انہیں برتنے والے حال کے لوگ مغرب زدہ ہیں یا اپنی زبان کی بجائے زبانِ غیر کے ماہر ہیں، ایسے اردو لفظوں کی چھان بین کر کے اور قدیم سے قدیم پیشہ وروں سے مل کر ان سب الفاظ کو درج کرنا چاہیے۔ یہ کام گھر بیٹھے نہیں، ہر قسم کے بازاروں اور پیشہ وروں کے اڈوں نیز دیہات کے پنٹھیوں میں گھوم پھر کے انجام پا سکتا ہے۔ اس ذیل میں (مثلاً) مچھیروں، قصائیوں، موچیوں اور اسی قسم کے دوسرے پیشہ وروں سے ملنا، ملاقات سے پہلے ڈائری میں سوالات درج کرنا، دخیل الفاظ کا مفہوم سمجھا کر ان کی جگہ وہ الفاظ ان سے دریافت کر کے یادداشت میں لکھنا جو ان کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔'[۱۳۹]

۱۳۸۔ جامع نسیم اللغات (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۶ء) ص ۶

۱۳۹۔ جامع نسیم اللغات (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۶ء) ص ۶

لغت نویسی سے نصابی کتب کی ترتیب تک، شاعری سے اداریہ نگاری تک اور لسانیات کے کاموں سے مرثیہ نگاری تک کے موضوعات کے ذیل میں ہم نے اس باب میں نسیم امروہوی کے سماجی تصورات کا ایک مختصر مطالعہ کیا۔ ان کی بڑی اور نمایاں ادبی خدمات کے پس منظر میں آئندہ کے ابواب میں ہم اس حوالے سے کچھ اور پہلوؤں کا بھی مطالعہ و تجزیہ کریں گے۔

تیسرا باب

تحریک پاکستان میں نسیم امروہوی کی قلمی خدمات اور ان کا سماجی پس منظر

- پس منظر
- قوموں کی سماجی زندگی اور ادب
- سیاسیاتِ حاضرہ
- معاشرتی انقلاب کے لیے تدبیریں
- آزادی کی اہمیت وضرورت
- سیاسی بیداری کے لیے بنیادی پیغام
- قراردادِ لاہور کے وقت لکھا جانے والا مسدس برق وباراں
- زندہ قوموں کی بنیادی طاقت......عزم وعمل
- برق وباراں میں ایک نئے مسلم معاشرے کی تشکیل کے پہلو
- رثائی نظموں میں نئی مملکت کے خواب
- نسیم کا طرزِ فکر بحیثیت ایک پاکستانی ادیب وشاعر

تیسرا باب

تحریک پاکستان میں نسیم امروہوی کی قلمی خدمات اوران کا سماجی پس منظر

پس منظر

تحریکِ پاکستان میں نسیم کی قلمی خدمات ایک ایسے ہی ذہنی پس منظر اور سماجی وسیاسی حالات سے اپنا سفر شروع کرتی ہیں جو ۱۸۵۷ء کے آس پاس کے اس پورے ماحول سے وابستہ ہیں جنہیں ہم سرسید تحریک کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ نسیم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، جس بستی میں ان کا لڑکپن گزرا، جن آباؤ اجداد کے آغوش میں وہ پروان چڑھے اور جن تحریکوں کو انہوں نے نوعمری میں سمجھا اور جن کے بارے میں سوچا یہ تمام کی تمام ۱۸۵۷ء کے بعد قائم ہوجانے والی ان معاشرتی روایتوں اور سیاسی معاملات سے الگ نہیں ہیں، جن میں برصغیر کے مسلمانوں کی سوچ اور جدوجہد نے اپنا سفر طے کیا اور جہاں انگریزوں کا تسلط آزادی اور حریت کی ہر تحریک کو کچلنے کی برابر کوشش کرتا رہا۔ وہ تاریخ کے ایک طالب علم تھے پورے برصغیر کے حالات ان کے پیش نظر تھے خصوصاً ان کی اپنی بستی امروہہ میں انگریزی اقتدار کے خلاف ان کے بزرگوں نے جس طرح قربانیاں دی تھیں ایک حساس شاعر و ادیب کے طور پر وہ انہیں کس طرح فراموش کرسکتے تھے یہ سب تصویریں ان کی نظروں میں تھیں:

> 'انگریزی تسلط دوبارہ قائم ہونے کے بعد باشندگانِ ضلع مراد آباد پر لرزہ خیز مظالم ڈھائے گئے امروہہ خاص طور پر نشانہ بنا۔ ایک طویل فہرستِ باغیانِ امروہہ مرتب کی گئی

اور سینکڑوں افراد کو مختلف سزائیں دی گئیں۔ مشہور ہے کہ بڑے بازار کے تراہے پر پھانسیاں نصب تھیں اور انقلابی افراد کے دونوں ہاتھ پہلے کاٹ دیئے جاتے بعد میں پھانسی دی جاتی تھی۔''[۱]

مقالے کے پہلے باب میں جہاں ہم نے نسیم کے سوانحی حالات قلم بند کیے ہیں وہاں ان سماجی حالات کا بھی ذکر کیا ہے جو نسیم کے ذہنی پس منظر میں تھے اور جن سے ان کے آباؤ اجداد بھی گزرے اور وہ خود بھی ان کے درمیان رہے لیکن ان مسائل و مشکلات نے انہیں مایوسی سے ہمکنار ہونے نہیں دیا اپنے لڑکپن میں انہوں نے اردو میں جو نظمیں لکھیں ان میں افسردگی اور بے دلی نہیں بلکہ حوصلہ اور امنگ ہے۔ اسی مزاج کی نظموں میں سے ایک نظم 'ترانۂ ملی' کے عنوان سے 'نایاب نظم' کی ذیلی سرخی کے ساتھ ایک جریدے نے ۱۹۳۷ء میں شائع کی تھی:[۲]

ہر دور میں ہوا ہے اک امتحاں ہمارا ‏ ‏ گہوارۂ عمل ہے دورِ زماں ہمارا
اے روحِ عزم تیرا ہم امتحان لیں گے ‏ ‏ سو بار لے چکی ہے تو امتحاں ہمارا
اے نبضِ وقت رک جا، اے نظمِ دہر تھم جا ‏ ‏ ہے رہ نوردِ منزل پھر کارواں ہمارا
میزانِ ابتلا میں تاریخ تول دیکھے ‏ ‏ کس قوم سے نہیں ہے پلّہ گراں ہمارا
گو محبسوں میں ہم نے عمریں گذار دی ہیں ‏ ‏ لیکن رہا دلوں پر سکّہ رواں ہمارا
رک رک کے آ رہی ہیں ناقوس کی صدائیں ‏ ‏ رہ رہ کے گونجتا ہے شورِ اذاں ہمارا
مٹ کر چمک رہے ہیں دب کر ابھر رہے ہیں ‏ ‏ دیکھا عروج تو نے اے آسماں ہمارا
فطرت کی رو پلٹ دے آہِ رسا ہماری ‏ ‏ قسمت کا رُخ بدل دے اشکِ رواں ہمارا
ہم کس کے آستاں پر دنیا میں سر جھکائیں ‏ ‏ ہے کعبۂ عقیدت خود آستاں ہمارا
ہر دور کا مفسر مدحت نگار اپنا ‏ ‏ ہر دور کا مؤرخ افسانہ خواں ہمارا
کی تربیت ہماری بجلی گرا گرا کر ‏ ‏ صیاد نے بنایا خود آشیاں ہمارا
گھٹتا رہا ہمیشہ فتنوں کا زور ہم سے ‏ ‏ بڑھتا رہا ہمیشہ جذبِ نہاں ہمارا

۱۔ خورشید مصطفیٰ، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور امروہہ، مشمولہ میراث، کراچی، شمارہ جنوری تا جون ۱۹۹۳ء، ص ۴۳

۲۔ نظارہ لکھنؤ، مئی ۱۹۹۳ء، ص ۴۳

قوموں کی سماجی زندگی اور ادب

نسیم امروہوی کے کسی بھی نقطۂ نگاہ یا قوموں کی سماجی زندگی کے متعلق ان کے خیالات کو سمجھنے کے لیے ہمیں یہ ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ وہ کسی سماجی انقلاب یا کسی سماجی تبدیلی میں براہِ راست ایک سیاسی کارکن کے طور پر شریک نہیں ہیں۔ ان کی خدمات قلمی ہیں۔ نسیم امروہوی کی سوانح و شخصیت سے متعلق پہلے باب میں 'تحریک پاکستان میں نسیم کی قلمی شمولیت' کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں۔

زبان و ادب کے راستے سے قوموں کی زندگی اور ان کے ماحول میں داخل ہونے کو نسیم بہت اہمیت دیتے ہیں ان کے نزدیک اس کے اثرات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ بظاہر تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قوموں کی سماجی زندگی میں تغیرّات بہت تیز ہیں جبکہ ادب میں ان تغیرّات کی رفتار بہت ہلکی ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے نسیم لکھتے ہیں:

'قوموں کی سماجی زندگی کی رفتار جس قدر تیز اور بعض اعتبارات سے تموّج خیز ہوتی ہے، ارتقائے ادب کی رفتار میں وہ تیزی اور اضطراب نظر نہیں آتا۔ محض سماجی نقطہ نظر سے دیکھیے تو محمد شاہی عہدِ حکومت کے معاشرے اور عصرِ حاضر کے معاشرے میں کوئی مماثلت اور مطابقت نظر نہیں آتی لیکن اگر ہم خالص ادبی اور لسانیاتی مقامِ نظر سے اپنی تاریخ کا جائزہ لیں تو محسوس کریں گے کہ عہدِ محمد شاہ بلکہ اس کے بھی قدیم پیش رو شاہجہاں کے عہد سے اب تک اردو زبان و ادب کا قافلہ اس دور کے تمام ذخائر کو اپنے دامن میں لیے ہوئے کسی غیر قدرتی تفسیر اور نا قابلِ جواز انقلاب کے بغیر اپنی طبعی رفتار سے ارتقا کی طرف چلا جا رہا ہے۔'[۳]

نسیم کے اس اقتباس سے ہم ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک ادب کی شہادتیں اور ادب کی گواہی زیادہ معتبر ہوتی ہے۔ وقتی سیاسی بیانات اور انقلاب کے متعلق محض نعرے بازیاں وقت کے ساتھ ساتھ مٹ جاتی ہیں۔ ہم تحریک پاکستان کے پس منظر میں ان کے افکار و خیالات کو جب دیکھتے ہیں تو اس میں ایک وقتی ابال نہیں بلکہ اس میں ایک مربوط فکر پائی جاتی ہے جہاں قوموں کی آزادی کا معاملہ درپیش ہو وہاں معاملات سرسری نہیں ہوتے اپنی کتاب 'جنگِ عالمگیر' کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

'قوموں کی زندگی، ملکوں کا قیام، جنگ کے مکروہ عزائم، جغرافیائی بٹوارے اور آزادی

۳۔ ریختہ میں میر تقی میر کے استاد سعادت امروہوی (کراچی: انجمنِ سادات امروہہ، اکتوبر ۱۹۶۲ء)، ص ۲

کی تحریکیں اتنی غیر اہم نہیں ہوتیں کہ انہیں ایک وقتی ابال کی طرح سوچا جائے یہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ اپنی عمدہ ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ان پر غور وفکر کیا جائے۔ نوعِ انسانی کی ترقی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔' ۴؎

سیاسیاتِ حاضرہ

تحریکِ پاکستان کے پس منظر میں اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد ان کی ایک کتاب 'استاد کا پیغام شاگردوں کے نام' ۵؎ منظرِ عام پر آئی اگر چہ اس کتاب کے نام سے ایسا لگتا ہے کہ اس میں شاید نصیحتیں ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں آزادی کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے بیسویں صدی کے بعض سیاسی تغیرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نسیم صاحب اس کتاب کے ایک باب 'سیاسیاتِ حاضرہ' میں جن باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں ان میں چند بنیادی باتیں اس اقتباس میں نظر آتی ہیں: ف

'وقت کا تیز گام قافلہ واقعات وحوادث کی پیچ در پیچ گھاٹیوں کی مسافت طے کر کے اس وقت حال و مستقبل کے موڑ سے گزر رہا ہے اور قوموں کی زندگی کے اس ختم نہ ہونے والے سفر کی انتہائی سخت منزلیں ہمارے سامنے آنے والی ہیں پچھلی دنیا اپنی تمام ہنگامہ سامانیوں کے ساتھ مر چکی ہے اور تقاضائے انقلاب، عصرِ نو کی تخلیق کے لیے بے چین ہے۔ وہ جنگ جو ابھی طوفانِ نوح کی طرح ہمارے سروں پر سے گزر گئی ہے اس نے تاریخ، جغرافیہ اور سیاست کی تمام قدروں کو بدل ڈالا ہے اور زمانۂ امن میں اقوام اور افراد فکر وعمل کی جو منزلیں صدیوں میں طے کرتے اس جنگ کی بدولت وہ تمام منزلیں صرف چھ سال کی قلیل مدت میں طے ہو گئیں۔ ہندوستان نے اس چھ برس کی مدت میں بڑی لمبی منزل طے کی ہے۔ ہندوستان کے باہر، فاشی، ناتسی اور شہنشاہی طاقتیں کوسِ من الملک بجا رہی تھیں امریکہ اپنی گوشہ نشینی کی پالیسی پر کار بند تھا، روس اقوامِ عالم میں اچھوت کی حیثیت رکھتا تھا۔ انگلستان میں سرمایہ کاروں اور قدامت پسندوں کا زور تھا

۴۔ (لکھنؤ: ناشر اشاعتِ اردو، ۱۹۴۴ء) ص ۱۳

۵۔ ناشر (یو پی، انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ، ۱۹۴۵ء)

اور سابقہ مجلسِ اقوام (یا کفن کھسوٹوں کی انجمن) ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ لیکن آج مجلسِ اقوام نامرادی کی گہری قبر میں دفن کی جاچکی ہے۔ انگلستان کے سرمایہ داروں نے مزدوروں کے مقابل ایسی زبردست شکست کھائی کہ تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ برطانیہ صفِ اول سے کھسک کر دوسرے درجے کی طاقت بن چکا ہے اور امریکہ اب گوشہ نشیں طاقت نہیں رہا بلکہ گھس بیٹھ، کی حکمت عملی کا استاد بنا ہوا ہے۔ رہیں نازی اور فاشی طاقتیں، وہ تاریخ کا بھولا ہوا افسانہ بن چکی ہیں۔ ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں ہندوستان اس قدر بدل چکا ہے کہ اب یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ وہی ہندوستان ہے جسے ہم نے ستمبر ۱۹۳۸ء سے قبل دیکھا تھا:

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا عہد ہے ساز بدلے گئے[۶]

معاشرتی انقلاب کے لیے تدبیریں

معاشرتی انقلاب کے لیے نسیم صاحب کے ذہن میں کیا کیا تدبیریں ہوسکتی ہیں؟ اس کا ایک اظہار تو گزشتہ اقتباس سے ہوا اور اس ذیل میں ان کی دوسری تحریریں بھی ابھی زیرِ بحث آئیں گی۔ نسیم کا شمار ان اہلِ فکر میں کیا جانا چاہیے جو کسی بڑی سماجی تبدیلی یا انقلاب کی طرف بتدریج بڑھتے ہیں۔ اسے ہم ذہنی انقلاب بھی کہہ سکتے ہیں وہ انسانیت کے لیے جب بھی کوئی پیغام دیتے ہیں تو پہلے انسانیت کو اس کے ماضی اور اس کے حال سے کچھ مثالیں فراہم کرتے ہیں۔ اس گرد و پیش کی مثالوں کے بعد وہ اسے حقوق و فرائض کی اہمیت اور ضرورت بتاتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں انہوں نے آزادی کو انسان کا سب سے پہلا حق تسلیم کیا ہے۔[۷]

آزادی کی اہمیت وضرورت

آزادی کی اہمیت وضرورت کے بارے میں اور تحریکِ پاکستان کے حوالے سے نسیم کی قلمی خدمات کو ہم چار حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

۶۔ استاد کا پیغام شاگردوں کے نام (یوپی انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ، ۱۹۴۵ء)، ص ۱۷

۷۔ انسانی حقوق کی بنیادیں، مشمولہ خبرنامہ (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۸ر جون ۱۹۶۶ء)، ص ۱۹

۱۔ ان کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ نظموں میں آزادی اور انقلابی جذبوں کا تذکرہ۔

۲۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی سیاسی روش پر کچھ نثری تحریریں۔

۳۔ قیام پاکستان کے پس منظر میں طویل مسدس برق و باراں۔

۴۔ مرثیے کے چہروں میں مثالی معاشرے کی تصویریں۔

نسیم امروہوی کی ولادت بیسویں صدی کے عشرہ اول میں ہوئی۔ ۱۹۰۸ء ان کا سنِ ولادت ہے اور یہی زمانہ برصغیر کے سیاسی وسماجی نظام میں تبدیلیوں اور تغیرات کے آغاز کا زمانہ ہے:

'جب یکم جنوری ۱۹۰۱ء کا سورج طلوع ہوا تو اس نے دیکھا کہ نو آبادیاتی نظام کسی مہیب آکٹوپس کی طرح ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک کو اپنے خوفناک شکنجے میں جکڑے ہوئے ہے لیکن اسی بیسویں صدی میں مختلف ایشیائی اور افریقی ممالک میں جدوجہد قومی آزادی کا ایک سیلِ رواں چل پڑا۔'[۸]

نسیم کی نوعمری، نوجوانی اور تقریباً چالیس سال تک کی عمر کا زمانہ اسی جدوجہد، قومی آزادی کے پروان چڑھنے اور ایک طرح سے سیلِ رواں کی طرح آگے بڑھنے کا زمانہ ہے۔ انہی اثرات کے تحت ان کی تحریروں میں آزادی کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

نسیم نے اپنی ایک مرتبہ کتاب میں آزادی کی جدوجہد کے عنوان سے تین مضامین شامل کیے ہیں[۹] ان کے تحریر کردہ یہ مضامین ساتویں جماعت کے طالب علموں کے لیے ہیں اور درج ذیل ذیلی عنوانات کے تحت انہوں نے ایک مختصر تاریخ طلبا و طالبات کو بتائی ہے۔ ہند پر انگریزوں کا تسلط، حیدرعلی اور ٹیپو کا انگریزوں سے جہاد، جنگ آزادی میں ٹیپو کی شہادت، مسلمانوں کا احساسِ غلامی، تحریکِ مجاہدین، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، جنگ آزادی کے طریقے میں انقلاب، سرسید کا جہاد بالقلم، کانگریس کی بنیاد، مسلم لیگ کا آغاز، مسلم لیگ کی تقویت کے اسباب، مسٹر جناح کی مسلم لیگ میں شمولیت، برطانیہ کے وعدے، مسلمانوں کا عدمِ اعتماد، برطانیہ کی بدعہدی، ہوم رول اور خلافت کی تحریکیں، مسٹر جناح کے چودہ نکات، شدھی تحریک، مسلمانوں کے لیے سب سے مشکل وقت، مشکل کا دائمی حل۔

۸۔ اوصاف احمد، بیسویں صدی کی اردو شاعری (کراچی: بک ہوم، اشاعت ستمبر ۲۰۰۳ء)، ص ۱۴

۹۔ اردو ادب، ساتواں حصہ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۲ء)، ص ۲۴۹ تا ۲۷۵

سیاسی بیداری کے لیے بنیادی پیغام

شبنم بختیار نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے:

'نسیم امروہوی نے زمانے کے بہت سے انقلابات کا مشاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کوسیاسی طور پر بیدار کرنے اور ایک قوم کی حیثیت دینے کی کوشش کی۔'[۱۰]

۱۹۴۷ء سے پہلے نسیم نے آزادی، انقلاب اور جدو جہد کے حوالے سے جو کچھ بھی لکھا ہے ان میں سے کچھ حصہ ایسا ہے جس میں وہ محض ایک مورخ یا تاریخ نویس نظر آتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان کی گئی ذیلی سرخیوں سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس حوالے سے ان کی خدمات کا بیشتر حصہ ادب کے راستے سے ہم تک پہنچا ہے جس میں نثر کے مقابلے میں شاعری کا حصہ زیادہ ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن لکھتے ہیں:

'نسیم امروہوی نے 'نظم کی صنف' کو بھی اپنے افکارِ عالیہ سے مالا مال کیا ہے۔ بیسویں صدی میں اپنے خیالات کے مؤثر اظہار کے لیے شعرا نے نظم کی صنف کا سہارا لیا۔ اس خصوصی توجہ کی بنا پر صنفِ نظم کے موضوعات میں اضافہ ہوا اور ہر قسم کے خیالات اس میں سمانے لگے۔ اقبال اور ترقی پسند شعرا نے تو اس صنف کی خوب آبیاری کی، اور اسے معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔ نسیم امروہوی نے عہد بہ عہد بدلتے حالات اور رجحانات پر ہمیشہ گہری نگاہ رکھی اور ان کو شاعرانہ لباس پہناتے رہے۔ انہوں نے دوررس نگاہوں سے حالات کا تجزیہ اور قوم کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ انہوں نے سمجھدار مسیحا کی طرح مریض کا نہیں مرض کا علاج کرنے کی سعی کی۔ انہوں نے سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی، دینی، اخلاقی غرض ہر موضوع پر منظومات کے ذریعے سے اپنا اصلاحی نقطۂ نظر پیش کیا اور آنے والے وقت نے ان کے خیالات کی تائید و توثیق کی۔ برصغیر پاک و ہند میں سیاسی بیداری کے لیے جن شعرا نے کاوشیں کیں، ان میں نسیم امروہوی کا نام بھی پیش پیش ہے اور خصوصاً پاکستان کے قیام کے پس منظر میں لکھی جانے والی ان کی بعض منظومات کی تاثیر و اثرات کی داستان بعض بزرگوں کے ذہنوں میں آج بھی محفوظ

۱۰۔ نسیم امروہوی بحیثیت شاعر (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے) اکتوبر ۱۹۸۹ء، مملوکہ لائبریری گورنمنٹ کالج فیصل آباد، ص ۷۹

ہے۔[۱۱]

نسیم کی اس انداز کی نظموں میں بعض کا طرز گیتوں کے انداز سے قریب تر ہے۔ مثلاً ان کی نظمیں 'اٹھ وطن کے سورما' [۱۲] 'سب سے بڑی طاقت' [۱۳] 'نیا انقلاب' [۱۴] اسی مزاج کی نظمیں ہیں 'اٹھ وطن کے سورما' کے متعلق الیاس حسن مدنی لکھتے ہیں:

'میں نے ۱۹۴۳ء کے زمانے میں قائم رضا نسیم کی نظم 'اٹھ وطن کے سورما' لکھنؤ کے اکثر اسکولوں میں طلبا کو ترانے کے انداز میں پڑھتے سنا ہے۔' [۱۵]

اس نظم کا ایک اقتباس یہ ہے:

اٹھ وطن کے سورما، قسمتیں بنائے جا
زندگی کی راہ میں، زندگی لٹائے جا

جی میں ہے نئی اٹھان، دل میں ولولے نئے
کٹ چکی ہیں بیڑیاں بے بسی کے دن گئے

اب تو اپنے عزم کو
خوب آزمائے جا
اٹھ وطن کے سورما

ہاں ترقی وطن آج تیرے ہاتھ ہے
یعنی تیری قوم کی لاج تیرے ہاتھ ہے

جس سے دل مچل پڑے
ایسے گیت گائے جا
اٹھ وطن کے سورما

۱۱۔ ترجیحات (لاہور: اظہار سنز اردو بازار، ۱۹۹۸ء)، ص ۷۳
۱۲۔ پھولوں کا ہار (لکھنؤ: بھارگو بک ڈپو سنہ اشاعت ندارد)، ص ۵
۱۳۔ ایضاً، ص ۶۳
۱۴۔ منظومات (لکھنؤ: ۱۹۴۲ء)، ص ۶۱
۱۵۔ اصلاح لکھنؤ، شمارہ فروری ۱۹۸۱ء، ص ۸

حریت کے دن پھرے ظلم و جور کھوگیا
غیر سے ترا چمن پاک و صاف ہوگیا
اب چمن کی خاک کو
کیمیا بنائے جا
اٹھ وطن کے سورما

نسیم کی اس انداز کی نظموں میں بعض مسدس کی شکل میں بھی ہیں۔ ایک ایسی ہی نظم 'سازِ حریت' ہے [۱۶] جس میں اپنے بزرگوں کے زمانے کے تقاضوں اور اپنے زمانے کے تقاضوں کے فرق کا احساس دلایا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اب زمینداری سے خود کو اور اپنے معاشرے کو ترقی نہیں دی جاسکتی اب محنت اور بیداری کا زمانہ ہے۔ قدامت کے فلک بوس عمل اب تھرتھرا رہے ہیں۔ نئے معاشرے، نئے نظام، نئے ملک اور نئی ضرورتوں کے تقاضے اب کچھ اور ہیں:

تھرتھراتے ہیں قدامت کے فلک بوس محل — گھر کے آئے ہیں تجدّد کے بھیانک بادل
سنبھل اے رہرو گم گشتۂ ایام سنبھل — ہر قدم اک نئی آفت ہے ذرا دیکھ کے چل
چھپ کے بیٹھا ہے تری گھات میں دشمن تیرا
کہیں کانٹوں میں اُلجھ جائے نہ دامن تیرا

قرار دادِ لاہور کے وقت لکھا جانے والا مسدس برق و باراں

تحریکِ پاکستان کے پس منظر میں لکھی جانے والی اس دور کی نظموں میں نسیم کی طویل نظم 'برق و باراں' سب سے اہم نظم میں شمار کی جانی چاہیے۔ اس کے متعلق سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

'یہ نظم نسیم امروہوی نے ۱۹۴۰ء میں لکھی اور ۱۹۴۴ء میں برق و باراں المعروف بہ مسدسِ نسیم کے نام سے لاہور سے شائع ہوئی۔' [۱۷]

ارمغانِ نسیم کے مرتب نے لکھا ہے:

'۹ ۲۷ بندوں پر مشتمل یہ نظم نسیم امروہوی نے ۱۹۴۰ء میں لکھی یعنی اس کی تخلیق اسی سال

۱۶۔ اس نظم سازِ حریت کو انہوں نے بعد میں مرثیے کی شکل دے دی تھی

۱۷۔ نسیم امروہوی کی طویل قومی و اصلاحی نظم برق و باراں، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۲۳

عمل میں آئی جس سال لاہور میں قرار داد پاکستان منظور ہوئی۔ لاہور کے مست قلندر بک ڈپو (بسنت روڈ) نے اسے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا تھا۔ اس وقت نسیم صاحب نیشنل ہائی اسکول لکھنؤ سے متعلق تھے۔ یہ نظم پانچ حصوں پر مشتمل ہے، تلاطم امواج، برقِ خرمن، نویدِ برشگال، بارانِ رحمت، پاکستان رحمت۔ اردو ادب میں یہ پہلی طویل نظم ہے جو قیامِ پاکستان سے قبل آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی۔[۱۸]

'تلاطم امواج' اس طویل نظم کا پہلا حصہ ہے۔ موجوں میں تلاطم کے اظہار سے دراصل موجودہ زمانے میں مختلف اقوام میں جو ایک بیداری ہے اس کا احساس دلایا گیا ہے۔ پھر اقلیتوں میں زندگی کی جو نئی لہر ہے 'تلاطم امواج' میں وہ لہر بھی اپنا تعارف کراتی ہے اور اسی پس منظر میں مسلمانوں کے فطری ذوقِ تنظیم کو نسیم نمایاں کرتے چلے جاتے ہیں:

نمایاں ہیں صنعت کے آثار کیا کیا　　تجارت کے ہیں گرم بازار کیا کیا
یہاں درسگاہیں، وہاں کار گاہیں　　بلاتی ہیں جو پائے منزل کو راہیں

نظم کے دوسرے حصے 'برقِ خرمن' میں مسلمانوں کی قومی وسماجی ترقی میں حائل رکاوٹوں کا بہت موثر اظہار ہے۔ اقبال کی مثنوی کا یہ شعر بہت معروف ہے ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

شاید یہی شعر نسیم کے ذہن میں گردش کرتا رہا اور انہوں نے 'برقِ خرمن' میں اسی نکتے کو زیادہ اُبھارا ؎

مداری کی تھیلی فروعی مسائل

مسلمانوں کی سماجی زندگی میں جو ایک انحطاط کی صورت پائی جاتی ہے۔ نسیم نے اس کا برملا اظہار نظم کے تیسرے حصے 'نویدِ برشگال' میں کیا ہے۔ سید کلب مصطفیٰ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نسیم کی یہ جرأت لوگوں کی نظر میں ایک بیباکانہ اقدام سمجھی جائے گی کہ انفرادی اور 'فرقہ جاتی' تنظیم کا پیغام سنانے میں وہ فرقہ پرستی کے مجرم ٹھہرائے جانے سے خوف زدہ نہیں

۱۸۔　ڈاکٹر ہلال نقوی، ارمغانِ نسیم، (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، حاشیہ، ص ۳۱۲

ہوئے اورانہوں نے اس حقیقت سے بھی اپنی بے نیازی کا ثبوت نہیں دیا کہ جغرافیائی
اعتبار سے وہی تنظیم مکمل اور پائیدار تنظیم کہے جانے کی مستحق ہے جس میں دیہی، قصباتی
اور شہری تنظیم کی تدریجی منزلیں طے کر کے مکمل فلاح و بہبود کا مقصد حاصل کیا جائے۔'[۱۹]

نظم کا چوتھا حصہ 'بارانِ رحمت' اپنے عنوان ہی سے اپنے مقصد کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ 'بارانِ رحمت' کسی بے عمل اور زندگی سے دور قوم یا کسی گروہ پر آسمان سے برسنے والی رحمت نہیں ہے بلکہ بارانِ رحمت کو نسیم نعمتوں کا ثمر قرار دیتے ہیں یہاں وہ پیغمبرِ آخر کو مصلحِ عالم، مجسمۂ انسانیت اور فلسفی و مفکر کے تعارف کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اوران کی زندگی کے چراغ سے نئے چراغ روشن کرنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن یہ محض ایک ناصحانہ اظہار نہیں ہے زندگی کی قوتوں کا حرارت بخش اظہار ہے۔ نظم کا آخری حصہ پاکستان رحمت، پوری نظم کا حاصل ہے۔ سید کلب مصطفیٰ اس کی وضاحت ان لفظوں میں کرتے ہیں:

'پاکستانِ عمل اس مسدس کا وہ آخری حصہ ہے جسے نسیم کی مسدس کا عطر کہا جا سکتا ہے...... محبت کی بیخودی میں ایک خیالی دنیا کی سیر، اوراس کی مخصوص عزم انگیز دلکشی اور 'پاکستان' کے وجود میں آنے سے پہلے پاکستان کی باعمل زندگی کا مرقع کچھ اس انداز سے نظم ہوا ہے کہ دل بے اختیار ایسی دنیا میں رہنے کی تمنا کرنے لگتا ہے...... یہ نسیم کے انداز کا کمالِ حسن ہے کہ انہوں نے اس آخری حصۂ نظم کو رسولؐ اسلام کے ذکر، ان کی ذہنی، وہبی، دینی اور دنیاوی ہر طرح کی خصوصیات کے اظہار، ان کی شجاعت، تواضع، مذاقِ عمل، تدبّر، علم، رواداری اوران کے ضابطہ، عامل اور غازی ہونے کے تذکرے اوران کے پیغام کے اس رُخ کو پیش کرنے کے بعد شروع کیا ہے کہ 'محبت سکھادی، عداوت بُھلادی، الخ'...... اس اسلوبِ بیان کا نتیجہ لازم یہی ہے کہ ہر مسلمان ایسی ہی دنیا کی خواہش کرے جہاں محبت ہو اور عداوت نہ ہو اور جس کے نتیجے میں سوئے ہوئے احساس جاگ اُٹھیں اور جاگے ہوئے فتنے سو جائیں۔ چنانچہ اس حصۂ نظم کی خیالی دنیا میں ان تمام صورتوں کو دکھایا ہے جو کسی واقعی ترقی یافتہ ملک میں ہونا چاہیے۔ مثلاً اسلامی مساوات، اغنیاء میں انکسار، فُقراء میں استغنا، محنت کی عظمت کے نقش دماغوں میں،

۱۹۔ مقدمہ 'برق و باراں' (لاہور: مست قلندر بک ڈپو، ۱۹۴۴ء) ص۱۰

تدبیر منزل کے ولولے، دلوں میں عروج وارتقا کا مادّہ ذہنوں میں۔'[۲۰]

برق وباراں کے مقدمہ نگار نے بہت تفصیل سے برق وباراں کی صفات کا اظہار کیا ہے جن میں چند اہم پہلو یہ ہیں۔ کیوں کہ اب یہ کتاب برق وباراں قطعاً نایاب ہے اس لیے بعض اقتباسات کا حوالہ ضروری ہے۔ یہ اقتباسات نسیم کی فکر کے ذیل میں بہت اہمیت کے حامل ہیں:

'سیاست کی خشک اور پیچ در پیچ دنیا کے علاوہ شعر کی تازہ اور ہموار فضا بھی ہے جو انسانی تصورات کو اپنے زور اور اثر سے عملی جامہ پہنا دیتی ہے۔ نسیم امروہوی نے اس ضرورت کو زیرِ نظر مسدس 'برق وباراں' کے ذریعے سے پورا کیا ہے جس سے نہ صرف مسلمانوں کے رجحانات اور میلانات پر غور وتعمق کی نگاہ رکھنے کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان کے امراض اور علاج کی تشخیص وتجویز اور صحت کے بعد کی پُر کیف زندگی کی شکل بھی نظر آ جاتی ہے۔'[۲۱]

'نسیم کو خوب معلوم ہے کہ انسان خود اپنی بد نظمی اور کمزوری کا ذکر سُن کر خوش نہیں ہوتا اور محض اپنی خامیوں کا علم، بلند آفرینی کے لیے بھی کچھ مفید نہیں ہوسکتا چنانچہ انھوں نے مخاطبت کا ایک اچھوتا انداز اختیار کیا ہے یعنی اپنی بد نظمی کا تذکرہ کرنے کے بجائے دوسروں کی تنظیم کے اصول بتا کر دماغ کو نہ صرف اپنی کمزوریوں کی طرف متوجہ کیا ہے بلکہ اس تصریح سے کہ یہ اصولِ تنظیم خود مسلمانوں کے بنیادی اصول ہیں جذبۂ افتخار کے ساتھ مصروفِ عمل ہونے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا ہے۔'[۲۲]

'حالی کو اصلاحی نظموں کی تصنیف میں اولیت کا مرتبہ حاصل ہے اور اس میں کلام نہیں کہ سادگی، طرزِ ادا اور دوسرے فنی و اصطلاحی محاسن سے قطع نظر، اصلاحی نقطۂ نگاہ سے مسلمانوں کے ارتقا میں مسدسِ حالی کا بڑا ہاتھ ہے اور جب تک دنیا ان مضامین کو جو اس مسدس کی نمایاں خصوصیت ہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے، حالی کا مرتبہ بلند ہی رہے گا۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں ہوسکتا کہ حالی نے اپنے زمانے کا لحاظ کر کے مسدس کہا تھا اور نسیم نے اپنی کاوش میں اپنے عہد کا خیال رکھا ہے۔ وہ قوم کا مرثیہ تھا اور یہ ملّت

۲۰۔ مقدمہ برق وباراں (لاہور: مست قلندر بک ڈپو، ۱۹۴۴ء)، ص ۱۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۵

۲۲۔ ایضاً، ص ۶

کا ترانہ' [۲۳]

یہ نظم جن پانچ حصوں پر مشتمل ہے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے سید وقار عظیم نے خلاصے کے طور پر یہ رائے دی ہے:

'تلاطم امواج، اس اضطراب اور انقلاب کی علامت ہے جس نے 'عصرنو' کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ 'برقِ خرمن' ان تخریبی عوامل کا استعارہ ہے جس کی بجلی نے ملّت کے گلشن کو خاکستر بنایا۔ 'نویدِ برشگال' بیداری کے اس احساس کی نشانی ہے جس نے ملّت کا رخ تعمیر کی راہوں کی طرف موڑا اور بالآخر یہی احساس بارانِ رحمت بنا اور تخریب کی خاک میں سے تعمیر کی کلیاں پھوٹیں اور کھل کر پھول بنیں، پاکستانِ رحمت اس مثالی سر زمین کا نقشہ ہے جس کی آرزو میں شاعر نے تخیل کی یہ عمارت تعمیر کی تھی۔ نظم جس شکل میں ہمارے سامنے ہے اس کی ایک معنوی اور صوری تجسیم حالی کے مسدس کی صورت میں ہو چکی تھی، حالی نے اپنے مسدس کی تعمیر و تشکیل جن جذباتی عوامل کے تحت کی تھی اس میں اقبال نے 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' کی صورت میں نئے رنگ بھرے اور نئے نقش اُبھارے۔ 'برق و باراں' کے مصنف نے جب اپنے مشاہدات و تصورات کو ایک قومی نظم کے سانچے میں ڈھالنے کا منصوبہ بنایا تو اس منصوبے کی تشکیل میں حالی اور اقبال کے مسدس اس کے رہنما بنے۔' [۲۴]

۲۷۹ بندوں پر مشتمل اس نظم کے بعض منتخب بند ذیل میں نقل کیے جا رہے ہیں تاکہ شاعر کے کلام کے براہ راست مطالعے سے ہمیں اس کی فکر کی صحیح سمتوں کا اندازہ ہو سکے۔ اس طویل نظم کی علامتوں میں آزادی، حریت اور کمزور قوموں کے عزائم کی تاریخ پوشیدہ نظر آتی ہے:

زمانے میں ایک انقلاب آ رہا ہے   دلِ ناتواں پر شباب آ رہا ہے
جمالِ سحر بے نقاب آ رہا ہے   اُبھر کر نیا آفتاب آ رہا ہے
اثر خوں میں رقصاں ہے چنگاریوں کا
مجسّم ہوا خواب بیداریوں کا

۲۳۔ مقدمہ برق وباراں (لاہور: مست قلندر بک ڈپو، ۱۹۴۴ء)، ص ۳

۲۴۔ نسیم امروہوی کی مرثیہ گوئی، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۷۴ء)، ص ص ۶۰، ۶۱

یہ ذوقِ عمل نے ہے قسمت جگائی   فقیروں نے کی ترک رسمِ گدائی
ضعیف و قوی میں ہے زور آزمائی   چھڑی ہے فلک سے زمیں کی لڑائی

زمانے کے کچھ کارخانے عجب ہیں
کہ سورج سے جگنو مُبارز طلب ہیں

عجب بحر و بر میں مچا ہے تلاطم   جنونُ و خِرد میں ہے باہم تصادُم
جھلکتا ہے اشکوں میں رنگ تبسّم   خموشی کے لب پر ہے شانِ تکلّم

ہر اک سانس بھاری ہے موجِ صبا پر
بگولوں نے کی ہے چڑھائی ہوا پر

تعاقب میں آندھی کے ذرّے ہیں جولاں   غُبارِ قدم ہے حریفِ بیاباں
ہواؤں سے بادل ہیں دست و گریباں   کنارے ہیں روکے ہوئے راہِ طوفاں

بپھرتے ہیں خرگوش شیروں کے بن ہیں
صفیں مورچوں نے جمالی ہیں رن میں

بجا ہے یہ دعویٰ، چراغوں کے لب پر   کہ ہستی میں ہم بھی ہیں تاروں کے ہمسر
شرارے جو شعلوں پہ ہیں حملہ آور   تو موجوں سے لڑتے ہیں قطرے مچل کر

اقلیتیں زور دِکھلا رہی ہیں
چٹانیں پہاڑوں سے ٹکرا رہی ہیں

حبابوں نے یوں اپنے تانے ہیں سینے   سمندر کو بھی آرہے ہیں پسینے
نئے ہیں جہانِ کُہن کے قرینے   کہ سیلاب پر ہنس رہے ہیں سفینے

جو مخفی تھے جوہر، وہ اب کُھل رہے ہیں
ترازو میں کوشش کی سب تُل رہے ہیں

ہر اک قوم ہے آج منزل کی جویا   عمل نے، نشاں جہل و غفلت کا کھویا
جو خوابیدہ بخت ایسے عالم میں سویا   تو سمجھو کہ اپنے کو اُس نے ڈبویا

تغیر، کشاکش کے ساتھ آگیا ہے
غنیمت ہے جو وقت ہاتھ آگیا ہے

یہی ہے سنورنے سُدھرنے کا موقع   چمکنے، دمکنے، نکھرنے کا موقع
نہیں چلتے چلتے ٹھہرنے کا موقع   ہر اک گام پر ہے اُبھرنے کا موقع
ہٹے اب جو راہِ تصادم سے بچ کر
وہ ساحل پہ ڈوبے، تلاطم سے بچ کر

زمانہ یہ آواز دیتا ہے پیہم   خبردار اے رہ نوردانِ عالم
نہ سو کر گنواؤ جہاں میں کوئی دم   وسیلہ ترقی کا ہے عزمِ محکم
مشیت عمل کا صِلہ دے رہی ہے
ہر اک قوم کا امتحاں لے رہی ہے

عمل سے ہے مربوط نظمِ دو عالم   ہر اک شعبۂ زندگی ہے منظم
ہر اک گام پر، گو، حوادث ہیں پیہم   ترقی کی رفتار ہوتی نہیں کم
لہو۔ جوش کچھ اس طرح کھا رہا ہے
کہ طوفان جیسے چڑھا آرہا ہے

برستے ہیں پیہم حوادث کے گولے   خودی کے ہیں پرچم دلیروں نے کھولے
مصائب کے شہباز، شہپر ہیں تولے   عُقابوں سے ٹکرا رہے ہیں ممولے
ہر اک قوم، کچھ کھو کے، کچھ پا رہی ہے
بقا۔ موت کی گود میں آرہی ہے

فضاؤں میں خونی حوادث ہیں مُضطر   بلاؤں کی چلتی ہے آندھی سراسر
اُگلتے ہیں کف، حادثوں کے سمندر   تلاطم سے جانباز لیتے ہیں ٹکر
ہر اک کو ریاضت کا پھل مل رہا ہے
مگر حسبِ عزم و عمل مل رہا ہے[۲۵]

زندہ قوموں کی بنیادی طاقت۔عزم وعمل

نسیم کے طویل مسدس برق وباراں کی فکر کا خاص نکتہ یہ ہے کہ پوری ترقی یافتہ دنیا میں ہر قوم کو اس کی محنتوں کا

۲۵۔ نسیم امروہوی، برق وباراں (لاہور: مست قلندر بک ڈپو، ۱۹۴۴ء)، ص ۳۴ تا ص ۳۷

ثمر اور ریاضتوں کا پھل ضرور ملتا ہے لیکن اس کے ملنے کا پیمانہ اس قوم کے افراد کے عزم وعمل کی صلاحیتیں ہوں گی۔ جو افراد یا جو قوم عزم وعمل میں جتنا آگے ہوگی اتنا ہی وہ عالمِ انسانیت میں سرخرو ہوگی۔ نسیم کی شاعری اور ان کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے وقار عظیم نے لکھا ہے:

'عمل کو زندگی کی ہر کامیابی کی اساس سمجھ کر ہر ممکن زاویے سے اس کی تائید کی گئی ہے۔'[۲۶]

نسیم کی تمام شاعری کو عمل اور تحریکِ عمل کی شاعری قرار دیتے ہوئے عبدالرؤف عروج لکھتے ہیں:

'نسیم امروہوی نے معاشرے کی اصلاح اور نوجوانوں کی ذہنی وفکری تربیت پر زور دیا ان کے نزدیک جب تک فکر میں تبدیلی پیدا نہ کی جائے لوگوں کے غور وفکر کا انداز نہ بدلا جائے کسی ترقی پذیر معاشرے کا پیدا ہونا اور صحت مند انقلاب کا آنا ممکن نہیں ان کے یہاں جدیدیت کا تصور، انارکی، انتشار، تخریب اور بربادی نہیں ان کی جدیدیت تاریخی، تہذیبی اور سماجی قدروں سے ابھرتی ہے۔ یہ پرانی بنیادوں میں نئی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا ماضی ہمیں کہیں مستقبل کی روشنی دکھاتا ہے اور کہیں اس کے سہارے ہم حال کی ارتقائی منزلیں طے کرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری عمل اور تحریک عمل کی شاعری بن گئی ہے۔'[۲۷]

برق وباراں میں ایک نئے مسلم معاشرے کی تشکیل کے پہلو

تحریکِ پاکستان کے پس منظر میں ان کی نظمیں، رباعیات اور مسدس زندگی کے ان پہلوؤں کو زیادہ اُجاگر کرتے ہیں جن میں ایک طرف عزم وعمل کی مسلسل تاکید ہے اور پھر اس عزم وعمل ہی کی خوبیوں میں وہ ایک نئے معاشرے کے خواب دیکھتے ہیں۔ برق وباراں میں ایک نئی مسلم سوسائٹی کی تشکیل کے مختلف تہذیبی وسماجی مراحل نظر آتے ہیں۔

اس مسدس میں مسلم قوم کی تعلیم وتربیت کے کئی پہلو ہیں جن میں عزم وعمل ہی کے سائے میں پروان چڑھنے والا سب سے بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کمزور اور لاغر قوم میں کس طرح مغرور اور جابر طاقتوں سے ٹکر لیں۔

۲۶۔ نسیم امروہوی کی مرثیہ گوئی، مشمولہ عرفان نسیم، (کراچی: انجمن سادات امروہہ، ۱۹۷۴ء)، ص ۵۵

۲۷۔ نسیم امروہوی کے مرثیے میں عمل اور تحریکِ عمل کے نئے پہلو، مشمولہ ایضاً، ص ص ۲۱۰، ۲۱۱

سامراجی اقتدار کے خلاف وہ شعری مثالوں سے کمزور افراد اور بے بس قوم کی ہمتیں اُجاگر کرتے ہیں:

......بگولوں نے کی ہے ہوا پر چڑھائی

......کہ سورج سے جگنو مبازر طلب ہیں

......چٹانیں پہاڑوں سے ٹکرا رہی ہیں

برق و باراں میں انہوں نے سیاست کے حوالے سے بھی اپنے نظریے کا اظہار کیا ہے:

سیاست کا مقصد نہیں خود فروشی

سیاست ہے احساس کی گرم جوشی

عمل اور ارادے کی ہنگامہ کوشی

نہیں حق سے زیبا کبھی چشم پوشی

تہی۔ عزمِ صادق سے گر، رہبری ہے

سیاست نہیں ہے، وہ بازی گری ہے

سیاست، جسے ہمارے ماحول اور غیر تعلیم یافتہ معاشرے میں خون خرابہ، قتل و غارت گری اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ کھولنے کا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے نسیم سمجھاتے ہیں کہ سیاست معاشرے کو ترقی کی طرف لے جانے کا ایک کتنا اہم ذریعہ ہے۔ انہوں نے اس مسدس میں یہ بات کہی ہے کہ سیاست کا مقصد خود فراموشی نہیں ہے بلکہ سیاست تو احساس کی گرم جوشی کا نام ہے۔ احساس میں گرم جوشی ہوگی اور دلوں میں ترقی کی طرف قدم اٹھانے کی حرارت ہوگی تو آدمی ہر زنجیر توڑ کر آگے نکل سکتا ہے۔ وہ ایک مسلم معاشرے کی تشکیل کے لیے انہی صداقتوں کو بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ نسیم کی پوری شعری ریاضت کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ بات واضح طور پر محسوس ہوگی کہ وہ پہلے گردو پیش کی زندگی پر غور کرتے ہیں، اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور پھر نتائج مرتب کرتے ہیں۔ 'برق و باراں' میں یہی پہلو سب سے زیادہ نکھر کر آیا ہے۔ سید وقار عظیم ان کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'گردو پیش کی زندگی کا مشاہدہ کرنے اور اس کا تجزیہ کر کے نتائج مرتب کرنے کی عادت نے اپنے عہد کے مسلمانوں کی زندگی کا جو نقشہ شاعر کو دکھایا ہے وہ اس کے لیے خلش و اضطراب کا باعث ہے، اس خلش و اضطراب کو جو حقیقت میں اس کے مخلصانہ احساسِ ملی کا نتیجہ ہے وہ اسے پوری ملت کی آواز، اور اضطراب بنانا چاہتا ہے کہ اس کے نزدیک

اس غم کا مداوا یہی ہے اس کی آرزو ہے کہ وہ ملت کے موجودہ انتشار کو مستقبل کی تعمیر کا پیش خیمہ بنائے برق وباراں کی تصنیف اسی ملی جذبے اور قومی احساس کے تحت عمل میں آئی ہے۔'[۲۸]

نسیم اپنی طبیعت کی گوشہ نشینی کی وجہ سے براہ راست عوامی تحریکوں میں شریک ہوکر شعر پڑھنے اور نظمیں سنانے والے شاعر تو نہیں تھے لیکن اس زمانے میں برق وباراں جیسے مسدس کی آواز ایک الگ تھلگ آواز ضرور تھی۔ ان کی نظمیں جوش ملیح آبادی اور اسرار الحق مجاز کی نظموں کی طرح عوام کے جلسوں میں تو نہیں گونج رہی تھیں لیکن ان نظموں میں جو طرزِ فکر تھا وہ سب ہی کے احساس کا ترجمان تھا۔ نسیم اس وقت جوش اور مجاز کی طرح اگر چہ نامور نہیں تھے لیکن اس سے ان کی جذبے کی صداقت کو اِن شعرا کے جذبے کی صداقت کے مقابلے میں کم نہیں کہا جاسکتا۔ ڈاکٹر طاہرہ نیرّ نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے:

'تحریک پاکستان نے اردو شاعری میں اسلوب و ہیئت کی اعتبار سے مستقل تبدیلی تو نہیں کی مگر مسلم عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا اس جدو جہد میں غالب حصہ ان شعرا کا بھی ہے جو بہت زیادہ نامور تو نہیں تھے مگر ان کے جذبے کی صداقت اور خلوص کی سچائی شاعری کے ہر مسلّمہ اعتبار سے برتر تھی۔'[۲۹]

رثائی نظموں میں نئی مملکت کے خواب

مقالے کے ساتویں باب میں ہم نسیم کی رثائی شاعری اور ان کے مرثیوں کا تفصیلی سماجی مطالعہ وتجزیہ کریں گے۔ یہاں بہت اختصار سے یہ تذکرہ ضروری ہے کہ انہوں نے اپنی رثائی نظموں میں بھی ایسے عنوانات پر زیادہ لکھا ہے جس سے ایک نیا ترقی یافتہ سماج اور ایک نئی مملکت کی تصویریں اُبھرتی نظر آتی ہیں 'سازِ حریت' (۱۹۳۸ء) کو اس بحث میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کراچی کے ایک اخبار کے ادبی گزٹ میں سازِ حریت کے بارے میں یہ نوٹ لکھا ہوا ہے:

'عین اس وقت جبکہ بھارت کی اکثریت جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے لیے انہیں آپس میں دست وگریباں کرنے کی سازش کر رہی تھی اور

۲۸۔ نسیم امروہوی کی سرثیہ گوئی، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۷۲ء)، ص ۱۰۱

۲۹۔ اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار (انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت اول، ۱۹۹۹ء)، ص ۶۸

مسلمان اس سیاسی چال سے بالکل بے خبر تھے ان سازشوں کونسیم صاحب نے اپنے
مرثیے سازِ حریت میں طشت از بام کیا اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہونے کے لیے
اُبھارا۔ان لیڈروں کی نجس سرگرمیوں سے بچنے کی طرف بھی قوم کو متوجہ کیا جو مسلمانوں کو
فروعی مسائل میں الجھا کر کمزور بنا رہے تھے۔اس کے بعد دوسری اخلاقی کمزوریوں سے
بھی آگاہ کیا جو ترقی کی راہ میں حائل تھیں مثلاً محنت و مشقت اور کسبِ معاش سے
غفلت،شادی بیاہ وغیرہ کی رسوم اور جہیز وغیرہ میں غیر ضروری مصارف۔" [۳۰]

نسیم کا یہ طرزِ احساس سازِ حریت ہی تک محدود نہیں ان کے اکثر مرثیوں میں یہ خیالات ملتے ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع کے تحت اپنے خیال کو آگے بڑھائیں قوم کی زندگی کے متعلق اس میں کوئی نہ کوئی تجزیہ یا کوئی نہ کوئی تبصرہ ضرور ملتا ہے۔

نظموں اور مرثیوں میں اصلاحی اور انقلابی طرز کے یہ خیالات وہ اس لیے نمایاں کرتے رہے کہ ان کے نزدیک ایک آزاد وطن کے لوگ اور ایک تعلیم یافتہ مسلم معاشرہ ان خوبیوں سے آراستہ ہونا چاہیے۔وہ ادبی،سیاسی،قومی،سماجی اور تہذیبی حوالے سے آزاد مملکت میں ایک نئی زندگی دیکھنے کے خواہاں رہے۔

نسیم کا طرزِ فکر بحیثیت ایک پاکستانی ادیب وشاعر

مقالے کے پہلے باب میں نسیم کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم نے ان کی نسلی شرافت، کردار کی بلندی، اخلاق وانکسار،علم سے محبت اور سادگی و خاکساری کے کئی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔یہ ایسی صفات ہیں جو ان کی شخصیت سے جدا نہیں۔نسیم جب امروہہ سے لکھنؤ، رامپور، میرٹھ اور نوگانواں میں آ کر آباد ہوئے تو ہر علاقے کے لوگوں نے انہیں دل میں جگہ دی اس کی بڑی وجہ نسیم کی انسان دوستی اور عوام وخواص سب سے یکساں تعلق رکھنے میں تھی۔چنانچہ یہی جذبات اور یہی اثرات ہم اُس وقت بھی دیکھتے ہیں جب وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔سندھ کے ایک بزرگ دانشور پیر سید حسام الدین راشدی لکھتے ہیں:

"نسیم صاحب جب یہاں پہنچے تو خیر پور میں جا کر بود و باش اختیار کی اور اپنی شرافتِ نسبی
اور فضائلِ شخصی کی وجہ سے پناہ گیرا (یہ لفظ ۱۹۴۷ء میں ہندوستانیوں کے لیے بولا جاتا تھا
جو بعد میں ختم ہو گیا) نہیں بنے بلکہ زمین و مکان کے علاوہ خیر پور کے باشندوں نے اپنے

۳۰۔ اس دور کے مشہور فرہنگ نویس مشمولہ روزنامہ حریت،۱۹/اپریل ۱۹۶۹ء،ص ۶

دلوں میں آپ کو جگہ دی جو شرف بہت ہم کم حضرات کو نصیب ہوا۔'[۳۱]

نسیم صاحب جب پاکستان کے شہری ہو گئے اور ان کی قومیت پاکستانی کہلائی جانے لگی تو انہوں نے اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے بھی اس پورے معاشرے کو اپنے احساس کا حصہ بنایا۔ ہر ملک کی ایک اجتماعی سوچ اور ایک اجتماعی مزاج ہوتا ہے۔ پاکستان کی بھی ایک اجتماعی سوچ اور اجتماعی ذ ہنیت کہی جائے گی۔ نسیم اس اجتماعی ذ ہنیت کو سمجھنے والوں میں تھے۔ سوال یہ ہے کہ کسی ملک کی اجتماعی ذ ہنیت کسے کہا جائے گا؟

علامہ جمیل مظہری کے لفظوں میں ہم اسے اس طرح سمجھ سکتے ہیں:

'ایک ملک کی اجتماعی ذ ہنیت دوسرے ملک سے جداگانہ ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حالات جن سے ذ ہنیتیں بنتی اور بگڑتی ہیں ہر جگہ یکساں نہیں ہوتے کچھ اثرات جغرافیائی فضا کی بدولت مرتب ہوتے ہیں، کچھ ادبی ماحول اور سیاسی میراث کی بنا پر یہی مختلف اثرات مل جل کر ایک ملک کی اجتماعی ذ ہنیت کے معمار ہوا کرتے ہیں۔'[۳۲]

نسیم نے اس اجتماعی ذ ہنیت سے جو نئی جغرافیائی فضا، یہاں کے ادبی ماحول اور سیاسی میراث سے مل کر تعمیر ہوئی تھی نئی مطابقتیں پیدا کیں۔ انہوں نے پاکستان میں جو ادب تخلیق کیا وہ انہی حقیقتوں کا غماز ہے۔

اس مرحلے پر ضروری ہے کہ ہم ادبی تحریروں میں کی گئی اس بحث کو بھی سمیٹتے چلیں کہ پاکستانی ادب سے ہماری کیا مراد ہے؟ اپنے ایک تحقیقی مقالے میں پاکستانیت کے حوالے سے راقمہ سطور نے جو کچھ لکھا تھا اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

'پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سنجیدہ سیاسی و ادبی حلقوں میں اس گفتگو کا آغاز ہوا کہ پاکستانیت سے کیا مراد ہے؟ پاکستانی تہذیب کیا ہے؟ پاکستانی ثقافت کیا ہے؟ پاکستانی ادب کیا ہے؟ اور پھر یہ بھی کہ پاکستانی ادب کیوں ہو؟ اس موضوع پر فراق گورکھپوری، ڈاکٹر آفتاب احمد خان اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے درمیان بہت دنوں تک بحث جاری رہی۔ اس سلسلے کے ایک نمایاں مبلغ پروفیسر محمد حسن عسکری تھے جو جمیل

۳۱۔ نسیم صاحب کو جیسا میں نے پایا، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۷۴ء) ص ۱۳

۳۲۔ منشوراتِ جمیل مظہری حصہ دوم (پٹنہ: اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء) ص ۱۲

الدین عالی کے پہلے مجموعے 'غزلیں، دوہے گیت' کے دیباچہ نگار ہیں۔انہوں نے ادبی سطح پر قومیت کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، سلیم احمد، ڈاکٹر صمد شاہین، ممتاز شیریں اور سجاد باقر رضوی وغیرہ نے ان سوالوں کے متعلق کئی مضامین لکھے۔اس سلسلے میں زیادہ اہم مباحث فیض احمد فیض اور ڈاکٹر وزیر آغا کے ہیں۔' ۳۳؎

ادیبوں اور نقادوں میں یہ بحث بہت بعد تک یعنی ہمارے عہد تک بھی جاری رہی کہ پاکستانی ادب کیا ہے اور پاکستانی ادیب وشاعر کون ہیں؟ اس ذیل میں چند تحریروں کے اقتباسات ہم دیکھتے چلیں:

'پاکستانی ادب کوئی اصطلاح نہیں ہے اس سے مراد صرف وہ ادب ہے جو پاکستان میں لکھا جارہا ہے۔' ۳۴؎ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

'پاکستان میں رہنے والا ہر شاعر جو اپنے ماحول، معاملات، محسوسات، تجربات، مشاہدات اور اپنے منظر ناموں کو اپنے ادب کا حصہ بناتا ہے وہ پاکستانی شاعر ہے۔' ۳۵؎ ضیاء جالندھری

'میں اُسے پاکستانی ادب کہتا ہی نہیں جو ایسی افراد لکھتے ہیں جنہیں پاکستان سے نہ تو ہمدردی ہے اور نہ کوئی لگاؤ ہے۔' ۳۶؎ ڈاکٹر وحید قریشی

'پاکستانی ادب وہ ہے جسے پاکستانی ادیبوں نے تخلیق کیا ہے اور جس میں پاکستان کی روایت، حالات، تہذیب وثقافت، پس منظر اور پیش منظر سے مکمل مطابقت موجود ہے۔' ۳۷؎ پروفیسر غفور شاہ قاسم

نسیم امروہوی اور دوسرے وہ ادیب وشاعر جو ۱۹۴۷ء کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آئے ان کے فکر وخیال کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ احساس کی دنیا ایک ایسی

۳۳۔ مہرالنساء عزیز، جمیل الدین عالی کی تحریروں میں پاکستانیت (کراچی یونیورسٹی: پاکستان اسٹڈی سینٹر، اشاعت مارچ اپریل ۲۰۰۰ء)، ص ۲۹

۳۴۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، احوال وآثار (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)، ص ۲۹۵

۳۵۔ حسن رضوی، انداز گفتگو، ضیاء جالندھری سے انٹرویو (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۷۱

۳۶۔ حسن رضوی، گفت وشنید، ڈاکٹر وحید قریشی سے انٹرویو (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۴۷

۳۷۔ پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء سے تا حال (لاہور: بک ٹاک، ۱۹۹۵ء)، ص ۳۳

دنیا ہوتی ہے جو اچانک کسی نئی تہذیب اور نئے جذبے کو نہیں اپنا لیتی اس کے لیے قلم کار کے ذہن کو بہت سی منزلیں طے کرنا ہوتی ہیں۔ تب جا کر اُس کی ادبی تخلیق اس کی صداقت کا اظہار ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں:

'ادب پیچیدہ عملِ تخلیق ہے وہ مشین سے نکلا ہوا پلیٹ فارم ٹکٹ نہیں اور نہ بٹن دبانے سے وجود میں آتا ہے اس کے لیے فرد کو اپنی ذات اور اپنے ماحول میں نئی مطابقتیں قائم کرنا ہوتی ہیں۔'[۳۸]

لیکن ان نئی مطابقتوں کا مطلب یہ نہیں لینا چاہیے کہ ادیب نے اپنے ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ دانشوروں اور اہلِ قلم شخصیتوں کا ایک ذہنی سفر ہوتا ہے۔ جس میں ماضی، حال اور مستقبل سب ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں نسیم ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۷ء میں وفات پائی یعنی ۷۹ برس ان کی عمر ہوئی ۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان آ گئے تھے اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ۴۲ سال ہندوستان میں اور ۳۷ سال پاکستان میں گزارے۔ ان کی ۳۷ سال کی وہ زندگی جو پاکستانی سماج میں گزری کیا اسے ۴۲ سالوں کی گذشتہ زندگی سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے؟ یقیناً نہیں دیکھا جا سکتا ان کے پورے ذہنی سفر کو ان کی پوری زندگی ہی کے آئینے میں دیکھنا چاہیے یہ کسی بزنس مین، کسی صنعت کار یا کسی زمیندار کی زندگی کا سفر نہیں یہ ادیب کی زندگی کا سفر ہے۔

ڈاکٹر حسین محمد جعفری 'پاکستانی معاشرہ اور ادب'[۳۹] کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

'ادب اقتصادیات نہیں جہاں ایک پانچ سالہ منصوبہ ختم ہو کر دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ ادب سیاست نہیں جہاں کامیاب ہونے والی سیاسی پارٹی کا منشور ہارنے والی پارٹی کے منشور کو حرفِ غلط کی طرح محو کر دیتا ہے ادب صرف رزمیہ تاریخ بھی نہیں جہاں ایک چیپٹر ختم ہوتا اور دوسرا شروع ہو جاتا ہے ادب تو انسانی جذبات، حالات، کیفیات کا ایک ملا جلا امتزاج ہے پاکستانی ادیب نہ تو ماضی سے رشتہ توڑ سکتا ہے نہ حال کو نظر انداز کر سکتا ہے۔'

نسیم امروہوی اور ان کے ہم عصر جو بیسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے اور اس صدی

۳۸۔ عصرِ حاضر کے تقاضے اور ادیب مشمولہ فنون، لاہور، شمارہ دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۲۸

۳۹۔ مرتبین ڈاکٹر حسین محمد جعفری، احمد سلیم (کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی، اپریل ۱۹۸۷ء) ص ۸

کے آخری دو یا تین عشروں تک زندہ رہے ان کی نظروں میں اس صدی کے مسائل زیادہ رہے ان افراد نے برصغیر کی زندگی کے تمام نشیب و فراز دیکھے فیوڈل سسٹم نے سماج کو جس طرح معاشی بدحالی کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا وہ ان کے مشاہدے میں تھا۔ مسلمان گھرانوں میں تعلیم کے نئے رجحانات ان کے سامنے تھے۔ عالمی جنگوں کی تباہ کاریاں ان کے پیش نظر تھیں۔ نسیم امروہوی جنہوں نے اپنی طویل نظم برق دباراں میں پاکستان کا ایک مثالی خاکہ بنایا تھا اور ایک ترقی یافتہ مسلم معاشرے کی تصویر ان کی نظموں اور مضامین میں اُبھری تھی وہ تصویر جب پاکستان میں دھندلی دھندلی نظر آئی تو انہوں نے اپنی تحریروں میں برملا اس کا اظہار بھی کیا۔ سہ روزہ اخبار 'مراد' کے بعض اداریوں میں ان کے یہ جذبات اور خیالات دیکھے جاسکتے ہیں:

'کیا یہی وہ خوشحال پاکستان ہے جس کے لیے ہماری دعاؤں میں وہ گداز پیدا ہوگیا تھا جو سوز و گداز اپنے اور اپنے بچوں کے لیے خدا سے کچھ طلب کرنے میں پیدا نہ ہوسکا۔ کیا یہی وہ جمہوری ملک ہے جس کے لیے ہم نے انگریزوں کی آمریت سے ٹکر لی۔ کیا یہی وہ اسلامی مملکت ہے جہاں مذہب کے نام پر قتلِ عام کیا جاتا ہے، کیا یہی وہ اخوت و مساوات کی سرزمین ہے جہاں جاگیرداروں اور ملاؤں کے سازشی گٹھ جوڑ نے ایک عام پاکستانی کی زندگی کو افلاس و غربت کی پستیوں میں دھکیل دیا ہے۔ ادیب و شاعر اگر واقعی حساس ہوتے ہیں تو انہیں اس غیر عادلانہ نظام کے خلاف قلمی جہاد کرنا چاہیے'۔[۴۰]

یہ اپنے وطن اور اپنی سرزمین سے بغاوت کی تعلیم نہیں ہے بلکہ غیر عادلانہ نظام کے خلاف قلمی جہاد کا یہ اعلان دراصل حکومتوں اور اس کے زیر اثر اور زیرِ انتظام اداروں کی غلط پالیسیوں سے پیدا ہونی والی خامیوں اور خرابیوں کی نشاندہی کرنا ہے۔ پاکستان کے باشعور اور وطن دوست اہلِ قلم اور اہلِ فکر کا یہی طرزِ فکر رہا ہے ہوش مند ادیبوں اور محبِ وطن دانشوروں کی اپنے ملک سے محبت کے تقاضے دوسرے ہوتے ہیں ان کی تنقید ان کی وطن دوستی ہی کا ایک سبب ہوتی ہے وہ کیونکہ حقائق سے آنکھ چرانا نہیں چاہتے اس لیے اُن کے افکار میں عام آدمی کو ایک تلخی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ نسیم نے جس غیر عادلانہ نظام کے خلاف قلمی جہاد کرنے پر اہلِ قلم کو مائل کیا ہے وہ قائداعظم کے پاکستان سے محبت ہی کی ایک دوسری تصویر ہے۔ قائداعظم کے مشن اور ان کی رہبری اور رہنمائی کو نسیم نے جس طرح دیکھا ہے اس کا اندازہ ان کی نظم 'قائداعظم جناح' کے ان اشعار سے بخوبی کیا جاسکتا ہے:

۴۰۔ اداریہ 'مراد' (خیرپور) اشاعت ۱۷تا۱۹/اپریل ۱۹۵۹ء، ص۲

حشر تک ہے فاتح ابواب عظمت اس کا نام — فاتحِ ابواب عظمت قائداعظم جناح
حشر تک ہے ہمت افزائے جماعت اس کی یاد — ہمت افزائے جماعت قائداعظم جناح
حشر تک ہے پیکرِ اجلال وقوت اس کا نقش — پیکرِ اجلال و قوت قائداعظم جناح
حشر تک ہے محفل افروزِ سیاست اس کی شمع — محفل افروزِ سیاست قائداعظم جناح
حشر تک ہے شارحِ اسرارفطرت اس کا رمز — شارحِ اسرار فطرت قائداعظم جناح

حشر تک ہے فتح ونصرت کی علامت اس کا قول
فتح و نصرت کی علامت قائداعظم جناح

تو ہے پاکستان کا بانی بہ افضالِ خدا — پاک باطن پاک سیرت قائداعظم جناح
حشر تک عقدہ کشائے زندگی تیرا پیام — سائل فیض رسالت قائداعظم جناح
ہم تری اس سرزمین پاک و طاہر کے امیں — یہ زمیں تیری امانت قائداعظم جناح
یاد صد سالہ منائے سے کوئی حاصل نہیں — ہر صدی تیری ودیعت قائداعظم جناح

تو ہماری بے بہا تاریخ کا روای رہا
اور ہم تیری روایت قائداعظم جناح[۴۱]

نسیم کے ان کے جذبات میں قائد کی قائدانہ عظمت کا جواعتراف ہے وہ بہت روشن ہے لیکن قائد کے پاکستان میں رائج نظام پر وہ معترض رہے ہیں۔اس سرزمین کے رہنے والوں کو وہ یہ تلقین کرتے رہے:

تنگ دل قوم جو ہو جذبۂ حق سے خالی
خاک پائے گی زمانے میں مقام عالی
ہاں وہ تھوڑی سی جماعت جو ہے جرأت والی
اُس کی ٹھوکر سے ابھرتی ہے بلند اقبالی[۴۲]

پاکستان کے معروف دانشور سید سبط حسن کی یہ رائے نسیم کے اُس قلمی جہاد کی توثیق کرتی ہے جو غیر عادلانہ نظام کے خلاف تھا:

'پاکستان بننے کے بعد بلکہ یوں کہیے کہ قائداعظم کی وفات کے بعد کرسیِ اقتدار کی جنگ

۴۱۔ مشمولہ 'اردونامہ' (سہ ماہی)، کراچی، ترقی اردو بورڈ، شمارہ ۵۴، اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۴

۴۲۔ دل گنے جاتے ہیں میدان میں تعداد نہیں، نظم 'مشمولہ' اردونامہ' شمارہ جولائی تا ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۲

نے شدّت اختیار کی اور مالِ غنیمت کی تقسیم میں وہ سر پھٹول ہوئی کہ نوجوانوں نے درخشاں مستقبل کے جو خواب دیکھے تھے اور خوش حالی کے جو رنگ محل بنائے تھے وہ ایک ایک کر کے مسمار ہو گئے۔'[۴۳]

تحریکِ پاکستان میں اہلِ قلم کی کوششوں اور ان کے کردار سے بحث کرتے ہوئے ظفر محی الدین اپنے ایک تجزیے میں لکھتے ہیں:

'جب ہم تحریک آزادی اور حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں اہلِ علم وقلم کے کردار کے عنوان کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں اس خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ سرسید احمد خان اور ان کے رفقا سمیت علی گڑھ تحریک کے داعی اہلِ علم وقلم نے انتہائی نامساعد حالات اور سہ طرفہ مخالفت کے باوجود انتہائی خلوص اور مستقل مزاجی سے اپنی تحریک اور جدوجہد جاری رکھی جس میں سیاست، ادب، مذہب، فلسفہ منطق، اخلاقیات اور اعتدال پسندی کا حسین توازن نظر آتا ہے۔ مگر جب ہم منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد اور پھر ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سوائے ندامت، تاسف اور افسردگی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا کہ ہم اپنے رہنماؤں کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھنے کے بجائے اپنے دامن میں شرمندگی کے آنسو سمیٹ رہے ہیں۔ اس کی صرف اور صرف یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنے عظیم رہنماؤں کے افکار اور ان کی بے لوث جدوجہد کو فراموش کرتے ہوئے علم اور ادب، منطق اور فلسفہ، دلیل اور مکالمے کی اہمیت کو نظر انداز کر کے جذبات پرستی، مفروضات تعصّبات اور تنگ نظری کے رویوں کو گلے لگا لیا ہے۔'[۴۴]

نسیم نے جس غیر عادلانہ نظام کے خلاف قلمی جہاد کا اظہار کیا ہم اسے ان کی وطن دوستی ہی کا ایک تسلسل سمجھتے ہیں یہ قلمی جہاد مملکت سے وفاداری ہی کی ایک شکل ہے یہاں ہمیں حکومت اور مملکت کے فرق کو ذہن میں رکھنا ہوگا احمد ندیم قاسمی نے ۱۹۸۰ء میں اہلِ قلم کانفرنس (اسلام آباد) کے کلیدی خطبے میں جس بنیادی نکتے کا اظہار کیا تھا اس کا ذکر یہاں ضروری ہے وہ کہتے ہیں:

۴۳۔ نئی نسل کا ماحول، مشمولہ، پاکستانی ادب، شمارہ ۱۸، ۱۹/ جون جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۶۲، ۶۳

۴۴۔ تحریکِ پاکستان میں اہلِ قلم کا کردار، مشمولہ قومی زبان، کراچی، شمارہ دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۳۴، ۳۵

’قیام پاکستان کے فوراً بعد ادیب اور حکومت، ادیب اور ریاست، ادیب اور مملکت، ادیب اور وطن کے عنوانات کے تحت روزناموں، ہفت روزوں اور ادبی جریدوں میں ایک بہت طویل اور ہمہ گیر بحث کا آغاز ہوا تھا، البتہ حکومت کے مقابلے میں مملکت ایک قائم و دائم حقیقت ہے اور اس کا قیام اور دوام، ادیب کا ایمان ہے اور ایمان بدلا نہیں کرتے۔ ہم ادیبوں کو فخر اور اصرار ہے کہ ہم کسی حکومت کے ترجمان کبھی نہیں رہے۔ ہم صرف اپنی مملکت اور اہلِ مملکت کے ترجمان ہیں۔‘[۴۵]

محمد حسن عسکری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

’ادیب خواہ کوئی نقطہ نظر پیش کرے سچ اسے ہر حال میں بولنا ہی پڑے گا۔ ادیب کی قومی خدمت یہ نہیں ہوتی کہ وہ جھوٹ سچ ہر طرح اپنی قوم کی حمایت کیے چلا جائے اس کی خدمت تو بس یہی ہے کہ اس کی قوم کو کوئی سخت مرحلہ درپیش ہو تو وہ اپنی تحریروں سے عوام میں یقین و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرے۔‘[۴۶]

تحریکِ پاکستان، قیامِ پاکستان اور ترقیِ پاکستان کے پس منظر میں نسیم کی شاعری اور ان کی نثری تحریروں کو محمد حسن عسکری کے اس نقطۂ نگاہ کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اس کے پیچھے ایک سچے، پُرخلوص اور وطن دوست ادیب و شاعر کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔

۴۵۔ ادیب و مملکت، مشمولہ ماہنامہ زاویہ، نیویارک، مارچ ۲۰۰۴ء، ص ۱۰

۴۶۔ فسادات اور ہمارا ادب، مشمولہ، سہ ماہی، ذہنِ جدید، نئی دلی، شمارہ فروری ۱۹۹۴ء، ص ۹

چوتھا باب

بچوں کا ادب اور سماجی اقدار کی تقسیم

- پس منظر
- پھولوں کا ہار
- چراغِ زندگی
- ہنسوں کی رانی اور دیگر طیور
- کوہِ نور ریڈر (۸ حصے)
- اردو ادب (۸ حصے)
- گلزارِ نسیم
- نسیمِ اردو (۸ حصے)
- بچہ سماجی ضرورت کے تحت زبان سیکھتا ہے
- مختلف عمر کے بچوں کے لیے نسیم کا اسلوب
- بچوں میں ادب کی تعلیم کا سماجی و تہذیبی پہلو
- سماج میں اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت
- بچے کا ذہنی سفر، مقامی سماج سے عالمگیر سماج تک
- عہدِ طفلی بھی عجب عالمِ القائی ہے

چوتھا باب

بچوں کا ادب اور سماجی اقدار کی تقسیم

پس منظر

ادب بنیادی طور پر انسان کے مطالعے کا دوسرا نام ہے اور جب انسان موضوعِ گفتگو ہے تو پھر خیر و شر، نیکی و بدی، نفرت و محبت، سچ اور جھوٹ، ریا کاری اور وفاداری کے سب ہی جذبات اس کے موضوعات کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔ ادب بڑوں کے لیے تخلیق کیا جائے یا بچوں کے لیے یہ سارے پہلو اس میں نظر آئیں گے لیکن سماجی ارتقا اور انسانی نفسیات کے پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو بچوں کے لیے تخلیق کیا جانے والا ادب اس لیے زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کہ کسی بھی سماج یا کسی بھی قوم کے مستقبل کا انحصار بچوں کی اس نسل پر ہوتا ہے جو کمسنی سے نکل کر سوجھ بوجھ اور شعور کی منزلوں میں داخل ہونے لگتی ہے۔

نسیم امروہوی کی ادبی خدمات کا ایک قابل ذکر حصہ بچوں کے ادب پر مشتمل ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے سماجی مطالعہ میں اس کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ بچے کی شخصیت کی تعمیر قوموں کی آئندہ تعمیر کا ایک ذریعہ ہوتی ہے نسیم امروہوی نے اس تمام ادبی سرمائے میں جو انہوں نے بچوں کے لیے تخلیق کیا اس پہلو کو انتہائی اہمیت دی ہے قبل اس کے کہ بچوں کے ادب کے حوالے سے ہم ان کے افکار اور سماج میں ان کی قدر و قیمت کا مطالعہ کریں پہلے ہم اردو میں بچوں کے ادب کا ایک مختصر جائزہ لے لیتے ہیں تا کہ اپنے موضوع سے متعلق لکھتے ہوئے ہم ایک پورے پس منظر کے ساتھ آگے بڑھیں۔

مجیب ظفر انوار حمیدی بچوں کے ادب پر لکھتے ہوئے اپنی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں:

'ادیب بھی انسانوں کی طرح بچپن کے دور سے گزرتا ہے۔ وہ بھی شروع شروع میں

کہانیاں بڑے شوق سے سنتا ہے اور دوسروں کو سناتا ہے مگر اردو کو یہ زمانہ ہی نہیں ملا۔ اسے ابتدائی دور میں ہی جن شاعروں اور ادیبوں سے سابقہ پڑا، وہ اکثر و بیشتر خود دوسری زبانوں کی عظمت اور بزرگی سے واقف اور اس کے دلدادہ تھے اور اسی بزرگی کے حامل بھی تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب ہمارے ادیبوں نے ادھر کا رخ کیا تو چند خیالی کہانیوں کے سوا اور کچھ نہیں لکھا۔ یہ کہانیاں بہت دلچسپ ہونے اور ایک حد تک خیالات کو وسعت دینے کے باوصف زیادہ تعداد میں نہ لکھی گئیں۔ اردو میں بچوں کے ادب کی کمی کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ایسا ادب لکھنے کے لیے جس قدر جانکاہی اور غور و فکر کی ضرورت ہے اور اس کے ان تمام مطالبات کو جو انتہائی نازک اور مشکل ہیں، پورا کرنے کی شرط ہے، اس کی طرف ہمارے ادیبوں نے بہت کم توجہ دی ہے۔ بہر حال اس تمام کامیابی کے باوجود اردو میں بچوں کے ادب کا ایسا قحط بھی نہیں ہے کہ ہم اس کا سرسری جائزہ نہ لے سکیں۔"[۱]

دیکھا جائے تو صرف اردو ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان میں بچوں کے ادب کا ایک تحریری آغاز تو اس لوری سے ہوتا ہے جسے بچہ پہلے پہل ماں کی آغوش میں سنتا ہے اور پھر یہی لوری ذرا آگے بڑھ کر چندا ماموں کے ایک والہانہ لہجے میں ڈھل جاتی ہے۔ بچے کے لیے روشن اور چمکتا ہوا چاند زندگی کی ایک علامت بن کر سامنے آتا ہے یہ چندا ماموں اگرچہ بہت دور ہیں لیکن بچے کے احساس سے بہت قریب ہوتے ہیں پروفیسر وہاب اشرفی نے لکھا ہے:

"آسمان پر ابھرا ہوا چاند اردو شاعروں کی توجہ کا مرکز تو رہا ہی ہے بچوں کے حیرت واستعجاب کا مرکزی نکتہ بھی رہا ہے چاند کو ماموں کہنا کسی منطق کے تحت کہنا دشوار ہے لیکن ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ چاند روشنی، ٹھنڈک اور سکون کا باعث ہے ہر چند کے دور ہے ماموں جو رشتے میں بہت قریب ہے ماں کے واسطے سے خاصا اہم ہے وہ دور بھی ہے گا ہے گا ہے آتا بھی ہے۔"[۲]

ماں کی ممتا اور اس کے لہجے کی گنگناہٹ سے جنم لینے والی یہ لوریاں ہی بچوں کے ادب کا ایک

۱۔ ابن انشاء اور بچوں کا ادب، مشمولہ' ماہنامہ قومی زبان' شمارہ اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ۶۵

۲۔ اردو میں لوک ادب کی روایت، مشمولہ' اردو میں لوک ادب' مرتبہ پروفیسر قمر رئیس (نئی دہلی: دی لکشمی پریس، جنوری ۱۹۹۰ء)، ص ۳۸

پہلا غیر تحریری سرمایہ ہیں۔ اردو زبان وادب کی تاریخ میں بچوں کے لیے لکھی جانے والی تحریروں کا آغاز قصے کہانیوں کے عہد سے شمار کیا جاسکتا ہے۔ داستانوں کی مافوق الفطرت کہانیوں میں بچوں کی دلچسپی کے بھی پہلو تھے۔ شہزادوں اور جنوں، بھوتوں کی یہ کہانیاں جو وہ اپنے گھر کے بزرگوں سے سنا کرتے تھے آج ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے واقعات ہماری زندگی سے کوئی ربط نہیں رکھتے اور اب سائنس کی ترقی نے تو بالکل کایا پلٹ دی۔ بچے کمپیوٹر کے عہد میں داخل ہو چکے ہیں تو اب پریوں، فرشتوں، شہزادوں اور جنات کی کہانیوں سے کیا لینا۔ جن میں نہ حقیقت ہے نہ صداقت بس مافوق الفطرت واقعات و کردار ہیں۔ معروف دانشور سید سبط حسن نے ایسے اعتراضات کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

'جن پریوں کی کہانیوں کا مقصد مافوق الفطرت ہستیوں کو منوانا نہیں تھا بلکہ ان کہانیوں کے ذریعے سماجی اور اخلاقی اقدار کے اوصاف اور محاسن ذہن نشین کیے جاتے تھے بچوں کو داستانوں کے پیرائے میں بچپن ہی سے یہ بتایا جاتا ہے کہ شجاعت، خدا ترسی، مہمان نوازی، مہم جوئی، راست بازی اور حق پرستی اچھی صفتیں ہیں اور ان اوصاف کو اپنا کر انسان سرخرو اور کامیاب ہوتا ہے اس کے برعکس مردم آزاری، ظلم و تشدد، قتل و غارت گری، بری باتیں ہیں ان سے آدمی ذلیل و ناکام ہوتا ہے چنانچہ ان کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی اور سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ ہزاروں آفتیں جھیلنے اور لاکھوں بلاؤں میں مبتلا ہونے کے بعد آخر میں فتح انسان ہی کی ہوتی ہے۔' [۳]

یہ ضرور ہے کہ داستانوں میں زبان و بیان کی سطح اتنی بلند ہوتی تھی کہ بچے کا ذہن اسے مکمل نہیں سمجھ سکتا تھا۔ واقعے میں جو دلچسپ پہلو تھے بچے اسے اپنے بڑوں سے سن کر لطف اندوز ہو جاتے تھے لیکن وہ براہِ راست ان واقعات کو پڑھ سکیں ایسا ممکن نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ جس میں ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی کی نثری تحریریں اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں منظر عام پر آئیں بچوں کے ادب کا دورِ آغاز کہا جاسکتا ہے حامد حسن قادری نے ڈپٹی نذیر احمد کا یہ قول نقل کیا ہے:

'میں بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں، ڈھونڈا، تلاش کیا کہیں پتہ نہ لگا ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں بڑی لڑکی

۳۔ ادب اور روشن خیالی، مرتب سید جعفر احمد (کراچی: مکتبۂ دانیال، اکتوبر ۱۹۹۰ء)، ص ۴۷

کے لیے مراۃ العروس، چھوٹے کے لیے منتخب الحکایات، بشیر کے لیے چند پند۔'[۴]

انیسویں صدی کے آخری دور کے تذکرے میں ڈاکٹر اسد اریب لکھتے ہیں:

'اس دور کے تین اہم مصنفین ہیں جنہوں نے بچوں کے لیے نثر لکھی اور تعلیمی نظر سے عمدہ انتخاب کیا ان مصنفوں میں مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ اور اسمٰعیل میرٹھی ہیں اردو زبان کی کتابوں کا سب سے مشہور سلسلۂ کتب اسمٰعیل میرٹھی کا ہے۔'[۵]

بچوں پر کتابوں کے ساتھ، اخبارات کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے:

'بچوں کے لیے پہلی بار جو اخبار منظر عام پر آیا وہ منشی محبوب عالم کا پیسہ اخبار تھا جس میں بڑے ادیب تو بچوں کے لیے لکھتے ہی تھے بچوں کی تحریروں کو بھی اس میں جگہ دی جانے لگی۔ ۱۹۰۲ء میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔'[۶]

بیسویں صدی میں سائنسی اور تہذیبی ارتقا کے سبب ایک نیا سماج ہمارے سامنے آیا اس دور میں بچوں پر اقبال کی نظمیں ایک نئی زندگی کی علامت لے کر آئیں سماجی شعور کے بڑھ جانے کی وجہ سے زندگی کا ڈھانچہ بھی تبدیل ہوا ایک طرف عورت کو بھی معاشرے میں مقام دیا جانے لگا دوسری طرف بچوں کو بھی زندگی اور سماج کے سفر میں اہمیت دی جانے لگی۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی نے اس بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

'انیسویں صدی عیسوی میں سائنس اور علمِ نفسیات نے تیزی سے ترقی کی۔ جدید سائنسی ایجادات اور انکشافات سامنے آئے۔ بچے کے احساسات، جذبات اور نفسیاتی رجحانات کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی۔ بچے کو ایک اکائی تسلیم کیا گیا۔ بیسویں صدی میں سماج میں بچے کی ایک حیثیت تسلیم کی گئی۔ اسی سبب بچوں کے ادب کا تصور بیسویں صدی میں ہی ابھر کر سامنے آیا۔'[۷]

۱۹۰۸ء جو نسیم امروہوی کا سنِ ولادت بھی ہے اس اعتبار سے بھی بچوں کی ادبی دنیا میں ایک انقلاب کا سال ہے کہ اس سال 'پھول' جیسا یادگار اخبار جاری کرنے کا منصوبہ بنایا گیا:

۴۔ داستان تاریخ اردو (آگرہ: بار دوم ۱۹۵۷ء)، ص ۳۷۴

۵۔ تجزیے اور تجاویز (ملتان: کتاب نگر، ۲۰۰۲ء)، ص ۴۲

۶۔ مجیب ظفر انوار حمیدی، برصغیر پاک و ہند میں بچوں کا ادب، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان کراچی، شمارہ مئی ۲۰۰۲ء، ص ۶۴

۷۔ بچوں کا عالمی ادب، مشمولہ ماہنامہ ایوانِ اردو، دہلی، شمارہ فروری ۱۹۸۹ء، ص ۱۴

’پھول کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ ۱۹۰۸ء میں محترمہ محمدی بیگم صاحبہ جو مولوی سید ممتاز علی کی اہلیہ اور سید امتیاز علی تاج کی والدہ تھیں انہوں نے پھول اخبار نکالنے کا ارادہ کیا مگر اپنی بیماری کی وجہ سے قاصر رہیں۔ ۳؍نومبر ۱۹۰۸ء کو وفات پا گئیں ان کا یہ ارادہ تشنۂ تکمیل رہا محمدی بیگم صاحبہ تہذیبِ نسواں کی بھی ایڈیٹر رہ چکی تھیں جو انہوں نے ۱۸۹۸ء میں اپنے شوہر کے ساتھ مل کر نکالا۔ عورتوں کے اس اخبار نے کئی قابلِ ذکر خواتین پیدا کی تھیں ان میں ایک بنتِ نذر الباقر تھیں جنہوں نے مرحومہ کی اس خواہش کو پورا کرنے کا ذمہ لیا اور اسے اپنی سب سے اچھی یادگار سمجھ کر ۱۳؍اکتوبر ۱۹۰۹ء کو اپنی ادارت میں نکالا‘۔[۸]

۱۹۰۹ء میں جاری ہونے والا یہ اخبار ۴۸ برس تک مسلسل شائع ہوتا رہا ۱۹۵۷ء میں اس کا اجرا بند ہو گیا‘۔[۹]

پھول اخبار برصغیر کے بچوں کی ایک ایسی تہذیبی، تاریخی اور ادبی تاریخ ہے جس نے کم از کم دو نسلوں کو ضرور متاثر کیا بچوں کا یہ اخبار ایک ایسے ادارے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا جس نے ذہنوں کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا۔

بچوں کی دنیا میں بیسویں صدی کے آغاز سے بچوں کے ادب کا جو سفر رہا وہ ’بیسہ اخبار‘ اور ’پھول‘ سے حکیم محمد سعید کے ’نونہال‘ تک ایک طویل تاریخ رکھتا ہے جو تحقیق کا خود ایک الگ موضوع ہے۔

اردو میں بچوں کے ادب کا سرمایہ کچھ کم نہیں ہے۔ پاکستان میں ہزاروں صفحات پر مشتمل اس کا ذخیرہ اہلِ تحقیق کے سامنے ہے اخبارات اور مڈ ویک کم از کم ہر ہفتے بچوں کے صفحات مخصوص کرتے ہیں۔ نظموں اور کہانیوں پر مشتمل بعض کتابیں اسی بارے میں الگ سے بھی شائع ہوتی ہیں۔

کچھ ایسے ڈائجسٹ بھی ہیں جو بچوں سے مخصوص ہیں۔ ڈاکٹر اسد اریب نے ۱۹۹۴ء کی ایک تحریر میں ان ۳۵ رسالوں کا ذکر کیا ہے جو پاکستان سے شائع ہوتے ہیں۔[۱۰]

خود ہندوستان میں بھی اگرچہ وہاں ہندی قومی زبان کے طور پر نافذ ہے اور نئی نسل اردو لکھنا نہیں جانتی پھر بھی بچوں کا ادب اردو میں برابر شائع ہوتا رہتا ہے ڈاکٹر مظفر حنفی نے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں اردو میں شائع ہونے والی کتابوں میں اوسط ہر دس میں سے ایک کتاب بچوں کے لیے

۸۔ صفیہ عزیز، بچوں کی صحافت پر طائرانہ نظر، مشمولہ قومی زبان، شمارہ ستمبر ۲۰۰۱ء، ص ۶۸

۹۔ غلام عباس، اخبار پھول کا انتخاب، مشمولہ اردو نامہ، شمارہ جولائی تا ستمبر ۱۹۶۱ء، ص ۶۵

۱۰۔ نئے رجحانات بچوں کے ادب میں (ملتان: کتاب گھر، ۱۹۹۴ء)، ص ص ۱۵، ۱۶

ہوتی ہے۔[۱۱]

اس کثیر تعداد اور مقدار کے باوجود ہم جب معیار کی کسوٹی پر پرکھیں گے تو تمام ادب کو بچوں کے ادب میں شمار نہیں کیا جا سکے گا Richard Scarry جس کی کتابوں کی ۸۰ لاکھ کاپیاں بچوں کے متعلق ۲۷ زبانوں میں ترجمہ ہو کر فروخت ہو چکی ہیں اس کی یہ رائے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے مضمون میں نقل کی ہے:

'ہر کتاب بچوں کے ادب سے متعلق نہیں ہوتی بعض کتابیں جو بچوں کے ادب میں شمار ہونے لگتی ہیں وہ بڑوں کے کام کی چیزیں ہیں۔'[۱۲]

بچوں کے لیے ادب لکھنا بظاہر ایک آسان کام سمجھا جاتا ہے لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ جس طرح بڑوں کی نسبت بچوں کی تعلیم و تدریس ایک مشکل کام ہے اسی طرح ان کے لیے ادب کی تخلیق بھی کوئی سرسری کام نہیں۔ پھر سب بچے ایک عمر کے نہیں ہوتے۔ عمر کے تھوڑے تھوڑے فرق سے ان کی ذہنی صلاحیتیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔

مختار زمن نے چینی ادیب لی چھوچھن کی گفتگو سے ان کی یہ رائے اخذ کی ہے:

'بچوں کے لیے ادب تصنیف کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے اس لیے کہ یہ کام انجام دینے کے لیے ہر عمر کے بچوں کی ان کی استعداد کے مطابق درجہ بندی کرنی پڑتی ہے۔'[۱۳]

بچوں کے لیے اچھا ادب تخلیق کرنے کے واسطے ایک اچھے لکھنے والے کے طرزِ تحریر اور خود اس کی شخصیت میں جن صفات کا ہونا ضروری ہے اس کے متعلق بیگم شائستہ اکرام اللہ نے لکھا ہے:

'دراصل یہ بہت ہی مشکل کام ہے اور اچھے خاصے لکھنے والے بچوں کی کتابیں نہیں لکھ سکتے بچوں کے لیے کامیاب کتابیں لکھنے کے لیے زبان میں سادگی اور شگفتگی، طرزِ تحریر میں دلکشی اور بچوں کی نفسیات کا علم ضروری ہے۔'[۱۴]

ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی یہی نکتہ نمایاں کیا ہے وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

'بچوں کے ادیب کے لیے دو باتوں کو خصوصیت سے ملحوظ رکھنا ہوتا ہے ایک بچوں کی

۱۱۔ اردو میں بچوں کا ادب، تراجم تکنیکی اور مذہبی کتابیں، مشمولہ سہ ماہی، زبان و ادب، شمارہ جولائی تا ستمبر، ص ۵۲

۱۲۔ اردو میں بچوں کا ادب، مشمولہ قومی زبان، کراچی، شمارہ جون، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ۸۶

۱۳۔ چین میں بچوں کا ادب، مشمولہ قومی زبان، کراچی، شمارہ جون، جولائی ۱۹۹۳ء، ص ۵۱

۱۴۔ بچوں کے لیے اچھا ادب، مشمولہ اردو نامہ، شمارہ اپریل ۱۹۶۱ء، ص ۵۷

نفسیات سے گہری واقفیت اور دوسری سادہ ترین زبان اور دونوں کے خوشگوار امتزاج سے ہی بچوں کے لیے دلچسپ اور کامیاب ادب پیش کیا جاسکتا ہے۔'[۱۵]

اور اب تہذیب وثقافت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی روشنی میں بچوں کے ادب کی تخلیق کے تقاضے بھی بدل گئے ہیں۔ اسی لیے اب ہمیں نئے لکھنے والوں کی تحریروں کو دیکھنے اور پرکھنے کے لیے نئے اصولوں کو بھی نظر میں رکھنا ہوگا۔ آج بچوں کا ادب اپنے عہد کے تقاضوں کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ جدید علوم کی ترقی نے کہانیوں اور واقعات کے رخ کو تبدیل کر دیا ہے اور بعض بڑے اہلِ قلم نے بھی اس میں حصہ لیا ہے ڈاکٹر خوشحال زیدی نے بچوں کے سائنسی ادب پر لکھتے ہوئے کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر کی کہانیوں کا ذکر کیا ہے جن کے تراجم بھی دوسری زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ قرۃ العین کی کہانی 'جن حسن عبدالرحمٰن' میں سائنسی کرشمات کو دیکھ کر جن خود حیران رہ جاتا ہے۔[۱۶]

بیسویں صدی میں بچوں کے لیے جو ادب لکھا گیا وہ سیکڑوں صفحات پر بکھرا پڑا ہے۔ ہم سیدھی سادی اخلاقی نظموں اور کہانیوں سے سائنسی واقعات تک آ گئے لیکن ابھی اس تمام ادب پر تحقیق کے حوالے سے کوئی نمایاں کام نہیں ہوسکا یعنی جتنا ادب تخلیق ہوا ہے اس نسبت سے بہت تفصیلی جائزے اور تحقیقی مطالعے ہمارے پیشِ نظر نہیں ہیں۔ بچوں کے حوالے سے ہم اگر نسیم امروہوی ہی کی خدمات کو لے لیں تو ہمیں ان سے متعلق تجزیہ وتحقیق میں ایک خلا نظر آتا ہے۔ اور ان کی خدمات کے حوالے سے کام نہ ہونے کے برابر ہے اس کی وجوہات دو ہوسکتی ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ ان کی شہرت ایک لغت نویس اور مرثیہ نگار کی حیثیت سے زیادہ ہوئی اور دوسرے کاموں پر پردہ پڑ گیا۔

۲۔ دوسرا بڑا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی تحریریں، مقالات، تصانیف خصوصاً بچوں کے بارے میں ان کی قلمی خدمات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نایاب ہوتی چلی گئیں ہیں۔

کسی بھی موضوع سے متعلق مصنف کی جملہ تحریریں اگر پیشِ نظر نہ ہوں تو ہم اس کے نقطہ نگاہ کو مکمل سمجھ نہیں سکتے اور تحقیق کا حق بھی ادا نہیں ہوسکتا۔ ان سے متعلق اپنی تحقیقی دوڑ دھوپ میں ان کی جو تحریریں اور

۱۵۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، اکیسواں ایڈیشن ۲۰۰۲ء) ص ۴۹۲

۱۶۔ بچوں کا سائنسی ادب، مشمولہ کتاب نما، شمارہ مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۳۷

تالیفات وتصنیفات مجھے دستیاب ہوسکیں پہلے ہم ان کا ایک تعارفی جائزہ لیں گے۔

پھولوں کا ہار

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ سے ۱۷ے اور دوسری بار ۱۹۵۲ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ ۱۸ے

اس کتاب میں نسیم کی ۲۲ نظمیں اور گیت شامل ہیں بچوں کو پورے عہد کے مزاج اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانے کے لیے انہوں نے اکبرالہ آبادی، مولانا حالی، اسمٰعیل میرٹھی اور آرزو لکھنوی کی نظمیں بھی ساتھ شائع کی ہیں۔نسیم کے گیتوں اور نظموں میں میٹھی میٹھی نیند، امید کے کرشمے، داتا اور کردگار، اٹھ وطن کے سورما، پریم سویرا، وطن کی جان، امرت دھارا، پالن ہار، مزدوری کر، سورج سے دو دو باتیں، دیہات کی صبح، ہمارے ملک کا سرتاج بہت اثر انگیز نظمیں ہیں۔

چراغِ زندگی

اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر سنِ اشاعت درج نہیں ہے دوسرا ایڈیشن جو ہمارے پیشِ نظر ہے یہ ۱۹۵۴ء میں اختر پریس سکھر سے شائع ہوا۔کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹ے اس میں ۲۰ سے زیادہ افسانے ہیں جس میں انسانیت کی کسی نہ کسی اعلیٰ خوبی پر افسانے کا اختتام ہوتا ہے اور اسی کو چراغِ زندگی قرار دیا گیا ہے۔

ہنسوں کی رانی اور دیگر طیور

لکھنؤ سے پہلی بار اس کی اشاعت ہوئی لیکن سنِ اشاعت کی نشاندہی نہیں ہے۔ پاکستان میں پہلی بار سکھر سے شائع ہوئی ۲۰ے اس میں پرندوں کے متعلق ایسی کہانیاں ہیں جن سے معصوم جذبوں کی ترجمانی ہوتی ہے۔ حصولِ رزق کے لیے پرندوں کی دوڑ دھوپ کا اس میں بیان ہے۔ایک نظم میں علامہ اقبال کے شاہین کو بھی مثال بنایا گیا ہے۔

۱۷۔ پھولوں کا ہار (لکھنؤ: بھارگو اسکول ڈپو، ۱۹۳۷ء)

۱۸۔ پھولوں کا ہار (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۵۲ء)

۱۹۔ چراغِ زندگی (حصہ اول) فروری ۱۹۵۴ء، چراغ زندگی دوسرا حصہ جولائی ۱۹۵۴ء

۲۰۔ ہنسوں کی رانی اور دیگر طیور (سکھر: اختر پریس، ۱۹۵۵ء، اشاعت دوم)

کوہِ نور ریڈر (۸ حصے)

سادہ اور سلیس زبان میں ایسی کہانیاں اور نظمیں (چند نظمیں) اس کتاب کا حصہ ہیں جن سے زندگی کا کوئی نہ کوئی روشن پہلو سامنے آتا ہے۔ سماج میں رہنے سہنے کے ڈھنگ، میل جول اور ایک دوسرے سے برتاؤ، محنت اور مشقت سے معاشرے میں ترقی کی راہوں کا کھلنا اور بعض دوسرے پہلو۔ کہانیوں اور نظموں کے چند عنوانات یہ ہیں: آؤ محنت کریں، تنکوں کا اتحاد، غرور کا سر نیچا، ہل اور بیلچہ (نظم)، مزدور اور پسینہ، کسان، ہمارا معاشرہ اور سانپ کا من وغیرہ۔ بنارس کے بعد[۲۱] خیر پور سے بھی اس کی اشاعت کچھ کہانیوں کے اضافے کے ساتھ ہوئی[۲۲] پہلا ایڈیشن ۸ حصوں پر مشتمل تھا دوسرے ایڈیشن کو اضافے کے بعد ۵ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

اردو ادب (۸ حصے)

بچوں کے بارے میں نسیم امروہوی کی خدمات کا زیادہ اہم حصہ جو ان کے سماجی مطالعے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے وہ ان کی کتاب اردو ادب ہے جو ۸ حصوں یا جلدوں پر مشتمل ہے۔[۲۳] ہر جلد یا ہر حصہ ڈھائی سو سے تین سو صفحات پر مبنی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں لاہور سے شائع ہونے والی یہ جلدیں پنجاب اور بلوچستان کے طلبا و طالبات کے لیے ان کے سماجی پس منظر میں خصوصی طور پر تیار کی گئی ہیں۔ پہلی جلد، پہلی کلاس کے طلبا و طالبات کے لیے، دوسری جلد، دوسری کلاس، اور اسی طرح باقی تمام جلدیں...... پہلی سے آٹھویں جماعت کے طالب علموں کے لیے یہ مختلف حصے اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ یہ تین یا چار سال کی عمر کے بچوں سے لے کر ۱۲ یا ۱۳ سال کی عمر تک کے بچوں کی بتدریج بدلتی ہوئی ذہنی سطح کا اظہار ہیں۔ ان کے موضوعات اور عنوانات ہی سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ نسیم بچوں کی نفسیات اور ان کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت پر کس طرح اثرات قائم کرتے ہیں چند عنوانات کی مثالیں یہ ہیں:

۲۱۔ دسمبر ۱۹۳۵ء

۲۲۔ (خیر پور: ناشر بنیاد علی، خیر پور ایڈیشن، ۱۹۵۳ء)

۲۳۔ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء)

پہلی جلد (پہلی جماعت کے لیے)

کہانیاں: اچھی پری، میں امی کا کہنا مانوں گا، گڑیا میری سہیلی، دادی اماں۔

نظمیں: چڑیا اور اس کے بچے، دودھ کی بوتل، بلی، میری کتاب۔

دوسری جلد (دوسری جماعت کے لیے)

کہانیاں: دیکھو اور پڑھو، ہمارا اسکول، ماں کا پیار، صاف کپڑے، مٹی کے برتن، طوطا اور کوا، بڑوں کا ادب، بادشاہی مسجد۔

نظمیں: اچھا لڑکا، آنکھ مچولی، سویرا، پاکستان ہمارا ہے۔

تیسری جلد (تیسری جماعت کے لیے)

کہانیاں: جانوروں کا اسکول، جنگل کا بادشاہ، پریوں کی سواری، جگنو کے کام۔

نظمیں: ہری ہری گھاس، میرا بستہ، وطن زندگی ہے وطن زندگی۔

چوتھی جلد (چوتھی جماعت کے لیے)

کہانیاں اور مضامین: بہادر بچے، پانی کی کہانی پانی کی زبانی، بجلی کی روشنی۔

نظمیں: جاڑا آیا، ہمارا کسان، پھول کی رنگت، محنت سے زندگی ہے۔

پانچویں جلد (پانچویں جماعت کے لیے)

کہانیاں اور مضامین: طالب علم اور ورزش، بجلی کا موجد، ابن بطوطہ کی کہانی، انجمن امداد باہمی۔

نظمیں: تندرستی ہزار نعمت ہے، امید کا سہارا، اٹھ وطن کے سورما۔

چھٹی جلد (چھٹی جماعت کے لیے)

کہانیاں اور مضامین: وفادار کتا، کراچی کی بندرگاہ، ٹیلی فون کی کہانی، مولانا حالی۔

نظمیں: مجاہد وطن، تتلی نے گیت گایا، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالیں۔

ساتویں جلد (ساتویں جماعت کے لیے)

کہانیاں اور مضامین: آگ کی کہانی، آزادی، بینک کا کاروبار۔

نظمیں: گلاب کا پھول، نیلا آسمان، صبح کی اذان۔

آٹھویں جلد (آٹھویں جماعت کے لیے)

کہانیاں اور مضامین: پاکستان کا خواب، محنت میں عظمت، سورج کا پیغام، معاشرہ اور معاشرت، گندم کی پیداوار۔

نظمیں: بلوچی نوجوان، دیس کی مٹی۔

چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے طلبا و طالبات کے ذہن کی جونشو ونما ہوتی ہے وہ ان کو نئے راستوں کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ وہ نئی دنیا سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔ ان میں لکھنے پڑھنے کا شوق بھی بڑھنے لگتا ہے، وہ اپنے اردگرد کے ماحول اور معاشرے کو سمجھنے لگتے ہیں۔ نسیم امروہوی نے ان تینوں درجوں کی کتابوں میں اپنے مضامین، کہانیوں اور نظموں کے علاوہ دوسرے نامور اہلِ قلم کی تحریریں بھی شامل کی ہیں تاکہ بچے مختلف سماج میں رہنے والے ادیبوں کی فکر سے اپنے سماج اور اس کے ماحول کو تقابلی طور پر بھی سمجھ سکیں۔ جن لکھنے والوں کی تحریریں نسیم نے ان تینوں کتابوں میں شامل کی ہیں ان میں میر امن دہلوی، سرسید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولانا ظفر علی خان، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، راشد الخیری، سر عبدالقادر، عزیز لکھنوی، مسعود حسن رضوی ادیب اور رئیس امروہوی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

گلزارِ نسیم

بچوں کے لیے کہانیوں، ڈراموں اور چند نظموں پر مبنی یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے ۱۹۵۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی [۲۴]۔ اس کتاب میں کچھ نظمیں مثنوی کی صورت میں بھی ہیں۔

بچوں کے لیے ڈرامے کی صنف نسیم نے اپنی تصانیف میں پہلی بار اس کتاب میں متعارف کروائی۔ عنوان ہے 'جھوٹ اور سچ کا ڈرامہ' اس ڈرامے میں جھوٹ اپنی فوج کا سپہ سالار ہے بغض، عداوت اور کینہ پروری اس کے سپاہی ہیں جبکہ دوسری جانب سچ کا ایک مختصر سا لشکر ہے جس میں سچ کا ساتھی کوئی نہیں۔ سچ

۲۴۔ ناشر (لاہور: کتاب منزل)

اکیلا ہے لیکن اپنی سچائی کی طاقت سے یہ ڈرامے میں فتح مندی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے نسیم امروہوی کی ڈرامہ نگاری کے ذکر میں ڈرامہ 'ملاپ' کا حوالہ دیا ہے، جو بچوں کے لیے ہے۔[۲۵]

نسیمِ اردو (۸ حصے)

گلزارِ نسیم سے پہلے ہم نے 'اردو ادب' کے نام سے جس کتاب کا ذکر کیا وہ بھی ۸ حصوں پر مشتمل تھی[۲۶] جس میں تین اور چار سال کی عمر سے ۱۳ اور ۱۴ سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے ان کی بڑھتی ہوئی عمر اور بدلتے ہوئے ذہن کا سفر نظر آتا ہے۔ 'نسیمِ اردو' بھی اگرچہ ۸ حصوں پر مشتمل ہے لیکن یہ صرف نوعمر بچوں کے لیے ہے۔ اس کی اشاعت بھی لاہور سے ہوئی۔[۲۷] کیونکہ ایک ہی عمر کے بچوں کے لیے ہے اس لیے ایک ہی طرز مصنف نے اختیار کیا ہے۔

پہلے حصے میں نسیم نے دیباچہ بھی لکھا ہے جس سے ان کی فکر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان مختلف حصوں میں جو مختلف نظمیں ہیں ان میں چھٹی ہوگئی، میرا گھر پیارا گھر، مور کا ناچ، ایک تتلی، نیلی پیلی بلی، اچھی چڑیا، مٹھائی، جبکہ ہلکی پھلکی کہانیوں میں مٹی کا کبوتر، اشرف اور بڑھیا، پھل والا، بندروں کی انجمن، نیکی کے پھل سب کے سب میٹھے اور جھوٹے کوّے کا انجام بہت دلنشین اور بچوں کے ذہن کو متاثر کرنے والی تحریریں ہیں۔ یہ نظمیں اور کہانیاں عموماً ان بچوں کے جذبات کے اظہار سے شروع ہوتی ہیں جن کی عمر کم از کم چار سال ہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے چار سال کی عمر کے بچوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> 'اس عمر میں فہم و ادراک بڑھ جاتا ہے بول چال کے فن پر مکمل طور پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور بچوں کی زبان Baby Talk کی منزل سے گزر جاتی ہے۔'[۲۸]

بچہ سماجی ضرورت کے تحت زبان سیکھتا ہے

بچے کے لیے زبان سیکھنے کا آغاز اس کی سماجی ضرورت کے تحت ہوتا ہے۔ اس کے چاروں طرف جو ماحول ہوتا ہے وہ اسی ماحول کی ضرورت کے مطابق نئے لفظوں سے واقف ہونے لگتا ہے اس لیے بچوں کے لیے

۲۵۔ بجھی وہ شمع (لاہور: اظہار سنز، جون ۱۹۸۷ء) ص ۱۹

۲۶۔ اردو ادب (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء) ص ۳

۲۷۔ ناشر (لاہور: کشمیری بازار، ۱۹۵۳ء)

۲۸۔ بچوں کی اردو تحصیل زبان کا ایک مطالعہ، مشمولہ، ماہنامہ نگار، پاکستان، شمارہ اپریل ۱۹۹۷ء، ص ۹

لکھنے والے ادیب کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ بچے کے سماجی ماحول اور اس کے سماجی پس منظر کو بہتر طور پر سمجھتا ہو بظاہر تمام بچوں کی سماجی ضرورتیں ایک ہی جیسی ہوتی ہیں لیکن ان کے اپنے اپنے سماجی ماحول کی وجہ سے ان ضرورتوں کا تصور بدلتا رہتا ہے۔ بچوں کے ادیب کے لیے ایک طرف تو زبان کی نزاکتوں اور ضرورتوں کو بھی دیکھنا ہوگا اور دوسری طرف اسے بچوں کے خیالات بھی سمجھنے ہوں گے۔ صرف آسان زبان لکھ دینا ہی بچے کی ضرورت نہیں ہے اس کے خیال پر بھی نظر رکھنا ہوگی اخبار 'پھول' کے حوالے سے اپنے ایک تبصرے میں معروف افسانہ نگار غلام عباس لکھتے ہیں:

> 'بہت سے مضمون نگار بس آسان لفظ تو لکھ دیتے ہیں مگر یہ خیال ذرا نہیں کرتے کہ جو باتیں انہوں نے لکھی ہیں یا جو خیالات انہوں نے ظاہر کیے ہیں کیا ویسے خیالات بچوں کے دماغ میں کبھی آتے اور ویسے لفظ ان کی زبان سے کبھی بولے بھی جاتے ہیں یا کوئی بچہ اپنی بول چال میں اتنا مبالغہ کبھی کرتا ہے۔' [۲۹]

نسیم کی کتاب 'اردو ادب' کے آٹھ حصوں پر لکھتے ہوئے ابھی گذشتہ صفحات میں ہم نے اس پہلو پر روشنی ڈالی تھی کہ وہ مختلف عمر کے بچوں کے لیے ان کی بتدریج بڑھتی ہوئی ذہنی سطح کے مطابق نہ صرف یہ کہ خیال یا مضمون کو سامنے لاتے ہیں بلکہ زبان و بیان کو بھی اسی اعتبار سے ایک شکل دیتے ہیں۔ جہاں ان کی کہانیاں اور نظمیں تعلیمِ بالغاں کے لیے ہیں وہاں ان کا طرزِ اظہار بدلا ہوا ہے اور جہاں باشعور لوگ ان کے مخاطب ہیں وہاں زبان بھی اسی معیار کے ساتھ ہے۔ 'معلم المکاتب' [۳۰] تعلیمِ بالغاں کے لیے لکھی گئی ہے جبکہ 'ادبی کہانیاں' [۳۱] باشعور لڑکوں اور سمجھدار لوگوں کے لے درس ہدایت و معلومات ہے ان کی کتابیں نثر اردو [۳۲] اور نظم اردو [۳۳] بھی اسی ذیل میں آئیں گی۔ ہم مختلف عمروں کے لیے ان کی یہ تحریریں دیکھتے ہیں تو ان میں ہمیں ایک پوری تہذیب اور ایک پورا باشعور گھرانہ چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں ان کا طرز علمی بھی ہوگیا ہے۔ لکھنؤ میں مقیم ایک محقق ڈاکٹر کاظم علی خاں جنہوں نے لکھنؤ کے بعض کتب خانوں میں نسیم کی نادر و نایاب نصابی کتابیں دیکھی ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ بعض نصابی کتابوں

۲۹۔ اخبار پھول کا انتخاب، مشمولہ اردو نامہ، کراچی، شمارہ جولائی تا ستمبر ۱۹۶۱ء، ص ۶۶

۳۰۔ ناشر (لاہور: رائے بہادر گلاب سنگھ)

۳۱۔ ناشر (لاہور: شیخ غلام علی)

۳۲۔ ناشر (لاہور: انوار بک ڈپو)

۳۳۔ ایضاً

پر نسیم نے عالمانہ تشریحی حاشیے بھی لکھے ہیں۔[۳۴]

مختلف عمر کے بچوں کے لیے نسیم کا اسلوب

نسیم امروہوی اپنی ادبی و شعری زندگی کے آغاز ہی سے اپنے خاندانی پس منظر کے سبب علمی رجحان زیادہ رکھتے تھے۔ بہت ابتدائی زمانے ہی سے ان میں مطالعۂ لغت کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔'فرہنگ اقبال' کے مقدمہ نگار نے لکھا ہے:

> '۱۹۲۸ء میں جب ان کی عمر ۲۰ سال تھی اور وہ الٰہ آباد بورڈ سے فاضل فقہ اور فاضل ادب کے امتحانات سے فارغ ہوئے تھے کہ انہوں نے ایک بہت ہی مختصر لغت ترتیب دی تھی جس کا نام 'طالب علموں کے لیے ایک مختصر لغت' رکھا تھا اس لغت میں صرف پانچ سو الفاظ تھے ہر لفظ کی تشریح میں انہوں نے ایک شعر کہہ کر خود شامل کیا تھا جس میں اساتذہ کے اشعار سے استفادہ کیا تھا'۔[۳۵]

ایسا ادبی پس منظر رکھنے والی شخصیت سے جس کے آباؤ اجداد بھی عربی اور فارسی کے عالم فاضل رہے ہوں اس بات کا امکان رہتا ہے کہ بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے میں وہ کہیں بہت عالمانہ لہجے کی طرف نہ نکل جائیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے نسیم کی تحریروں میں علمیت کے وقار کا تذکرہ کیا ہے[۳۶] لیکن نسیم اس علمیت کو بچوں کے ادب پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ جہاں عالمانہ رنگ آیا بھی ہے وہاں اظہار کی روانی سے تحریر میں بچوں کے لیے کشش باقی رکھی ہے۔ وہ بچوں کے لیے اپنی تحریر میں اسلوب کا بہت خیال رکھتے ہیں ان کے سماج کے اطراف جو بچے ہیں وہ ان بچوں سے باخبر ہیں وہ یہ احتیاط کرتے ہیں کہ طرزِ اظہار میں الجھاؤ پیدا نہ ہو زبان نہ تو بہت مشکل ہو نہ بہت سرسری اور سطحی۔ الیاس مجتبیٰ لکھتے ہیں:

> 'بے شبہہ بچوں کی استعداد کا لحاظ رکھنا ہوگا لیکن روکھا پھیکا اسلوب اور سہل بولوں کے برتنے سے گویا دفتری خانہ پوری تو ہو جائے گی اصل مقصد اس ترکیب سے حاصل ہونا نامعلوم'۔[۳۷]

۳۴۔ مراثی نسیم کا تجزیاتی جائزہ، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۴۳

۳۵۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، فرہنگ اقبال، فارسی (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۸

۳۶۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (لاہور: عزیز بک ڈپو، طبع سوم، ۱۹۹۸ء)، ص ۵۴۶

۳۷۔ بچوں کے ادب کے پچیس سال، مشمولہ ماہنامہ ساقی، کراچی، جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء، ص ۱۶۱

نسیم کیوں کہ بچوں کی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں اس لیے زبان کی بعض نزاکتوں پر بھی بہت توجہ دیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ایک ایسی زبان اپنا اثر دکھاتی نظر آتی ہے جس سے اچھی تحریر کا تاثر بہت نمایاں ہوتا ہے۔ مشیر فاطمہ، بچوں کے ادب کے متعلق جن کی کتاب کم وبیش چالیس سال سے ماہرین تعلیم و تدریس کی مدد کر رہی ہے لکھتی ہیں:

'کتاب کا موضوع چاہے پریوں کی کہانی ہو، جانوروں کے متعلق یا کسی ہیرو کی سوانحِ حیات ہو ان سب میں اچھی تحریر کی خوبیاں ضرور ہونی چاہیں تب ہی وہ بچوں کا ادب کہلانے کی مستحق ہوں گی۔'[۳۸]

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں لکھا گیا کہ نوجوانی ہی سے علم لغات سے دلچسپی اور اپنے اہلِ قلم آباؤ اجداد کی عربی و فارسی سے گہری واقفیت کے باوجود نسیم نے اپنی تحریروں کو بوجھل ہونے سے بچایا اور ابتدا ہی سے انہوں نے اس ادبی پہلو پر نظر رکھی۔ نسیم کے سماجی شعور میں اس بات کو بہت اہمیت حاصل ہے کہ نئی نسل کو زبان کی اہمیت کا احساس دلایا جائے۔ بچوں کے لیے بالکل بنیادی کتابیں جو انہوں نے ترتیب دیں اس میں بھی صحت زبان کی طرف ان کے دلوں کو مائل کیا گیا 'نسیمِ اردو' کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

'صحیح تلفظ کی عادت ڈالنے کے لیے سبق میں مشکل الفاظ پر اعراب لگائے گئے ہیں اور کتابت ان قواعد کے ماتحت کرائی گئی ہے۔'[۳۹]

'نیا لفظ جو کسی سبق میں سکھایا گیا ہے اسے دوبارہ اسی سبق میں یا آگے چل کر دوسرے اسباق میں یاد کرایا گیا ہے تا کہ اسکا محلِ استعمال اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔'[۴۰]

نسیمِ اردو حصہ دوم میں انہوں نے 'امتیازی خصوصیات' کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

'بچہ سماج سے الگ تھلگ نہیں ہے وہ جس سماج میں آنکھیں کھولتا ہے، پروان چڑھتا ہے اور پھر اسکول جانے کا آغاز کرتا ہے اس سماج کی زبان ہی اس کے سماجی شعور کے نشو و نما کی پہلی سیڑھی ہے۔'[۴۱]

۳۸۔ بچوں کے ادب کی خصوصیات، اشاعت اول ۱۹۶۲ء، بحوالہ ماہنامہ نگار، شمارہ فروری ۱۹۹۸ء، ص ۲۲

۳۹۔ نسیم اردو حصہ اول (لاہور: کشمیری بازار، ۱۹۵۳ء)، ص ۳

۴۰۔ ایضاً، ص ۲

۴۱۔ نسیمِ اردو، حصہ دوم (لاہور: کشمیری بازار، ۱۹۵۳ء)، ص ۵

نسیم ابتدا ہی سے بچوں کو زبان و ادب سے قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مضامین اور کہانیوں کے ساتھ ساتھ وہ ان کے لیے نظمیں بھی لکھتے ہیں اور اس میں اپنے اسلوب اور اپنی زبان کو پُرکشش بنانے پر توجہ رکھتے ہیں تا کہ بچہ جس سماج میں پل بڑھ رہا ہے وہ اس میں اپنے اظہار کی راہ میں دشواریاں نہ محسوس کرے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ایک تحریر سے یہ اقتباس دیکھیے:

'منظومات کے سلسلے میں نسیم امروہوی کا یہ کارنامہ بھی یادگار رہے گا کہ انھوں نے بچوں میں شاعرانہ شعور پیدا کرنے کی علمی کوششیں اور کاوشیں کیں اور چھوٹے چھوٹے معمولی موضوعات پر نہایت رواں اور متین اسلوب میں نظمیں کہیں۔'[۴۲]

نسیم صاحب نظموں اور کہانیوں پر مشتمل اپنی تصنیف 'اردو ادب' میں لکھتے ہیں:

'اگر موضوع مشکل اور خشک ہے تو زبان کی سلاست اور روانی سے دلچسپ بنایا گیا ہے اگر موضوع آسان اور دلچسپ ہے تو زبان کے دوسرے محاسن سے اس کی دلچسپی کو بڑھایا گیا ہے۔'[۴۳]

بچوں میں ادب کی تعلیم کا سماجی وتہذیبی پہلو

نسیم صاحب نے بچوں کے لیے مختلف مزاج اور مختلف نوعیت کی جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں ایسے پہلوؤں پر زور دیا ہے جس سے سماج میں عزت و شرافت کی قدر و قیمت اُجاگر ہو محنت اور مسلسل عمل سے انسان ترقی کی طرف جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

'ادبیات کی تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا کہ لڑکوں کو کسی زبان کے الفاظ یاد ہو جائیں اور وہ ان کے محلِ استعمال کو اچھی طرح سمجھ جائیں بلکہ ان کے لیے جو کتاب بھی بنائی جائے وہ ایسی ہونا چاہیے جس کو پڑھ کر زبان دانی کے ساتھ ساتھ ان کی قوتِ اخذ و استنباط تیز ہو، دماغ روشن ہو اور ان میں اپنی عمروں کے لحاظ سے غیر معمولی ادراک پیدا ہو جائے تا کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد میدانِ عمل کے نشیب و فراز میں قدم قدم پر رہبری کے محتاج نہ رہیں۔'[۴۴]

۴۲۔ ترجیحات (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۹۸ء)، ص ص ۴۷،۴۳

۴۳۔ اردو ادب دوسرا حصہ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء)، ص (ج)

۴۴۔ اردو ادب، چوتھا حصہ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء)، ص ۹

نسیم صاحب اس مقصدِ تعلیم کے ذیل میں نصابی پابندیوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ غیر نصابی تحریروں کی طرف بچے بعد میں جائیں پہلے وہ نصابی حصوں کو پڑھیں اس لیے کہ نصاب میں کچھ اصول اور ضابطے ہوں گے جو بچوں کو ایک ڈسپلن کا عادی بنائیں گے۔ نصابی نظمیں اور نصابی تحریریں بچوں کے ذہن کی پرورش میں ایک الگ کردار ادا کرتی ہیں ماہرین تعلیم نے اس حوالے سے کئی باتیں لکھی ہیں۔ ہمارے ملک کی جامعات میں بھی طلبا و طالبات کی بعض تحقیقی تحریریں اس بارے میں ہمارے پیش نظر ہیں۔[۴۵]

نسیم امروہوی نے اپنی کتاب کے آغاز میں طلبا و طالبات کی تعلیمی رہنمائی اور تربیت کے لیے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے مقصد کو بھی واضح کیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

> 'جا بجا سبقوں میں شروع ہونے سے پہلے نوٹ کے طور پر، اور مشقوں میں ایسی باتیں لکھی گئیں ہیں جن سے لڑکوں کو وسیع مطالعے کا شوق پیدا ہوگا، خاموش مطالعے کی قوت بڑھے گی اور وہ اپنے ذاتی شوق سے غیر درسی کتابیں پڑھنے اور ادبی نکات سوچنے میں ایک قسم کی خوشی محسوس کریں گے۔'[۴۶]

> 'دلچسپی پیدا کرنے کا ایک پہلو ظریفانہ بھی ہوتا ہے۔ مگر ہر جگہ ظرافت میں الجھنے سے بھی افادیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے کسی کام کی بات کو ظرافت کا رنگ چڑھا کر بے سود نہیں بنایا گیا۔ بلکہ مضمون دلچسپ بنانے کے جو اصول علمِ بلاغت میں، مخاطب کی عمر کے لحاظ سے مقرر ہیں، ان کے تحت میں مضامین کو اتنا دلچسپ بنا دیا گیا ہے کہ لڑکے انہیں شوق سے پڑھیں گے اور محظوظ ہوں گے۔'[۴۷]

> 'جن موضوعات کا عوام سے تعلق ہے، ان سے بحث کے دوران، نہایت دل نشین انداز سے یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ زراعتی، صنعتی، تجارتی (اور دیگر انواع کی) ترقی

۴۵۔ (الف) شاہانہ بیگم، بچوں کی نصابی نظموں کا تنقیدی مطالعہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے (۲۰۰۱، مملوکہ لائبریری پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی)

(ب) مونا منصور، بچوں کا ادب اور ڈاکٹر اسد اریب، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے (۲۰۰۵ء مملوکہ لائبریری، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی)

۴۶۔ اردو ادب، دوسرا حصہ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء)، ص۵

۴۷۔ ایضاً، ص۶

کے راستے میں جودشواریاں پیدا ہوتی ہیں ان کا تدارک کسی حدتک خود ہمارے ہاتھ میں ہے اور کن کن مواقع پر قوم اپنی ذمہ داریوں کوحکومت کے سر مڑھ کران منفعتوں سے محروم رہ جاتی ہے، جو دنیا کی بیدار مغز قوموں کوعلی العموم حاصل ہیں۔'[48]

'مکالمے اور ڈرامے کے طور پر مستقل اور متعدد سبق لکھے گئے ہیں تاکہ اداکاری اور لب ولہجہ کا اتار چڑھاؤ، جو سمجھنے سمجھانے کی روح ہے، لڑکوں میں رفتہ رفتہ پیدا ہوتا رہے۔'[49]

'سبقوں کے شروع میں ہر نئے مصنف، اس کے امتیازی رنگِ سخن اوراس کی تصانیف سے مختصر لفظوں میں تعارف کرادیا گیا ہے، جو ادبیات کی تعلیم کا نہایت ضروری جزو ہے۔'[50]

سماج میں اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت

نسیم کے عہد میں جو کہانیاں یا نظمیں لکھی جاتی تھیں ان کا مقصد یہ تھا کہ بچوں میں اخلاق کے پہلو اُجاگر ہوں ان میں علم کا ذوق پیدا ہو وہ بزرگوں کا احترام کرنا سیکھیں اور ان میں اطاعت شعاری کا جذبہ نمایاں ہو جائے ان سب باتوں کے مقاصد انہیں ایک مقصد کی طرف لے جاتے تھے اور وہ یہ تھا کہ کسی طرح وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کو آہستہ آہستہ سمجھنے لگیں۔ آج کی اس ترقی یافتہ دنیا میں اس بات کی اہمیت یوں بھی بڑھ گئی ہے کہ مشینی دور کے انسان کا ذہن کمرشل مقاصد کی طرف زیادہ ہے۔ میرزا ادیب ایسی صورتِ حال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'بعض موجودہ مصنف چاہتے ہیں کہ وہ اپنی تحریروں میں تحیر، جاسوسی، سراغ رسانی، انتہائی مبالغہ آمیز مہمات سے ہی واسطہ رکھیں تاکہ بچے انہیں شوق سے پڑھیں ان کی کتابیں زیادہ سے زیادہ مقبول ہو کر زیادہ سے زیادہ تعداد میں فروخت ہوں جب نصب العین یہ ہو تو بچوں کی ذہنی تربیت کے اہتمام کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔'[51]

۴۸۔ اردو ادب، دوسرا حصہ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء)، ص۶

۴۹۔ ایضاً

۵۰۔ ایضاً

۵۱۔ بچوں کا ادب (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء)، ص۱۳

اکیسویں صدی میں بچوں کے ادب کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر طاہر مسعود لکھتے ہیں:

'نئی کہانیوں میں خواہ وہ جاسوسی کہانیاں ہوں، سماجی حقیقتوں کی کہانیاں یا سائنس فکشن بالعموم اخلاقی تاثیر سے عاری ہوتی ہیں۔' ۵۲

نسیم کی تحریروں میں اخلاقیات کا پہلو بہت وسیع ہے۔ان کا مقصد محض یہ نہیں ہے کہ بچے با اخلاق ہوجائیں بزرگوں کا احترام کرنے لگیں اور انہیں مذہب سے محبت ہوجائے وہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسا تعلیمی جذبہ ان میں پیدا ہوجائے جو ان کی عادتوں اور طور طریقوں میں تعمیر کا کام دے ان کی مصروفیات اور ان کے مشغلوں کا رخ صحیح سمت کی طرف ہوجائے۔ وہ ان پر بلا وجہ وعظ و پند کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے یہ ایک بہت نازک نفسیاتی حقیقت ہے جسے نسیم اپنی نظر میں ہمیشہ رکھتے ہیں۔ان کی تحریر سے ایک اقتباس دیکھیے:

'لڑکوں کو کوئی بات سکھانے کے لیے 'لڑکو! تم ایسا کرو' اور اسی قسم کے دوسرے ناصحانہ الفاظ سے مخاطب کر کے ان کے نازک دماغوں پر وعظ و پند کا بار نہیں ڈالا گیا بلکہ ہم ایسا کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بات ابھی معلوم نہیں، آؤ آج اسے جان لیں وغیرہ کہہ کر باتوں باتوں میں انکا میلانِ طبع حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بُرے نمونے کے بُرے نتائج دکھا کر اخلاقی سبق دینے کے بجائے اچھے نمونے کے اچھے نتائج سے لڑکوں کی فطری نیکی کو بیدار کیا گیا ہے تاکہ عمر کی ان ابتدائی منزلوں میں بُرے نمونے کے نقشِ اول بن جانے کا اندیشہ باقی نہ رہے......اور اگر کہیں کسی ضرورت سے کوئی برا نمونہ دکھا دیا گیا ہے تو نتیجے میں اس کو اچھے نمونے کی صورت میں منقلب کر دیا ہے۔ جو رہنمائی کا مانا ہوا کامیاب اصول ہے۔' ۵۳

نسیم کی تحریروں کے سماجی مطالعے میں سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ معاشرے کے تمام طبقوں اور مختلف عمروں کے لوگوں میں ایک ایسا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ان کی شخصیت کی تعمیر میں بنیاد کا کام دے۔ یعنی وہ انسان سازی اور سیرت سازی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ سماج میں جو اونچ نیچ ہے، اقتصادی الجھنیں ہیں۔ لوگ مختلف رسومات اور اوہام کا شکار ہیں وہ ان سب کا سبب یہی قرار دیتے ہیں کہ

۵۲۔ بچوں کے لیے کہانیاں اکیسویں صدی میں، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان، کراچی، شمارہ نومبر ۱۹۹۳ء، ص ۵۱

۵۳۔ اردو ادب، چھٹا حصہ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء)، ص ۳

سماج میں رہنے والوں کو صحیح راستے کی نشاندہی نہیں کی جا سکی۔ بچوں کی شخصیت کی تعمیر پر ان کی بہت زیادہ توجہ اسی لیے ہے کہ وہ انہیں سماجی زندگی کا اہم رکن تصور کرتے ہیں۔ ساتویں کلاس کے بچوں میں ایسا شعور پیدا ہو چکا ہوتا ہے کہ جس سے وہ اطراف کی زندگی کو سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کی نظم 'میری اچھی باجی' کہ یہ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

ہر قدم پر آپ میری رہنمائی کیجیے
اے مری اچھی سی باجی مجھ کو ہمت دیجیے

آپ ہم ملکر بدل دیں کیوں نہ باجی زندگی
جو ہمارے چار جانب ہے سماجی زندگی[۵۴]

اس نظم کے آخر میں طلبا و طالبات کو ان کی مشق کے لیے سوالات دیئے گئے ہیں جن میں ایک ہدایت یہ بھی ہے کہ آپ اپنے استاد سے یہ پوچھیے اور معلوم کیجیے کہ سماجی زندگی کسے کہتے ہیں۔ بچوں کے ادب کے حوالے سے نسیم امروہوی کی تحریروں میں جو پہلو زیادہ نظر آتے ہیں اور جو ان کی ادبی خدمات کے سماجی مطالعہ میں ایک مرکزیت رکھتے ہیں وہ ہیں زندگی اور معاشرتی ماحول کے ادب آداب، تعلیم وتربیت، اخلاق، دین کی اہمیت اور انسانوں سے اس کا رشتہ اور حقوقِ انسانی وغیرہ۔ تعلیم وتربیت کے تعلق سے انہوں نے بہت لکھا ہے۔ بچوں کے لیے لکھے گئے ایسے مضامین، نظموں اور کہانیوں میں وہ ایک ایسی کشش پیدا کر دیتے ہیں کہ لڑکپن کے ذہنوں کے لیے ان میں تربیت کے راستے خود بخود پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

خیر پور سے ان کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار 'مراد' میں انہی کا ایک مضمون 'سقراط کی تعلیمی دلچسپیاں' فروغِ تعلیم کے ذیل میں اہم ہے اس کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں بہت سادہ طریقے سے وہ سقراط کی زندگی کے واقعات سناتے ہیں اور بچے کے دل میں تعلیم کا ذوق خود بخود پیدا ہونے لگتا ہے:

'افلاطون کی تعلیم سے اس کی سیرت میں انقلاب پیدا ہوا کہ رات دن اسی میں محو رہنے لگا۔ جب یہ شب کو پلنگ پر لیٹ کر پڑھتا تھا یا کسی علمی مسئلے کو ذہن میں دہراتا تھا تو اپنا ایک ہاتھ پلنگ کے باہر پھیلائے رکھتا تھا۔ اس ہاتھ میں لوہے کا ایک گولہ ہوتا تھا۔ اگر

۵۴۔ اردو ادب، ساتواں حصہ (لاہور: کتاب منزل، دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۲ء) ص ۶۱

اتفاقیہ آنکھ لگ جاتی اور گولے پر انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی تو وہ گولہ نیچے ایک پیتل کے برتن میں گر پڑتا تھا جس کے جھناکے سے اس کی آنکھ کھل جاتی اور پھر بیٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔'۵۵

وہ نہ صرف مختلف بڑی شخصیتوں کی مثالوں اور ان کی متعلق کہانیوں سے بچے کے دل میں تعلیم کی لگن پیدا کرتے ہیں بلکہ شخصیت کے ساتھ ساتھ مختلف سماج کے افراد اور مختلف تہذیبوں کی بھی مثالیں دیتے ہیں۔ ان کے ایک مضمون 'چینیوں کا علم و ہنر' سے یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

'محمد حسین آزاد نے ایک کتاب میں چینیوں کے بڑے دلچسپ حالات لکھے ہیں۔ جس کا نام ہے 'نصیحت کا کرن پھول' اس کتاب میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے چین میں ایک لڑکے کو دیکھا جس کے ماں باپ اپاہج تھے۔ وہ لڑکا اپنے اور ان کے گزارے کے لیے تمام دن محنت کرتا۔ اتنا بھی مقدور نہ تھا کہ ایک پیسے کا تیل لا کر گھر میں چراغ جلائے۔ اس لیے جنگل سے جگنو پکڑ لاتا اور انہیں ایک باریک کپڑے میں رکھ کر کتاب کے صفحے پر رکھ لیتا اور سبق یاد کرتا۔ تھوڑے دنوں میں اسے خدا نے ایسا علم دیا کہ وزیر بن گیا۔ سچ ہے خدا کسی کی محنت اکارت نہیں کرتا۔ چین میں شاید ہی کوئی ایسا بد نصیب آدمی ہوگا جسے پڑھنا لکھنا نہ آتا ہو۔ وہاں عالموں کی قدر فوجیوں سے زیادہ ہے۔ اسی طرح مہاجنوں اور مالداروں سے زیادہ کسانوں کی عزت کی جاتی ہے یہاں تک کہ سال بھر میں ایک دفعہ ان کا سب سے بڑا حاکم خود اپنے ہاتھ سے ہل چلاتا ہے اور چین میں وہ عید کا دن سمجھا جاتا ہے۔'۵۶

اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ان کے مضمون 'ترکوں کی زندگی ہے'۔ اقتباس دیکھیے:

'ترکستان میں وہاں کی حکومت نے تعلیم کے لیے بہت آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ اسکول اور کالج بڑے شہروں کے علاوہ دیہات میں بھی قائم ہیں۔ سینکڑوں بڑے بڑے کتب خانے ہیں۔ جن میں دنیا بھر کے تمام ملکوں کی کتابیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ بہت سے اخبار اور رسالے چھپتے ہیں۔ جن کو پڑھنا وہاں کے لوگ اسی طرح ضروری سمجھتے ہیں جیسے

۵۵۔ سقراط کی تعلیمی دلچسپیاں، مشمولہ، سہ روزہ اخبار مراد (خیر پور) ۱۳ تا ۱۵ نومبر ۱۹۵۸ء، ص ۷

۵۶۔ اردو ادب، پانچواں حصہ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۳ء)، ص ۱۴۲

ہمارے لیے کھانا پینا اور نہانا ضروری ہے۔'۵۷

نسیم کے مضامین کا طرز بھی کہانی سنانے جیسا ہے وہ اس طرح بچے کے احساس کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور غیر محسوس انداز میں تربیت کے راستے دکھاتے رہتے ہیں۔ غلط رسم ورواج اور اوہام کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے سماج کی کچھ تصویریں وہ بچوں کو دکھاتے ہیں جس سے ترقی اور اصلاح کے بہت سے اصول ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ ان کے مضمون 'بیگا سماج کے لوگ' سے یہ اقتباس دیکھیے:

'سی پی صوبے کے اندرونی علاقے میں 'بیگا' نامی ایک قوم رہتی ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ زمین میں زیادہ طاقت کا ہل چلانے سے اس کو زیادہ تکلیف ہوگی اور دیوتا ناراض ہو جائیں گے۔ حکومت نے ان لوگوں کو اس قسم کے بیکار وہموں کے پھندے سے چھڑانے کی بہت کوشش کی ہے۔ ان کے کلہاڑوں پر ٹیکس لگا دیئے۔ ان کا جنگلات کو جانا خلاف قانون قرار دے دیا۔ اور انہیں وادی کے اچھے دیہات میں بسانے کا بندوبست کیا، مگر وہ ایسے لکیر کے فقیر نکلے کہ کسی ایک اصلاح پر بھی رضامند نہ ہوئے۔ یہ لوگ دیوتاؤں اور اچھی بری روحوں کے بہت زیادہ قائل ہیں۔ اور فصل بوتے اور کاٹتے وقت دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے عجیب عجیب رسمیں ادا کرتے ہیں۔ کھیتوں میں بیج ڈالتے وقت گھر کے تمام بڑے بوڑھے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں بیچ میں ایک انڈا رکھ دیتے ہیں اور سب سے زیادہ عمر کا شخص دھرتی ماتا (زمین) سے زیادہ فصل اور اچھی پیداوار کی دعا مانگتا ہے۔ زمین میں بیج ڈالنے سے پودوں کے نکلنے تک ہر قسم کی لذت اور نعمت سے پرہیز کرتے ہیں جس دن بیج بونا ہوتا ہے، اپنے مردہ بزرگوں سے دعا مانگتے ہیں کہ ان کے کھیت میں بہت سا غلہ پیدا ہو جب فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے تو ان لوگوں کے خوشی منانے اور ناچنے گانے کے دن آتے ہیں۔ گاؤں کے سب لوگ اکٹھے ہو کر پہلے بستی کے دیوتا کی مورتی کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ فانی انسان دیوتا کے کرم کے بغیر کوئی چیز نہیں اگا سکتا۔ اس قسم کے کمزور عقیدے کے لوگ 'بیگا' قوم کے علاوہ بھی ہیں جو دنیا کے کئی علاقوں میں رہتے ہیں۔ یہ بے چارے ہر قسم کی ترقی اور اصلاح سے محروم ہیں۔ جس کی تنہا وجہ یہ ہے کہ ان کے علاقوں میں تعلیم کا کوئی انتظام نہیں اگر انہیں

۵۷۔ اردو ادب، پانچواں حصہ (لاہور: کتاب منزل ۱۹۵۳ء)، ص ۵۲

پڑھایا لکھایا جائے تو اپنے دوسرے ہم وطنوں کی طرح یہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔'[۵۸]

سماج میں خوشحالی اور ترقی کا راز اسی بات میں پوشیدہ ہے کہ ماضی کے بوسیدہ خیالات کو چھوڑ کر اور کمزور عقیدوں کے جال سے نکل کر لوگ اس روشنی کو دیکھیں جو آگے نظر آ رہی ہے نسیم معاشرے میں اس ارتقا کے لیے یہ ضروری سمجھتے ہین کہ بالکل ابتدا ہی سے یہ کام کیا جائے یعنی بچوں ہی کے ذہن میں زندگی کی جدو جہد اور سماج میں ترقی و اصلاح کا ایک ایسا بیج بودیا جائے جو کل پورے ماحول اور پورے نظام میں ہری بھری فصلیں اگا دے وہ بچوں کو ایسے مضامین کی طرف مائل کرتے ہیں۔ انہیں ایسی نظمیں سناتے ہیں اور کہانیوں میں ایسا دلکش طرز اختیار کرتے ہیں کہ بچوں کو محنت اور جدو جہد سے لگن ہو جاتی ہے۔ ان کے مضمون 'عاقل میاں کی کہانی' کے اس اقتباس میں معصوم ذہنوں کے لیے محنت کرنے کا جو سبق پوشیدہ ہے وہ اسی حقیقت کا اظہار ہے:

'جب عاقل میاں نے گھی کا کاروبار شروع کیا، اسی روز سے اس کی تقدیر کھل گئی۔ سال ہی بھر میں گھی کی قیمت کے روپے جمع کر کے اس نے دوسری بھینس خرید لی۔ تیسرے برس باپ کے رہن کیے ہوئے کھیت چھڑا لیے اور کھیتی باڑی بھی شروع کر دی۔ وہ اپنے کھیتوں میں بڑی فصلوں کے علاوہ کچھ ترکاریاں بھی بوتا رہتا تھا۔ جن کی قیمت سے اس کے روز مرہ کے اخراجات پورے ہو جاتے تھے۔ محنت کی عادت تو اسے بچپن ہی سے پڑی ہوئی تھی۔ کھیتی باڑی سے جو وقت بچتا اس میں وہ کمبل بُنتا رہتا۔ یہ کام اس نے گاؤں کے کاریگروں سے سیکھ لیا تھا۔ اس سے بھی اسے کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ ماں اور بہنیں بھی گھر میں بیٹھی کمبل بُنتی تھیں۔ ایک بہن شہر میں ایک رشتہ دار کے یہاں جا کر سویٹر بُننا سیکھ آئی تھی اور گھر گرہستی کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ماں بیٹیاں بڑی پابندی سے روزانہ کچھ نہ کچھ ہاتھ کا کام کر لیتی تھیں۔ اس طرح عاقل میاں کو اب خاطر خواہ آمدنی ہونے لگی تھی۔ مگر آمدنی بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا خرچ نہیں بڑھایا تھا۔ جس کی وجہ سے گھر کی تمام ضروریات بفراغت پوری ہو جانے کے بعد اس کے پاس کافی رقم بچ جاتی تھی۔ جسے وہ بڑی احتیاط سے رکھتا تھا۔ کیا مجال تھی کہ ایک پیسہ کسی فضول کام میں

۵۸۔ مشمولہ روزنامہ حریت، کراچی، ۱۹ر مارچ ۱۹۶۳ء، ص: ۳

خرچ ہو جائے۔'[۵۹]

نسیم نے بچوں کے لیے جو کچھ لکھا اس سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اخلاقیات کا پرچار نہیں کرتے اور نہ اسے پروپگنڈ ا بناتے ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بچوں کی تربیت واعظوں کے واعظ سے ممکن نہیں۔'[۶۰] خیر پور سے ان کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار 'مراد' کے ایک اداریے میں انہوں نے بچوں کی تربیت ہی کو اپنا عنوان بنایا۔ اس اداریے کا یہ اقتباس ان کے نظریے کا کھلا اظہار ہے:

> 'کیا ہم بچوں کے لیے صرف ایسا ادب تخلیق کرتے رہیں جو نصیحتوں سے بھرا ہوا ہو۔ کیا یہ نصیحت آمیز مضامین بچوں کی ذہنی نشو ونما کی تمام ذمہ داریاں قبول کر سکیں گے۔ نہیں، قطعی نہیں ہر وقت کی یہ نصیحت انہیں اکتا بھی دے گی۔ ہمیں تو غیر محسوس طریقے سے ان کے بے ریا اور شفاف ذہنوں کو نئی راہیں دکھانا چاہئیں۔' [۶۱]

'مراد' اخبار کے اسی اداریے کے اختتام پر انہوں نے جو عبارت لکھی ہے اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کے ذیل میں وہ نفسیاتی اصولوں کو کتنا پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> 'ہم بچوں سے بڑوں کا کہنا ماننے کے لیے اس لیے نہیں کہتے کہ بڑے کیوں کہ بڑے ہیں اس لیے ان کا کہنا مانا جائے ایسا قطعی نہیں ہے۔ بڑوں کا کہنا اس لیے ماننا چاہیے کہ ان کے تجربات چھوٹوں کے لیے مشعلِ راہ ہوتے ہیں ان کے نقشِ قدم راستے کی نشاندہی کرتے ہیں۔'[۶۲]

نسیم نے مختلف اصنافِ شاعری اور نثری تحریروں میں جتنے بھی کام کیے ہیں ان میں نفسیاتی طرز کو وہ بہت اہمیت دیتے ہیں خصوصاً بچوں کے لیے لکھی جانے والی تحریروں میں اس کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ ان کی ابتدائی عمر درس و تدریس میں گزری۔ بچوں کو بھی انہوں نے تعلیم دی ہے، جس کی وجہ سے ان میں بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کا تجربہ بڑھتا چلا گیا۔ افتد احسن نے ایک مضمون میں اسمٰعیل میرٹھی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

۵۹۔ عاقل میاں کی کہانی، مشمولہ رسالہ پرچم، سکھر، مئی ۱۹۶۲ء، ص ۱۲

۶۰۔ ارشد حبیب، نسیم امروہوی سے کچھ باتیں، مشمولہ خبر نامہ انجمن سادات امروہہ، کراچی، تاریخ اجراء ۲۱ مئی ۱۹۷۳ء، ص ۳

۶۱۔ مراد (سہ روزہ اخبار)، خیر پور، ۱۸ تا ۱۰ / جنوری ۱۹۵۲ء، ص ۲

۶۲۔ ایضاً

'مولوی اسمٰعیل میرٹھی ایک نہایت ہوشیار اور سلجھے ہوئے معلمِ اخلاق تھے ان کی بیشتر عمر تعلیم و تعلم میں گزری اور کیونکہ بچوں کی نفسیات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا چنانچہ جب ان کے لیے لکھنا شروع کیا تو اس مطالعے اور تجربے سے پورا فائدہ اٹھایا۔' ۶۳

اس اقتباس کو پڑھ کر ہمیں نسیم کی شخصیت یاد آتی ہے۔ انہوں نے اپنی سوانح میں اپنے دورِ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے اپنے دادا سے (جو اس وقت زندہ تھے) مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی اکثر تحریریں پڑھنے کا تذکرہ کیا ہے۔ ۶۴ طرزِ اظہار میں بھی ان کی سادہ بیانی اسمٰعیل میرٹھی کی طرح ہے۔ نسیم صاحب کی نظموں اور مضامین میں یہ سادگی بالکل ابتدائی زمانے ہی سے پائی جاتی ہے جبکہ اسمٰعیل میرٹھی کے یہاں ابتدائی دور میں فارسی کا طرز حاوی رہا عبداللہ ولی بخش نے لکھا ہے کہ سرسید کے مشورے پر انہوں نے فارسی رنگ کو خیر باد کہا ۶۵۔ رام بابو سکسینہ نے سلاستِ زبان اور عمدگیٔ مضامین کو اسمٰعیل میرٹھی کی شعری صفات میں شمار کیا ہے۔ ۶۶

نسیم کی تحریروں کا ایک طرف تو سادہ طرزِ اظہار اور دوسری طرف نفسیاتی اصولوں پر ان کی گہری نظر یہ دونوں بنیادیں بچوں کے ذہن پر بہت اثر انداز ہوتی ہیں۔ مختلف موضوعات کی وہ نظمیں جن میں نسیم امروہوی نے نفسیاتی اصولوں کو پیشِ نظر رکھا میرٹھ کے اخبار 'تربیت' میں پہلی بار شائع ہوئیں۔ ۶۷ قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے بچوں کے لیے جو ادب تخلیق کیا اس میں نفسیاتی احساسات بہت اُجاگر نظر آتے ہیں۔ ۶۸ یہ طرز اور یہ سوچ ان کی خود نوشت (جلد اول) میں بھی بہت نمایاں ہے۔

نفسیاتی اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنے دلنشین اندازِ تحریر سے بچے کے ذہن کو متاثر کیا ہے۔ سماج کے گرد و پیش جو حالات پائے جاتے ہیں اس میں بچے کی شخصیت کی تعمیر کس طرح کی جائے اس پر ان کی نگاہ بہت گہری ہے۔ وہ یہ بخوبی جانتے ہیں کہ بچوں کے دل و دماغ کو کس طرح حقیقتوں سے قریب تر لایا جائے۔ 'جنگل' کے عنوان سے انہوں نے جو مضمون لکھا ہے اس میں بچوں کے معصوم دلوں کے

۶۳۔ اسمٰعیل میرٹھی، مشمولہ اردو نامہ، جلد ۳۸، شمارہ ۴ر اکتوبر ۱۹۵۹ء، ص ۴۹

۶۴۔ خود نوشت، سوانح حیات (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۲ء)، ص ۶۷

۶۵۔ اسمٰعیل میرٹھی، مشمولہ کتاب نما (دہلی)، جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۶۷

۶۶۔ تاریخِ ادب اردو (لکھنؤ: نولکشور، ۱۹۳۰ء)، ص ۴۹۸

۶۷۔ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۳

۶۸۔ نسرین عباس رضوی، بچوں کا ادب اور نسیم امروہوی، مشمولہ روزنامہ حریت، کراچی، ۲۴ر فروری ۱۹۸۹ء، ص ۳

لیے تربیت اور تعلیم کے کئی پہلو ہیں ایک اقتباس دیکھیے :

’اے کانٹو! تم میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ کبھی چبھ جاتے ہو۔ مگر تمہاری لکڑی سے پکے ہوئے کھانوں کی سوندھی سوندھی خوشبو ہمیں بہت بھاتی ہے۔ جس سے دل بھی خوش ہوتا ہے اور بدن میں طاقت بھی آتی ہے۔ جنگلوں میں ہمیں اپنی ضرورت کی اور بھی کئی چیزیں ملتی ہیں۔ یہ کاغذ جس پر ہم لکھتے ہیں اور جس سے ہماری کاپیاں اور کتابیں تیار ہوتی ہیں، اسی لکڑی سے تو بنتا ہے جو جنگلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر جنگل نہ ہوں تو پھر ہمیں لکھنے پڑھنے میں کتنی مشکل پڑے۔‘[۶۹]

اس طرزِ اظہار میں کتنی مٹھاس ہے۔ یہی سادگی، یہی مٹھاس اور کہانی سنانے جیسا یہی انداز ان کی تحریروں کی سب سے نمایاں خوبی ہے۔ چوتھی جماعت کے بچوں کے لیے انھوں نے جو مضامین لکھے ان میں سے بعض ’مراد‘ اخبار میں بھی شائع ہوئے۔ نوعمر بچوں کو اخبار کی دریافت سے باخبر رکھنے کے لیے انھوں نے کتنا دلنشین اور دلچسپ طرز اختیار کیا ہے :

’ایک بار ایسا ہوا کہ انگلستان اور اسپین میں لڑائی ہوگئی۔ شہروں میں روزانہ لڑائی کی خبریں آتی تھیں۔ لوگ خبریں سننے کے شوق میں بے قرار رہتے تھے۔ لڑائی نے طول کھینچا یہاں تک کہ گرمی کا موسم آ گیا۔ امیر لوگ دیہات میں چلے آئے۔ اب ان کو لڑائی کی خبریں ملنا بند ہوگئیں۔ اس لیے لوگ اپنے اپنے نوکروں کو شہر میں بھیج بھیج کر خبریں منگانے لگے۔ خاص اس کام کے لیے روزانہ سیکڑوں آدمی شہر آیا کرتے تھے۔ کچھ دن کے بعد ان نوکروں نے سوچا کہ الگ الگ چیزیں جمع کرنے میں بہت سا وقت تو برباد ہوتا ہے، مگر پوری پوری خبریں نہیں ملتیں۔ کسی کو دو خبریں ملیں کسی کو چار اس لیے انھوں نے ایک نئی ترکیب نکالی۔ سب کے سب ایک جگہ جمع ہو جاتے اور ساری خبریں کاغذوں پر الگ الگ لکھ کر اپنے مالکوں کے پاس لے جاتے۔ اس ترکیب سے ہر ایک امیر کو بہت سی خبریں ملنے لگیں۔ جب ان نوکروں نے دیکھا کہ ان کی جمع کی ہوئی خبریں بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں، تو انھوں نے سوچا کہ ہم کسی کی نوکری کیوں کریں۔ کیوں نہ خبریں جمع کر کے الگ الگ پرچوں پر لکھ کر امیروں کے ہاتھ بیچ دیا کریں۔ یہ سوچ کر بہتوں

۶۹۔ نسیم اردو، حصہ دوئم (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۳ء)، ص ۱۹

نے اپنی اپنی نوکریاں چھوڑ دیں۔ اور شہر میں اپنا باقاعدہ دفتر قائم کرلیا۔'' ۷۰

بچے کا ذہنی سفر، مقامی سماج سے عالمگیر سماج تک

'عصر جدید اور بچوں کے رسائل' کے تحت لکھتے ہوئے ڈاکٹر محمود الرحمان اہلِ قلم کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ آج کے اس عالمگیر معاشرے میں جو سائنس اور ٹیکنالوجی کا معاشرہ ہے انہیں نئی ترجیحات سے واقفیت حاصل کرنا ہوگی۔ بچوں کی پسند و ناپسند کا تعین کرنا ہوگا اور ان تمام عناصر کا مکمل سروے اور جائزہ لینا ہوگا کہ عہدِ جدید کا بچہ کیا چاہتا ہے ۷۱ لیکن سوال یہ ہے کہ آج کا بچہ جو چاہے کیا اسے وہ فراہم کر دینا چاہیے؟ ڈاکٹر محمود الرحمان خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

'لیکن اس سروے اور جائزے کا یہ مطلب نہیں کہ اگر بچے جدید تہذیب کی رو میں بہہ کر مخرب اخلاق لٹریچر پسند کرتے ہوں تو ہم ان کی چاہت کا خیال رکھیں وہ ہوشربا قسم کی کہانیوں کے خوگر ہیں اور پاپ سونگ جیسے نغمے طلب کرتے ہوں تو ہم یہ سامان انہیں بلا تردد مہیا کریں نہیں ہرگز نہیں ہمیں تو ان کی صحیح رخ پر تربیت کرنی ہے اور انہیں خیر و سلامتی کا راستہ دکھانا ہے۔'' ۷۲

اس سائنس و ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ اور ہنگامہ خیز دور میں نسیم صاحب کی فکر کا ہدف بچوں کے بارے میں یہی ہے جس کا ذکر درج بالا اقتباس کی آخری سطر میں ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے کیا ہے۔ یعنی صحیح رخ پر تربیت کرنا اور انہیں خیر و سلامتی کا راستہ دکھانا۔ نسیم صاحب بچے کو اس جدید سماج میں کسی مشین کا کل پرزہ بنا دینے پر آمادہ نہیں۔ وہ جدید ارتقا سے مکمل طور پر باخبر ہیں لیکن وہ ان سب نئی ترقیوں میں شامل ہو جانے سے پہلے بچے کی بنیادی شخصیت کو بنانا چاہتے ہیں اس بارے میں ان کی فکر کا حاصل یہ خیال ہے:

'نئے علوم کا حصول اور ماحول کے ارتقائے جدید سے ہم کنار ہونے کا میں مخالف نہیں ہوں لیکن اگر آپ کی بنیادی تربیت ہی نہ ہو سکی اور آپ انسان کے اعلیٰ وارفع مقصدِ حیات ہی کو نہ پہچان سکے تو پھر جدید ترقی محض مادی اغراض تک رسائی سے زیادہ اور کچھ

۷۰۔ اخبار کی دریافت، مشمولہ سراد (خیر پور) اشاعت، ۱۷ نومبر ۱۹۵۷ء ص ۱۹

۷۱۔ ماہنامہ کتاب نما، لاہور، دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۳

۷۲۔ ایضاً، ص ۳۲

نہ ہو سکے گی۔'۴۳ے

میڈیا کے اس ترقی یافتہ زمانے میں بچہ جب اپنے معاشرے سے دنیا کے معاشرے میں داخل ہوتا ہے یعنی جب اس کا ذہنی سفر مقامی سماج سے عالمگیر سماج کی طرف ہوگا تو کیا اسے محض مادی ضرورتوں کے تحت آگے چلنا ہوگا اگر ایسا ہوا تو پھر سماج میں اعلیٰ اقدار جنم نہیں لے سکیں گی۔نسیم کے اس درج بالا اقتباس میں اعلیٰ وارفع مقصدِ حیات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ان کی کہانیوں اور نظموں میں اسی بات کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔انسان کا احترام، انسانیت سے محبت اور رشتوں کی حرمت ان کی چھوٹی چھوٹی نظموں میں بھی ابھرتی ہے۔بچوں کو جو تربیت دی جائے اس میں سب سے بڑھ کر کس بات کا خیال رکھا جائے ڈاکٹر ممتاز حسن اس بارے میں لکھتے ہیں:

> 'سب سے بڑھ کر انہیں انسانیت کی عظمت اور اعلیٰ اقدار کے متعلق بتانا چاہیے انہیں دوسرے انسانوں کی عزت کرنا اور ان سے عزت کرنے کے طریقے سیکھنے چاہئیں اور اس کا اطلاق خاص طور پر ان کے والدین، اساتذہ، بھائیوں، بہنوں اور ہم جماعت طلبا پر ہونا چاہیے تعلیم کا کوئی ذریعہ اس وقت تک کوئی وقعت نہیں رکھتا جب تک وہ دوسرے کی عزت وتکریم کرنا نہ سکھائے۔'۴۴ے

بچے میں فطری طور پر اچھے اور برے دونوں جذبات ہوتے ہیں۔جھوٹ، سچائی، بدی، نیکی، دوستی، دشمنی، رحم، حسد، غصہ، نفرت ومحبت یہ سب جذبات بچے میں کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہوتے ہیں۔نسیم صاحب جو بچوں کے مزاج اور ان کی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں اپنی تحریروں میں ایسے پہلو نمایاں کرتے ہیں جن سے بچے میں انسانیت کی طرف جانے کی امنگ پیدا ہو۔

'نسیمِ اردو' حصہ اول کے انتیسویں سبق 'سب برابر ہیں' کا یہ مضمون دیکھیے یہ بالکل نو عمر بچوں کی تعلیم کا حصہ ہے:

> 'ہماری سانس ہر دم ہمارے ساتھ ہے پر دکھائی نہیں دیتی۔اللہ بھی ہر دم ہمارے ساتھ ہے پر دکھائی نہیں دیتا، سورج، چاند، تارے اسی کے حکم سے نکلتے ہیں اسی کے حکم سے ڈوب جاتے ہیں۔وہ ہی ہوا چلاتا ہے۔وہ ہی پانی برساتا ہے۔وہ ہی اناج اگاتا ہے۔

۷۳۔ دیباچہ، مشمولہ چند حکایتیں چند کہانیاں، علی نظر امروہوی (خیر پور: ادارہ اسلامی، ۱۹۵۹ء) ص ۳

۷۴۔ بچوں کے ادب کی اہمیت، چند بنیادی مسائل، چند اہم تجاویز، مشمولہ ہم قلم، شمارہ اگست، ستمبر ۱۹۷۱ء، ص ۲٦

اس کا اناج اچھے آدمی بھی کھاتے ہیں اور برے لوگ بھی، اس کی ہوا، گرمی میں سب انسانوں کو ایک سی ٹھنڈک پہنچاتی ہے ۔اس کا سورج جاڑے میں سب برے بھلے آدمیوں کو ایک سی دھوپ دیتا ہے۔اس کا بادل مالدار اور غریب دونوں کے کھیت میں برابر پانی برساتا ہے اس کے لیے سب برابر ہیں۔ ہمیں بھی چاہیے کہ سب کو برابر سمجھیں۔' ۵ے

خدائے بزرگ و برتر کا ذکر اپنی تحریروں میں وہ ایک پرکشش انداز سے لے کر آتے ہیں۔ تاکہ بچہ اس سے لطف اندوز بھی ہو اور غیر محسوس طور پر اس کی تعلیم و تربیت بھی ہوتی رہے۔ ایسے موقع پر وہ عموماً کہانی کا طرز اختیار کر لیتے ہیں۔ چار سو تراکیب کے معانی اور تشریحات پر مشتمل ان کی ایک کتاب 'ادبی کہانیاں' کے نام سے معروف ہے یہ کتاب اگرچہ براہ راست بچوں کے لیے نہیں ہے لیکن اس میں بچوں کے لیے تربیت کے بڑے خزانے ہیں۔ قرآن حکیم میں درج ایک واقعے کو وہ اپنے الفاظ میں بچوں کے لیے لکھتے ہیں تو اس میں اپنے پرکشش طرزِ اظہار اور طرزِ بیان سے تعلیم و تربیت کے پہلو بھی نکال لیتے ہیں:

'حضرت سلیمانؑ ایک مشہور نبی اور جلیل القدر بادشاہ تھے۔ان کا تخت ہوا میں اُڑا کرتا تھا ایک دن آپ نے اپنے تخت کو زمین پر اترنے کا حکم دیا۔ اتفاق سے وہاں چونٹیوں کا لشکر جمع تھا۔ چیونٹیوں کے سردار نے اپنے لشکر سے کہا کہ تم سب بلوں میں گھس جاؤ تم کو سلیمان کا لشکر بے خبری میں کہیں پاؤں سے نہ روند ڈالے۔ سلیمانؑ نے یہ کلمات سن لیے اور اس چیونٹے کو اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر بٹھالیا۔ اور بولے تو اپنی رعایا پر بہت مہربانی کرتا ہے۔ اس نے کہا اے اللہ کے نبی! ان کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم سمجھتا ہوں۔ حضرت نے پوچھا، ہر وقت تیرے ساتھ کتنی چیونٹیاں رہتی ہیں۔اس نے کہا چالیس ہزار چوبدار ہیں۔ سلیمانؑ نے کہا میری حکومت بہتر ہے یا تیری؟ چیونٹا بولا کہ میر ی حکومت بہتر ہے۔ کیونکہ ہوا آپ کے تخت کو اٹھاتی ہے اور تخت آپ کو اٹھاتا ہے۔ مگر میں اپنی حکومت میں کسی کا محتاج نہیں۔ سلیمانؑ یہ سن کر ہنس پڑے اور پوچھا۔ یہ بات سمجھنے کی عقل تجھے کس نے دی ہے؟ چیونٹے نے کہا اس اللہ نے جس نے مجھے اور آپ کو

۵ے۔ نسیم اردو، حصہ اول (لاہور: کتاب منزل ۱۹۵۳ء)، ص ص ۳۶، ۳۷

حکومت عطا کی ہے۔[۷۶]

نسیم اس بات کا بہت ادراک رکھتے ہیں کہ بچوں سے گفتگو کرنے میں کیسا طرز بیان اختیار کرنا چاہیے انہوں نے مختلف اصنافِ سخن پر لکھتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ:

'غزل کے الفاظ اور محاورات، نازک، نرم، سبک اور لچکیلے ہوتے ہیں، قصائد میں شکوہ الفاظ اور عظمتِ تراکیب کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، مرثیہ کے لیے پُر سوز الفاظ اور مانوس الجنس محاورے استعمال کیے جاتے ہیں افسانوں کی زبان جداگانہ ہوتی ہے، تاریخی وعلمی مضامین کا اسلوب کچھ اور ہوتا ہے، عورتوں اور بچوں کے لیے جو لٹریچر تیار کیا جاتا ہے اس کی بولی اور طرز بیان بھی مختلف ہوتا ہے۔'[۷۷]

پانچویں جماعت کے بچوں کی نصابی کتاب 'اردو ادب' کا پیش لفظ[۷۸] جو نسیم امروہوی نے تحریر کیا ہے اس سے ان کے فکر وخیال کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بچوں کے نصاب کو ترتیب دیتے ہوئے کن خیالات اور کن باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اس پیشِ لفظ کے چند اقتباس ملاحظہ کیجیے:

۱۔ 'مادری زبان کے سلسلۂ تعلیم کی یہ پانچویں ریڈر حلقۂ وفاقیہ کراچی کے جدید نصابِ تعلیم (جاری شدہ ۱۹۵۷ء) کے تحت مرتب کی گئی ہے جو مجموعی طور سے حسب ذیل موضوعات کے پچپن سبقوں پر مشتمل ہے۔ کہانیاں ۱۲/ غیر ممالک کے باشندے، ۷/صحت، ۴/ پاکستان، ۴/سوانح حیات، ۸/ جنرل سائنس اور مطالعۂ قدرت، ۴/شہریت اور وطن، ۴/نظمیں، ۱۲/'

۲۔ 'ان اسباق کی ترتیب و تالیف میں نصب العین یہ ہے کہ آموختہ کا اعادہ کرتے ہوئے بچوں کو اس قابل بنا دیا جائے کہ: (۱) دل و دماغ کی جامعیت کے اعتبار سے، ان میں اسلام کی اخلاقی اور معاشرتی قدروں کی اہمیت کا احساس پیدا ہو اور وہ بنی نوع سے خیر سگالی، ہمدردی، عدل وانصاف، اخوت، مساوات اور ایثار وقربانی کے سلوک کے عادی ہوں۔ اور اسلامی نیز غیر اسلامی تقریبات ورسوم سے بڑی حد تک واقف ہو جائیں۔'

۷۶۔ ادبی کہانیاں (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۵۴ء) ص ص ۱۲۱، ۱۲۲

۷۷۔ اردو ادب، پانچواں حصہ (لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۴ء) ص ص ۳، ۴

۷۸۔ ایضاً

۳۔ 'انہیں پرندوں اور جانوروں سے متعلق ایسی مشاہداتی اور عملی باتیں بتائی جائیں، جن میں ان خصائل و عادات پر بھی روشنی پڑ جائے جو انسان و حیوان میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔'

۴۔ انہیں خدائے تعالیٰ کی ہستی، اس کی کاریگری اور بنی نوع انسان پر اس کے انعامات و افضال سے متعلق وہ باتیں معلوم ہو جائیں، جو اس عمر کے بچوں کو جاننا چاہییں۔'

۵۔ 'وہ محاسن اخلاق سے آراستہ ہوں۔ ان میں اخوت، ہمدردی، برابری، رواداری، عدل و انصاف، ایثار و قربانی، تحمل و برداشت کا جذبہ پیدا ہو۔ سماج اور اس سے متعلقہ ذمہ داریوں سے متعارف ہوں اور اسلامی اور غیر اسلامی تقریبات سے روشناس ہو جائیں۔'

۶۔ 'وہ مشاہیرِ عالم اور پاکستان و بانیِ پاکستان کے حالات سے واقف ہوں اور پاکستان کے مشہور مقامات، اشخاص، وسائل و ذخائر اور اس کی دولت و عظمت کے متعلق اتنا کچھ جان جائیں جس سے ان کے دل میں وطن کی محبت اور عظمت کا احساس پرورش پائے۔'

۷۔ 'وہ سبق کے جملوں اور عبارتوں میں اپنے ماحول کی ہو بہو تصویر دیکھ کر محظوظ ہوں اور انہیں مظاہرِ قدرت و فطرت، صحت اور روز مرہ پیش آنے والی باتوں سے متعلق ایک حد تک معلومات حاصل ہو جائیں۔'

۸۔ 'زیرِ نظر کتاب میں بچوں کے احساس و ادراک کو غیر شعوری طور پر مذکورہ بالا نصب العین سے متاثر و منفعل کر کے ان کی قوائے عمل کو حرکت میں لانے کی کوشش کی گئی ہے اور سبقوں کے اہم اجزاء کو تصاویر کے ذریعے زیادہ موثر اور دلچسپ بنا کر موضوع کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔'

نسیم صاحب کی ان کتابوں کو اردو کی مقبول ترین درسی و نصابی کتابیں قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر حسین محمد جعفری نے ان کی ہمہ جہت شخصیت کے حوالے سے لکھا ہے:

'نسیم صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کا اس سے بڑا اور ثبوت کیا ہوگا کہ ایک طرف تو فلسفہ و منطق کی مشکل ترین کتابوں کے درس دیتے تھے اور دوسری طرف وہ اردو کی مقبول ترین درسی و نصابی کتابیں لکھتے تھے۔'[۷۹]

۷۹۔ منتشر سطریں، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۶۰

فلسفہ ومنطق کی مشکل ترین کتابوں کے حوالے سے ان کے لیکچراں کی علمی شخصیت اور ان کے فلسفیانہ ذہن کا اظہار ہیں۔اس کے باوجود انہوں نے بچوں کی درسی ونصابی کتابوں کو جب ترتیب دیا تو ان کو علم وفلسفے سے بوجھل نہیں ہونے دیا۔درسی کتابوں تک ہی محدود نہیں ہے ان کے مرثیوں میں بھی جہاں بچوں کے کردار سامنے آتے ہیں وہاں 'جس طرح انہوں نے بچوں کی عادات، اندازِ گفتگو اور ذہنی سطح کی تصویر کشی کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ لیکن جہاں وہ کسی فکری پس منظر میں بچوں کے موضوع کو زیرِ بحث لاتے ہیں تو وہاں ان کا علمی وفلسفیانہ نقطۂ نگاہ نمایاں ہونے لگتا ہے۔

عہدِ طفلی بھی عجب عالمِ القائی ہے

نسیم صاحب نے اپنے آخری دور کے ایک مرثیے کے ابتدائی حصے یعنی چہرے میں 'عہدِ طفلی' پر اظہارِ خیال کیا ہے اس بارے میں انہوں نے جن پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے اس سے عہدِ طفلی کی اہمیت اور اس کے پوشیدہ کمالات پر روشنی پڑتی ہے۔اردو میں ایسی نظمیں ناپید ہیں جن میں اس طرزِ احساس سے بچے کی زندگی کے بالکل ابتدائی دور پر لکھا گیا ہو۔اس نظم کا مصرع اول یہ ہے:

عہد طفلی بھی عجب عالم القائی ہے[۸۰]

القا کے متعلق خود نسیم یہ تشریح کرتے ہیں:

'القا یعنی وہ بات جو کسی کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہو۔'[۸۱]

یعنی جب ایک طفلِ نوخیز سمجھنے اور سیکھنے کی منزل میں نہیں ہوتا اس وقت اس کے طور طریقوں سے جن چیزوں کا اظہار ہوتا ہے وہ صرف ودیعتِ الٰہی ہیں۔ایک طرح سے نسیم صاحب حیاتِ انسانی پر خالقِ کائنات کی عنایت سے اپنی نظم کا آغاز کرتے ہیں۔وہ کیونکہ قرآن وحدیث پر دسترس رکھتے ہیں اس لیے ان کی فکر بہت بامعانی اور بامقصد ہوتی جاتی ہے جس میں محض شعری مبالغہ نہیں ہوتا بلکہ ایک حقیقی فکر ہوتی ہے۔جو شعر کا لباس پہن کر ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔یہ نظم بچوں کے پڑھنے کے لیے نہیں لکھی گئی بلکہ یہ ان کے عہدِ طفلی کے بارے میں ایک علمی وفلسفیانہ اظہار ہے جس سے ہم نسیم کی بصیرت کو سمجھ سکتے ہیں کہ بچوں پر لکھنے والا ایک شاعر کتنے شعور کے ساتھ اِس میدان میں آیا ہے۔اس طویل رثائی نظم

۸۰۔ نسیم امروہوی، مراثیِ نسیم (جلد سوم) (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۶ء)، ص ۳۷۷

۸۱۔ نسیم اللغات (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، پہلا ایڈیشن، ۱۹۵۵ء)، ص ۹۵

کے صرف ۹ بند ہم یہاں نقل کر رہے ہیں: نظم ۱۰۵ ر بندوں پر مشتمل ہے۸۲؎

عہدِ طفلی بھی عجب عالمِ القائی ہے　　راست الہام سے ایک ایک ادا پائی ہے
حسن کی گود ہے۔ گہوارۂ رعنائی ہے　　فصلِ گل ایک ہی غنچے میں سمٹ آئی ہے
عیب جوئی میں نہ شامل نہ سخن چینی میں
کس قدر سادۂ و بے رنگ ہے رنگینی میں

سو رہا ہے تو ہے سرمستی ہشیار کا ڈھنگ　　جاگتا ہے تو ہر اک خواب لطیف و خوش رنگ
شوخی و سادگی و خودنگری ہم آہنگ　　کبھی خوش، اور کبھی تنگیٔ آغوش سے تنگ
رمز و ایما کی فصاحت ہے تکلم اس کا
حسن فطرت کا تبسم ہے تبسم اس کا

صاف ہے عارضِ نوخیز میں پھولوں کا نکھار　　وہ جبیں نرم وہ نازک کہ پسینہ بھی ہو بار
گردشِ چشم میں وہ شاہد فطرت کا وقار　　بشریت میں وہ جلوے کہ ملائک ہوں نثار
سر بسر آئینۂ عظمت قیوم ہے یہ
اس کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے کہ معصوم ہے یہ

لاکھ نغموں کا خلاصہ ہے چہکنا اس کا　　روشنی دیکھ کے ہر بار چمکنا اس کا
ذوقِ جلوہ کی سند چاند کو تکنا اس کا　　صرف تکنا ہی نہیں، بلکہ ہمکنا اس کا
ضو جو بڑھ بڑھ کے ادھر چاند سا منھ چومتی ہے
اس کی قلقاریوں پر شمع کی لو جھومتی ہے

اس کی ہر سانس ہے اک عالمِ فردوس خیال　　نہ کوئی حسرت و حرماں، نہ کوئی رنج و ملال
سب ہیں یکساں، سحر و شام ہوں یا وقتِ زوال　　جب تو کہتے ہیں کہ طفلی ہے بہشتِ اطفال
کھیل میں مست بھی ہے، فکر سے محروم بھی ہے
یہ وہ دنیا ہے کہ محسوس بھی موہوم بھی ہے

۸۲۔　مراثی نسیم، جلد سوم (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۶ء)، ص ۳۰۷ تا ۳۹۷

نبض، احساس کی ہوتی ہے اسی عہد میں تیز — اس کا ہر لمحۂ سرشار ہے جذبات انگیز
بول مہمل بھی ادھورے بھی لطافت آمیز — واہ کیا بات ہے اس گل کی جو گل ہو نو خیز

پاک جو گردِ تکلف سے جبیں ہوتی ہے
عہدِ طفلی میں ہر اک چیز حسیں ہوتی ہے

برگِ گل سے بھی ہے یہ عہد کہیں نازک تر — منزل نوع بشر کا ہے یہ آغازِ سفر
اس کی فطرت میں نہ ہے کذب، نہ فتنہ ہے نہ شر — پاک ہوتا ہے ہر اک عیب سے طفلی میں بشر

اس کے ماتھے پہ ستاروں کی چمک ہوتی ہے
طفل سادہ میں فرشتے کی جھلک ہوتی ہے

قوتیں نشوونما کی جو ہیں پنہاں اس میں — عالمِ غیب کی شمعیں ہیں فروزاں اس میں
فطرۃً دخل جو پاتا نہیں شیطاں اس میں — عکس ہوتا ہے ولایت کا درخشاں اس میں

نیک سے، بد سے، کسی سے بھی سروکار نہیں
مٹھیاں بند ہیں، دنیا کا طلب گار نہیں

ہے یہی عہد، تخیل کی جوانی کا نقیب — اس کی گفتار عجوبہ ہے، تو رفتار عجیب
نہ مفکر، نہ مقنن، نہ مورخ، نہ ادیب — پھر بھی طینت کو ہر اک جوہر کردار نصیب

حال کی گود میں ماضی کا یہی حاصل ہے
طفلِ امروز ہی صورت گرِ مستقبل ہے

یہ نظم قلمی صورت میں نسیم امروہوی صاحب کے نایاب ادبی ذخیرے میں محفوظ ہے جب اس کے متعلق راقمۂ حروف نے ان کے صاحب زادے سے ایک خط میں دریافت کیا تو انہوں نے اس پر تفصیلی اظہار خیال کیا جس کا ایک حصہ ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں: ۸۳؎

'یہ غالباً ۱۹۷۸ء کے آخری دنوں کی بات ہے وہ حضرت آدم کی خلقت اور نسلِ انسانی کے زمینی سفر کے بارے میں ایک طویل نظم لکھنا چاہتے تھے۔ بعد میں اپنے اس خاکے میں انہوں نے کچھ ردوبدل بھی کی اس کا مطلع یہ تھا:

کیوں زمانے میں ہوئے حضرت آدم پیدا

۸۳۔ مکتوب قسیم ابنِ نسیم، مرقومہ ۲۶/اپریل ۲۰۰۱ء کراچی

ابھی وہ اس مرثیے کا چہرہ لکھ رہے تھے کہ ایک موقع پر انہوں نے اپنے دیرینہ دوست جناب سبط حسن انجم کو گھر پر بلایا اور بند سنائے میں بھی اس موقع پر موجود تھا۔ فرما رہے تھے کہ وہ اس طویل حصے کو مرثیے کے چہرے میں شامل کریں گے اور یہ ان کی زندگی کا طویل ترین مرثیہ ہوگا۔ اس میں بنیادی طور پر عہدِ طفلی کو موضوع بنایا جائے گا۔ اس گفتگو میں قرآن وحدیث اور بعض دوسرے علمی وفلسفیانہ توجیہات سے انہوں نے عہدِ طفلی سے متعلق جو باتیں کہیں ان میں بڑے حکیمانہ پہلو تھے وہ یہ بات اکثر کہا کرتے تھے کہ ایک ترقی یافتہ معاشرے اور ایک مثالی سماجی زندگی کی اساس ہی اس پر قائم ہوگی کہ بچوں کی تربیت آج ان نفسیاتی اصول کی روشنی میں کی جانی چاہیے جو آج کی اس ترقی یافتہ دنیا میں ہزار ہا سال کے تجربات کے بعد ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کے ذہن کو کریدا جائے، ان کی الجھنیں اور مسائل سمجھے جائیں اور پھر یہ کہ طفلی کے معصوم اور بے ریا عہد میں خالقِ کُل کی طرف سے جو جذبے، احساسات اور تعلیم ودیعت کی گئی ہے اس موضوع پر لکھنے والے کو اس کا ادراک ہونا چاہیے یہی اس کا عالمِ القائی ہے۔ حضرت آدم اور ان کی نسل سے متعلق اس مرثیے کے آغاز میں انہوں نے کمسنی اور طفلی پر بڑی عالمانہ باتیں لکھیں۔ یہ مصرع اسی دوران کہا تھا:

عہدِ طفلی بھی عجب عالمِ القائی ہے

۱۹۷۹ء میں وہ کیوں کے ترقی اردو بورڈ حکومت پاکستان کی طرف سے لغت سازی کے اپنے حصے کے کام کو نمٹا رہے تھے تو وہ اس نظم کو بہت آگے نہیں بڑھا سکے لیکن کم از کم ۲۵ بند اس مصرع کے تحت انہوں نے لکھے ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ بند میرے پاس موجود ہیں۔ اس حصے کو بعد میں انہوں نے حضرت آدم کے متعلق طویل نظمیہ حصے سے علیحدہ کر لیا تھا۔ ان کی وفات سے ایک سال پہلے مراثی نسیم جلد سوم (۱۹۸۶ء) میں اس کا بیشتر حصہ شائع ہو چکا ہے۔'

پانچواں باب

نسیم امروہوی اور سندھی ادب وثقافت کی ترجمانی

- پاکستان کی علاقائی زبانوں کا مطالعہ
- لوک ادب میں سماج کی عکاسی
- سندھی ادب اور ارضی تہذیب
- اردو اور سندھی کے لسانی روابط میں سماجیاتی پہلو
- سندھ میں ایک تعلیم یافتہ اور سویلائزڈ معاشرے کی ضرورت
- انجمنِ ترقی اردو خیر پور
- سندھی اور اردو پر مشتمل ذوالّلسانی اخبار مراد
- مراد کی اشاعت کے عمرانی اثرات
- تاریخِ خیر پور
- سندھی زبان کے اہم شعرا کے افکار
- بے معنی گوشہ نشینی سے انحراف
- سچل سے نسیم امروہوی تک
- کلیاتِ ناز
- فرہنگِ لطیف
- سندھی میں تفسیرِ قرآن
- سندھ کی مظلوم عورتوں اور حقدار بستیوں کے حقوق

پانچواں باب

نسیم امروہوی اور سندھی ادب وثقافت کی ترجمانی

نسیم امروہوی کی ادبی خدمات اور ان کی شعری اور نثری تحریروں کے سماجی مطالعہ کے دوران ہم سندھی ادب و ثقافت کی ترجمانی کے ذیل میں ان کے اس ذہنی سفر کو فراموش نہیں کر سکتے جو پاکستان میں ان کی ایک بنیادی شناخت کی حیثیت رکھتا ہے۔ سندھ کے ممتاز اہلِ قلم اور دانشوروں نے اس حوالے سے ان کی خدمات کو بہت اہمیت دی ہے۔ پیر حسام الدین راشدی اور کریم بخش خالد کی تحریروں کے درج ذیل اقتباس سے ہم بخوبی سندھی ادب و ثقافت کے ذیل میں ان کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ نسیم امروہوی جب ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور سندھ کے شہر خیر پور میں بود و باش اختیار کی تو اس حوالے سے پیر حسام الدین راشدی کے تاثرات یہ تھے:

> "نسیم سندھ میں کب آئے اور کیوں آئے یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن جب یہاں پہنچے تو خیر پور میں جا کر بود و باش اختیار کی اور اپنی شرافتِ نسبی اور فضائلِ شخصی کی وجہ سے پناہ گیرا (یہ لفظ ۱۹۴۷ء میں ہندوستانیوں کے لیے بولا جاتا تھا جو بعد میں ختم ہو گیا) نہیں بنے بلکہ زمین و مکان کے علاوہ خیر پور کے باشندوں نے اپنے دلوں میں بھی آپ کو جگہ دی جو شرف بہت کم ہی حضرات کو نصیب ہوا ہے۔ نسیم صاحب اور میری پہلی ملاقات ۱۹۵۲ء میں خیر پور میں ہوئی جب آپ نے اردو کانفرنس بلائی اور میں مولوی عبدالحق مرحوم کے قافلے میں وہاں پہنچا۔"[۱]

۱۔ نسیم صاحب کو جیسا میں نے پایا، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ، فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۱۳

نسیم امروہوی کی یاد میں منعقدہ ایک تعزیتی اجتماع میں صدر جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے سندھی زبان کے معروف محقق کریم بخش خالد نے کہا:

'میں ان کا پاکستان میں آ کر سندھ میں آباد ہونا عطائے الٰہی سمجھتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کراچی یونیورسٹی میں 'نسیم امروہوی چیئر' کا بندوبست فرمائیں۔ ایسے اقدام سے آپ سندھ کی عظیم علمی روایات کے احیاء کا آغاز کریں گے اور ٹھٹھہ، حیدرآباد اور خیر پور کے دبستانوں کے فراموش شدہ ادبی ورثے کو نئی زندگی عطا کریں گے۔ صوبہ سندھ نے ہمیشہ مسلمانانِ ہند کے ساتھ مل کر قومی نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں میں بھر پور کردار ادا کیا ہے اور سندھی، سرائیکی، فارسی اور اردو شعر وسخن کی سرپرستی کی ہے۔'[۲]

ہجرت کے بعد نسیم امروہوی کی سندھ میں آمد پر اور پھر ایک طویل ادبی خدمات کے سفر کے بعد ان کی وفات پر سندھی زبان، تاریخ اور ثقافت کی دو اہم شخصیات کی درج بالا آراء سندھی ادب و ثقافت کے ذیل میں ان کے مقام و مرتبے کا اظہار ہے ڈاکٹر شاہدہ بیگم اپنے تحقیقی مقالے 'سندھ میں اردو' میں لکھتی ہیں:

'پاکستان بننے کے بعد کتنے ہی ادیب و شاعر خیر پور پہنچ گئے جن میں نسیم امروہوی سب سے معروف شخصیت ہیں۔'[۳]

سندھ خصوصاً خیر پور سے نسیم کی ذہنی وابستگی کا تعلق ان کے بزرگوں کے عہد سے قائم ہوا۔ انہوں نے اپنے سب سے پہلے مرثیے 'گلِ خوش رنگ' میں اپنے لوگوں، اپنے خاندان اور اپنی برادری کا تعارف کراتے ہوئے یہ مصرع لکھا:

یہ وہ مظلوم ہیں جو عدل کی اولاد یں ہیں۔

عدل کے تعارف میں انہوں نے حاشیے میں یہ عبارت لکھی ہے کہ 'میر عدل اکبر اعظم کے دور میں سندھ کے قاضی اور سادات امروہہ کے مورث تھے۔'[۴] نسیم امروہوی کے دادا اور اپنے عہد کے نامور سخنور

۲۔ نسیم امروہوی کے علمی وادبی کارناموں پر ایک نظر، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، طبع اول فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۱۰۶

۳۔ (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، جون ۱۹۸۰ء)، ص ۱۸۹

۴۔ مراثی نسیم جلد دوم (کراچی: پاکستان ریڈرس گلڈ، ۱۹۷۶ء)، ص ۳۳۳

شیم امروہوی کے خیر پور میں مدعو کیے جانے کا ذکر ڈاکٹر شاہدہ بیگم نے اپنے مقالے میں کیا ہے۔[۵]

ڈاکٹر وفا راشدی سندھی زبان کے ایک شاعر میر غلام حسن احسن کو خیر پور کا جلیل القدر سپوت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'انہوں نے اپنے اردو کلام پر شیم امروہوی سے اصلاحیں لیں تھیں'[۶] علمی و ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ایک پس منظر یہ بھی تھا جس کے سبب نسیم کی سندھ خصوصاً خیر پور میں بڑی قدر و منزلت تھی دوسرا پس منظر یا دوسرا سبب ان کا نسل سادات سے ہونا تھا۔ سندھ کے رہنے والوں کا ہمیشہ سے یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ سیّدوں کی بڑی قدر کرتے ہیں شیخ ایاز لکھتے ہیں:

> 'سیّد خاندان کے بزرگوں کو زیریں سندھ میں خصوصاً بڑا عروج حاصل ہوا رفتہ رفتہ ان کا اثر بالائی سندھ پر بھی پڑا اور اس طرح پورے سندھ میں ان کی بزرگی اور برتری کا چرچا ہونے لگا سندھ میں سیّد خاندانوں کو جو عزت حاصل ہوئی وہ کچھ تو حکمران طبقے کی سرپرستی کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ ان کے پیشتر افراد شخصی طور پر عبادت و ریاضت، علم و حکمت اور اپنے اخلاق و عادات میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے۔'[۷]

پاکستان کی علاقائی زبانوں کا مطالعہ

پاکستان جغرافیائی اعتبار سے ایک ایسے زمینی حصے میں قائم ہوا جس میں مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کے لوگ رہتے ہیں اور مختلف علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس صورتِ حال نے مختلف گروہوں اور زبان بولنے والوں کے مختلف حلقوں میں اختلافات بھی پیدا کیے اور کہیں کہیں ہماری قومی تاریخ میں یہ اس قدر بڑھ گئے اور نفرتوں کو اتنی ہوا دی گئی کہ خون خرابہ بھی ہوا، لوگ بھی مارے گئے۔ البتہ چند اہلِ فکر اور اہلِ دانش ایسے بھی ہیں جو بہت ٹھنڈے دل سے ان معاملات پر سوچتے رہے۔ ان کی نظریں قوم و ملّت کی بنیادوں پر تھیں۔ نسیم امروہوی اور ان کے بعض بصیرت مند ہم عصر ادیب و نقاد کی آراء اس ذیل میں بہت بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

نسیم کی زندگی کا بیشتر حصہ زبان و لغت اور لسانیات سے وابستہ رہا اور جیسا کہ اپنے دوسرے باب میں ہم نے لغت نویسی کو سماجی مظہر قرار دیتے ہوئے یہ بات لکھی تھی کہ زبانیں ہی سماج کے خدوخال مرتب

۵۔ سندھ میں اردو (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، جون ۱۹۸۰ء) ص ۱۲۰

۶۔ مہران نقش (کراچی: مکتبۂ اشاعتِ اردو، ۱۹۸۶ء) ص ۱۵۸

۷۔ مقدمہ منظوم اردو ترجمہ شاہ جو رسالو (سندھیکا اکیڈمی، اشاعت سوم، دسمبر ۱۹۹۱ء) ص ۱۵۰

کرتی ہیں۔ نسیم اسی اہمیت کو سمجھتے ہوئے قومی اور علاقائی زبانوں کے بنیادی رشتوں کو مضبوط سے مضبوط کرنے پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

'ہر قوم کی زبان اس کی تاریخ، روایات اور تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہے اس کے محاورات، استعارات اور تلمیحات میں اپنے ماحول، اپنی فضا، اپنی تاریخ، اپنے پھولوں، پرندوں، دریاؤں اور پہاڑوں کا ذکر ہوتا ہے یہ ذکر اپنے وطن، اپنی تاریخ اور اپنے اکابر سے وابستگی پیدا کرتا ہے۔'[۸]

ہمارا ملک جس میں مختلف علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں ان کو سمجھنے اور ان سے رشتہ قائم کرنے کا سب سے اہم پہلو جیسا کہ درج بالا اقتباس سے ظاہر ہوا یقیناً یہی ہوا کہ ہم ان زبانوں سے واقفیت حاصل کر کے ان زبانوں کی تاریخ اور اس کے اکابرین سے اپنا ذہنی رشتہ قائم کر لیتے ہیں اور یہ ایک ترقی پذیر معاشرے کے لیے بڑی اہم بنیاد ہے مشکل یہ ہے کہ عوام ان اہم پہلوؤں کو نہیں سمجھتے اور جذباتیت کی دیوار درمیان میں کھڑی ہو جاتی ہے۔

سید محمد تقی کی یہ رائے اسی بحث سے تعلق رکھتی ہے:

'زبان کا مسئلہ پُر شور اور نازک جذبات سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس سوال کا جواب جذبات کا احترام کیے بغیر نہیں مل سکتا۔ لیکن جذبات کسی قدر بھی پاکیزہ کیوں نہ ہوں انہیں حدود سے آگے بڑھنے اور ضرورت سے زیادہ رعایتیں دینے کی کوشش خطرناک نتیجے پیدا کرے گی۔ اردو سے محبت لوگوں کے دلوں کے نازک تاروں کو چھوتی ہے لیکن اس محبت کا ایک دائرہ ہے جس سے بڑھ کر یہ خطرناک سمت میں چلنے لگتی ہے۔ یہی حال سندھی کا ہے کہ اس سے محبت پر جوش بھی ہے نازک تر بھی اور قابل احترام بھی۔ لیکن جب متعین حدود سے باہر ہو جاتی ہے تو خطرے پیدا کر دیتی ہے لسانیت کا جذبہ جب محبت کی حدود توڑ کر کسی کی نفرت کے دائرے میں داخل ہوتا ہے تو پھر فاشیت جنم لیتی ہے جو لاشوں پر اپنے محل کی تعمیر کیا کرتی ہے۔' اردو اور علاقائی زبانوں کے سوال کو دو سطحوں پر رکھ کر سوچنا چاہیے۔ پہلی سطح محبت کی ہے اور دوسری علاقائی اور قومی ضروریات کی' قومی ضروریات جن میں تعلیمی تقاضے بھی شامل ہیں۔ کس قسم کے حل کا تقاضہ کرتے

۸۔ ہماری عظیم تہذیب (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت اول ۱۹۷۱ء) ص ۲۷

ہیں۔[۹]

نسیم نے زبان کو ہمیشہ محبت کا ذریعہ سمجھا اور یہی بات انہوں نے دوسروں کو سمجھائی بھی کہ جب بھی کسی علاقے یا خطے میں سماجی زندگی سے آپ کی دلچسپی پیدا ہوگی تو سفر کا آغاز زبان ہی سے ہوگا۔ اور یہ زبان ہی ہے جو نئے رشتے استوار کرتی ہے پاکستان میں ترتیب وتدوین کے مراحل سے گزرنے والی اردو زبان کی سب سے بڑی لغت کے تمہیدی حصے میں انہوں نے زبان، الفاظ اور پھر انہی کے اشتراک سے پیدا ہونے والی لغت کے بارے میں یہ بہت بنیادی بات لکھی ہے کہ لغت کی انگلی پکڑ کر جو بھی تاریخ کی دنیا میں سفر کرے گا وہ نئے نئے لوگوں، نئے نئے تجربوں اور نئے نئے افکار ونظریات سے روشناس ہوگا[۱۰] یہ کہہ کر نسیم زبان کا رشتہ پوری انسانی زندگی سے ملا دیتے ہیں۔ اب یہ زبان چاہے قومی زبان ہو یا علاقائی زبان یہ سب ان کے نزدیک زندگی کی مختلف تصویروں میں رنگ بھرتی ہیں تو پھر ان سے دوری کیوں اختیار کی جائے۔ ہر تہذیبی سلسلہ، ہر ثقافتی ماحول اور ملک کے کسی بھی حصے میں رہنے والا ہر شخص اپنا ایک رنگ رکھتا ہے یہ رنگ جس زبان کے رنگ میں رنگا ہوا ہو اس کے بھی اپنے اثرات ہوتے ہیں اسے کیوں نظر انداز کیا جائے نسیم صاحب زمین کی محبت اور مٹی کی محبت کو زبان کے پھیلاؤ کا بنیادی سبب بتاتے ہیں لیکن یہ جذبہ اسی وقت ایک زمین کے رہنے والوں سے توانائی حاصل کرے گا جب ہر قسم کے تعصب کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور سنجیدگی سے بعض حقیقتوں کو تسلیم کیا جائے۔ پروفیسر ممتاز حسین اس ذیل میں ایک صحیح راستے کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ بات کہتے ہیں:

> 'ہمارا جہاں یہ فرض ہے کہ ہم مشترکہ قومی زبان اردو کو ترقی دیں وہاں پاکستان کی ساری علاقائی زبانوں کو بھی ترقی دیں کیونکہ یہ معاون زبانیں ہیں۔ اسی طرح علاقائی زبانوں کے دانشوروں اور مصنفین کی بھی یہ ذمے داری ہے کہ وہ یک طرفہ ہونے کے بجائے لین دین کے تصور میں سوچیں۔ اور یہ محسوس کریں کہ جب کہ اردو اور یہاں کی ساری مقامی زبانیں ایک لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ایک ہی طرح کی تلمیحات اور تشبیہ و استعارے استعمال کرتے ہیں۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک ملا جلا قومی تصور پیدا نہ ہو۔'[۱۱]

۹۔ اردو اور علاقائی زبانیں، مشمولہ ہفت روزہ لیل ونہار کراچی، ۷ تا ۱۳ ستمبر ۱۹۷۰ء، ص ۲۹

۱۰۔ اردو لغت، جلد اول، (ترقی اردو بورڈ کراچی، ۱۹۷۷ء)، ص (خ)

۱۱۔ مشرف احمد، ممتاز حسین سے ایک گفتگو، مشمولہ ماہنامہ دائرے کراچی، جلد ۱، شمارہ ۸، فروری ۱۹۸۸ء، ص ۹۲

سید سبط حسن نے لکھا ہے کہ پاکستان میں کیوں کے فلسفۂ زبان اور علم لسانیات سے پوری پوری واقفیت بہت کم لوگوں کو ہے۔ اس حوالے سے اہلِ فکر بھی مختلف دبستانِ فکر میں بٹے ہوئے ہیں نتیجتاً یہ مسئلہ نازک بھی ہے اور پیچیدہ بھی[۱۲] نسیم امروہوی کیوں کے علمِ لسانیات سے پوری واقفیت رکھنے والوں میں ہیں اور زبان کے فلسفے کو بھی بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ قومی و علاقائی زبانوں کے تعلقات اور نفاذِ اردو کے بارے میں ایک باخبر ذہن کے ساتھ اپنی تحریروں میں موجود ہیں۔ ہفت زبانی لغت کے پیش لفظ میں اشفاق احمد لکھتے ہیں:

'ایک انسان جب ایک زبان بولتا ہے تو اس کی اکائی اس مخصوص گروہ کا ایک حصہ ہوتی ہے جس میں وہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے یہی انسان جب ایک سے زیادہ بولیاں بولنے اور سمجھنے لگتا ہے تو اس کی شخصیت میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی فردیت میں مختلف گروہوں کا ثقافتی عمل بھی شامل ہو جاتا ہے'[۱۳]

لوک ادب میں سماج کی عکاسی

اردو لغت نویسی کے ایک وسیع تجربے کی وجہ سے نسیم نہ صرف عربی و فارسی بلکہ پاکستان کی مختلف علاقائی زبانوں خصوصاً سندھی زبان اور اس کی لسانیات پر دسترس رکھتے تھے خیر پور میں ان کے گھریلو تعلقات سندھی زبان کے نہ صرف ادیبوں سے تھے بلکہ عام سندھیوں سے بھی ان کا میل جول تھا۔ ان کے گھر میں بھی سندھی زبان بولی جانے لگی تھی[۱۴] سندھی اخبار روزنامہ عبرت حیدرآباد کے ایڈیٹر کے نام سندھی زبان میں لکھا ہوا ان کا ایک خط شائع ہوا جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ سندھی زبان لکھ بھی لیتے تھے۔[۱۵] وہ جہاں علاقائی ادب کے عالمانہ طرز سے واقف تھے وہاں لوک ادب بھی ان کے پیشِ نظر تھا۔ یکتارے کے سریلے راگ اور طبلے کی تھاپ کا بھی وہ ذکر کرتے ہیں۔[۱۶]

۱۲۔ پاکستان کے تہذیبی و سیاسی مسائل (کراچی: مکتبۂ دانیال، اشاعت اول ۲۰۰۲ء) ص ص ۲۷۰، ۲۷۱

۱۳۔ سلیم پیکیجز (لاہور: کوٹ لکھپت، اشاعت دوم، اگست ۱۹۸۸ء) ص ۵

۱۴۔ نسیم امروہوی کے دوسرے صاحبزادے قسیم ابن نسیم جو اردو کے شاعر ہیں وہ سندھی زبان میں بھی شعر کہتے ہیں اور سندھی شاعری کے مشاعروں میں بھی بحیثیت شاعر شریک ہوتے رہے ہیں

۱۵۔ روزنامہ عبرت (حیدرآباد)، اشاعت ۲۸ مئی ۱۹۸۵ء، ص ۳

۱۶۔ سچل سرمست کی اردو اور فارسی شاعری، مشمولہ ماہنامہ جامِ جم کراچی، جلد ۱، شمارہ ۱، اپریل ۱۹۷۱ء، ص ۱۷

اردو ادب اور اردو شاعری کے حوالے سے ایک عام تاثر یہ ہے کہ اس زبان میں لوک ادب کا سرمایہ موجود نہیں ہے جس سے یہ بھی خیال پیدا ہو گیا کہ اردو کے اہلِ قلم خصوصاً وہ لکھنے والے جو فارسی اور عربی ادب کا پس منظر بھی رکھتے ہیں (جیسے نسیم امروہوی) یہ لکھنے والے اپنے عالمانہ اظہار کی وجہ سے سادہ طرزِ اظہار اور لوک ادب کے عوامی جذبوں سے نابلد ہیں۔ اردو کیونکہ خود ایک لشکری زبان ہے اور مختلف زبانوں کے شیر و شکر ہو جانے سے اس کی تعمیر ہوئی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ مختلف جذبوں، مختلف ثقافتوں، مختلف رسم و رواج اور مختلف انسانی جذبات کی تصویریں اس میں نہ ہوں۔ پروفیسر قمر رئیس اسی حوالے سے یہ بات لکھتے ہیں:

'جس زبان کی تشکیل ہی مختلف قوموں کے باہمی میل جول اور اجتماعی ارتباط کا نتیجہ ہو اس کے بارے میں اس طرح کا دعویٰ مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے۔ ان کے اس دعوے کو مان لیا جائے تو کہا جائے گا کہ اردو بولنے والوں نے اپنی ماؤں کی لوریاں نہیں سنیں۔ ان کی ولادت پر گیت نہیں گائے گئے۔ سردیوں کی ٹھٹھرتی راتوں میں ان کی دادیوں یا نانیوں نے کہانیاں نہیں سنائیں۔ ان کی گھریلو تقریبات پر ڈھولک کی تھاپ پر کنواریوں اور بیاہیوں نے گیت نہیں الاپے۔ ڈومنیوں نے اس کی شادی بیاہ پر شادیانے نہیں گائے۔ البیلے موسموں سے کبھی ان کے دلوں میں ترنگ پیدا نہیں ہوئی۔ انہوں نے ساون میں جھولا نہیں جھولا۔ ظاہر ہے صدیوں سے اردو سماج میں یہ سب ہوتا آیا ہے، شہروں میں بھی، دیہات اور قصبات میں بھی۔'[۱۷]

خود نسیم امروہوی کی ابتدائی تربیت امروہہ کے ایسے ماحول میں ہوئی جو عوامی احساسات کی شاعری، گھریلو گیتوں اور کھیتوں میں ہل چلانے والوں کی زبانوں پر آ جانے والے بے ترتیب بولوں سے بنا تھا۔ چار بیت کی محفلیں بھی لوک احساسات کا آئینہ ہوتی تھیں۔ امروہہ کی تاریخ کے ایک مؤرخ احمد حسین صدیقی نے لکھا ہے کہ:

'یہ محفلیں امروہہ کے دیوان خانوں کے علاوہ آموں کے باغات میں بھی منعقد ہوتی تھی اس محفل میں کوئی ساز وغیرہ نہیں ہوتا بلکہ ساز کی جگہ صرف دف بجایا جاتا ہے۔'[۱۸]

۱۷۔ اردو میں لوک ادب (نئی دہلی: سیمانت پرکاش، دریا گنج، جنوری ۱۹۹۰ء)، ص ٦

۱۸۔ کشورِ اولیا (کراچی: فضلی بک سپر مارکیٹ، ۱۹۹۹ء)، ص ۳۱۹

ڈاکٹر سید اختر حسین لوک ادب کو سماجی تخلیقی عمل قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

'لوک ادب سے مراد ایسا ہے جو کسی ایک لکھنے والے کی تخلیق نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک سماجی تخلیقی عمل ہوتا ہے۔ معاشرتی ارتقا کی مختلف منازل میں جو کچھ انسان کے ساتھ بیت رہا ہوتا ہے، لوک ادب میں انہی جذبات داحساسات کی ترجمانی ملتی ہے۔ اس لیے لوک ادب عوام کے دلوں کی دھڑکن ہوتا ہے۔ عالمی سطح پر دنیا کی تمام زبانوں میں لوک ادب ملتا ہے، جس میں لوک قصے اور کہانیاں، لوک کہاوتیں، لوک رقص، لوک موسیقی اور لوک گیت قابل ذکر ہیں۔ یہ غیر تحریری ادب سینہ بہ سینہ، نسل درنسل منتقل ہوتا رہتا ہے اور یوں اس کے توسط سے کسی علاقے یا خطے کے تاریخی، تہذیبی اور جذباتی رویوں کا پتہ چلتا ہے۔ لوک ادب گوان پڑھ لوگوں کی تخلیق ہے جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچا تاہم اس میں انتہائی دانشورانہ اور آفاقی سچائی سے بھرپور چیزیں بھی ملتی ہیں جو آج سے صدیوں پہلے بھی اتنی حقیقی تھیں، جتنی آج سے صدیوں بعد ہوں گی۔' [۱۹]

نسیم لوک کہانیوں اور لوک ادب کو اس لیے اہمیت دیتے ہیں کہ ایک تو یہ عوامی جذبوں کا ایک سادہ اظہار ہے دوسرے یہ کہ اس میں بدی اور نیکی جھوٹ اور سچ اور خیر وشر کی پہچان بہت نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے ایک کتاب کے دیباچے میں انہوں نے لکھا ہے:

'داستانوں میں اگر چہ مافوق الفطرت اظہار ہوتا ہے لیکن اس میں خیر وشر کی کوئی نہ کوئی تصویر ابھرتی ضرور ہے آپ لوک کہانیوں ہی کو دیکھ لیجیے ان میں انسانوں کے مکروہ چہرے بھی نظر آئیں گے اور وہ چہرے بھی جن پر سچائی روشنی کی طرح چمک رہی ہوگی۔' [۲۰]

پنجاب میں لکھی جانے والی لوک داستانوں کا سماجی مطالعہ کرتے ہوئے سردار محمد ظریف لکھتے ہیں:

'لوک کہانیاں صرف غیر عقلی اور ناقابل یقین داستانیں ہی نہیں بلکہ ان کا انسانی زندگی سے بہت زیادہ تعلق ہے اور ان میں معاشرے کی کوئی اچھائی یا برائی بیان کی جاتی

۱۹۔ لوک ادب اور لوک اصناف، مشمولہ پنجابی زبان وادب کی مختصر تاریخ، مرتب، ڈاکٹر انصار الحق جاوید (مقتدرہ قومی زبان پاکستان، طبع اول ۱۹۹۷ء)، ص ۳۸۳

۲۰۔ وزیر حیدر جعفری، چند قصے چند نظمیں (کراچی: اطہر اکیڈمی، ۱۹۸۱ء)، ص ۳

ہے۔[۲۱]

نسیم کیونکہ مرثیے کے ایک مستند شاعر بھی تھے اور مرثیے میں کیونکہ کسی نہ کسی رخ سے خیر وشر کا مطالعہ شامل ہو جاتا ہے اس لیے وہ اصناف سخن جن میں سچائی اور جھوٹ یا نیکی و بدی کا تذکرہ ہوتا رہا ان پر نسیم کی توجہ زیادہ رہی۔ جب وہ سندھ میں آئے اور یہاں کے معاشرے کو امرا اور پسماندہ طبقوں میں تقسیم دیکھا، وڈیروں اور جاگیرداروں کے مقابلے میں ہاریوں اور بے سہارا لوگوں کو مسائل کی چکی میں پستے دیکھا تو انہیں یہاں کی تہذیب اور ادب سے ایک ذہنی تعلق قائم ہوا۔ ان کی زبان اور ان کی اردو لکھنؤ اور دہلی کے بعد سندھ کی ادبی وثقافتی تہذیب سے زیادہ قریب ہوئی۔

سندھی ادب اور ارضی تہذیب

اگر ہم اپنے ملک میں اردو زبان میں ہونے والی تبدیلیوں پر غور کریں تو نمایاں طور پر یہ بات محسوس کریں گے کہ پاکستان میں لکھی اور بولی جانے والی اردو یہاں کی مقامی زبانوں کے تہذیبی امتزاج سے اپنا روپ تبدیل کر رہی ہے اسی پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> 'پاکستانی، اردو، فارسی اور عربی کی طرف جھکاؤ کے باوجود اپنی قوتِ نمو مقامی زبانوں سے حاصل کرنے اور خطے کے ارضی اور ثقافتی نقوش کو اپنے داخل میں سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہے چنانچہ اردو زبان میں جو نیا ادب پیدا ہو رہا ہے اس میں پاکستان کی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہوتی نظر آتی ہے۔'[۲۲]

پاکستان کی دیگر علاقائی زبانوں کے مقابلے میں نسیم سندھی زبان و ادب سے ذہنی طور پر زیادہ قریب رہے۔ اس کے اسباب معاشرتی بھی ہیں اور ادبی بھی۔ معاشرتی اس حوالے سے کہ ان کا رہنا سہنا سندھی معاشرے میں رہا اور ادبی اس حوالے سے کہ وہ اس علاقائی زبان کی ادبیت، اس کی قدیم لسانی تاریخ اور اس کی ارضی تہذیب کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کراچی یونیورسٹی کے پاکستان اسٹڈی سینٹر نے جون ۱۹۸۶ء میں 'پاکستانی معاشرہ' اور ادب کے عنوان سے دو روزہ سیمنار منعقد کیا تھا۔ جس میں پشتو، بلوچی، سندھی، سرائیکی اور پنجابی، زبان و ادب کا پاکستانی معاشرے سے جو تعلق ہے اس پر مقالے پڑھے گئے۔

۲۱۔ پنجاب کی لوک داستانوں کا سماجی مطالعہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے، ۱۹۹۱ء نگراں ڈاکٹر محمد علی صدیقی مملوکہ لائبریری پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی

۲۲۔ اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمنِ ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۵ء) ص ۲۴۳

پروفیسر کرار حسین نے اس دو روزہ سیمینار کی بحثوں کو سمیٹتے ہوئے خلاصے کے طور پر جو باتیں کہیں ان میں سے ایک کا اقتباس یہ ہے:

'یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ پاکستان کے قدیم ترین ادبیات میں سندھی ادب کی حیثیت اولین رہی۔ اس کی وجہ میرے خیال میں کچھ یہ تھی کہ جہاں تک پشتو اور بلوچی کا تعلق ہے تو وہ فارسی سے بہت زیادہ متاثر تھیں اور جہاں تک پنجابی کا تعلق ہے، یہ بات میں کسی عالمانہ اتھارٹی کے تحت نہیں کہہ رہا کہ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پنجابی زبان اپنے خاص رسم الخط کے اندر سکھوں کی ایک مقدس زبان بن گئی اب جہاں تک پنجابی مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لیے ادبی زبان فارسی تھی اور اس کے بعد اردو۔'[۲۳]

نسیم صاحب اردو کے ان محققین میں شمار کیے جائیں گے جو اردو کی نشو ونما کا مرکز و محور سندھ کو قرار دیتے ہیں اس بحث میں وہ کئی دلیلوں سے اپنے نقطۂ نظر کی وکالت کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے بعض اقتباسات ہم نقل کر رہے ہیں یہ اگرچہ طویل ہیں لیکن ان کی اہمیت یہ ہے کہ ایک تو یہ ان کی انتہائی نایاب تحریروں سے ہیں دوسرے ان کے نقطۂ نگاہ کو ان کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا وہ لکھتے ہیں:

'اردو کے بعض تذکرہ نگاروں نے اس زبان کی نشو ونما کا سہرا، برج بھاشا یا کھڑی بولی کے سر باندھنے کی کوشش کی ہے لیکن جس طرح لسانیات کے اصول مسلّم ہیں اسی طرح یہ بھی مسلّم ہے کہ ان اصولوں کو واقعات کے خلاف نہیں برتا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ محسوس طور پر اس زبان کا سرچشمہ دہیں سے پھوٹتا ہوا دکھائی دے۔ لیکن تاریخی مواد کو سامنے رکھ کر جب بھی اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے تو استنباط و اجتہاد کی قوتیں اسی ایک دائرے میں گردش کرتی دکھائی دیتی ہیں کہ برکوچک کی اس ہمہ گیر زبان کا سب سے پہلا خاکہ، دو قوموں کے سنگم، یعنی 'سندھ' ہی کے ریگستان میں مرتب ہوا تھا۔ پچھلی چند صدیوں میں برکوچک کی اس مشترک مفاہمتی بولی نے ملک کے وسیع علاقوں کا دورہ کیا اور مغربی و شمالی سرزمین سے گزر کر بندھیاچل کے اس پار تک جا پہنچی، جہاں اس نے دکن میں نیا رنگ روپ اختیار کیا، شاہجہاں اعظم کے عہد میں اس ملی جلی زبان کو اردوئے معلّیٰ کا لقب بخشا

۲۳۔ خطبۂ استقبالیہ، مشمولہ پاکستانی معاشرہ اور ادب، مرتبین ڈاکٹر حسین محمد جعفری، احمد سلیم (پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی، اشاعت اول اپریل ۱۹۸۷ء) ص ۲۳۴

گیا اور اسی وقت برصغیر کے گوشے گوشے میں اردو کی عظمت کا پرچم لہرانے لگا۔ اس مدت میں اردو جس چھوٹے سے چھوٹے علاقے میں بھی سیر کرتی ہوئی پہنچی، وہاں کی آب و ہوا، اور ماحول نے اس کے خال و خط میں بے شمار تغیرات پیدا کیے۔ با ایں ہمہ جب یہ پورے ملک میں ہر پھر کر، پھر سندھ میں پہنچی اور تشکیلِ پاکستان کے موقع پر کراچی کے دارالخلافہ میں سندھی سے بغلگیر ہوئی تو اربابِ نظر نے دیکھا اور پہچانا کہ وہ ابتدائی نقوش جو روزِ ازل اسے سندھ کی سرزمین نے بخشے تھے، کئی سو برس کی مسلسل گردش کے باوجود اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اس کی شکل و صورت میں جلوہ گر ہیں۔[۲۴]

اپنی اس بحث کو وہ پورے استدال کے ساتھ آگے لے کر چلتے ہیں اور ان حقیقتوں کو اس کے پورے تاریخی پس منظر میں تجزیہ کرتے ہیں:

'یہ کیونکر مان لیا جائے کہ وہ عرب جنہوں نے برصغیر میں پہلا قدم رکھا تھا، انہیں اس سر زمین کے لوگوں سے بات کرنے تک کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ہو اور یہاں سے چھلانگ مار کر سیدھے برج یا دکن کے علاقے میں پہنچ گئے ہوں۔ اور وہاں مقامی لوگوں کے ساتھ ان کے اختلاط سے اردو زبان کی بنیاد پڑی ہو۔ ظاہر ہے کہ جب عرب سندھ کے ساحل پر اترے ہوں گے اور انہوں نے محمد بن قاسم کی فتحمندانہ قیادت کے تحت سندھ میں (جو اس وقت ملتان تک پھیلا ہوا تھا) اپنی باضابطہ حکومت قائم کی ہوگی تو انہیں اس کی بھی ضرورت پڑی ہوگی کہ راعی و رعایا کے درمیان قریبی اور گہرے تعلقات قائم کرنے اور دو اجنبی قوموں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کے لیے ایک مشترکہ ذریعۂ مفاہمت اختیار کریں۔ یعنی ایک ایسی زبان تشکیل دی جائے جو فاتحین و مفتوحین دونوں کی سمجھ میں آ جائے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں سیاسی اور سماجی تقاضوں کے تحت فوری طور پر ایک نئی بولی، یا کم سے کم بول چال کے نئے الفاظ وجود میں آئے ہوں گے۔ جنہوں نے آگے چل کر رفتہ رفتہ اردو کی صورت اختیار کر لی۔ اسی طرح دوسری صدی ہجری میں سندھ کے سیاسی و تمدنی انقلاب نے ایک ایسے معاشرے کی بنیاد ڈالی جس کا

۲۴۔ مقدمہ کلیاتِ ناز (خیر پور: مراد برقی پریس) ص ۱۷

ثمرِ پیش رس، اردو ہے۔[۲۵]

اپنی اس بحث کے نتیجے میں وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے تحقیقی نتائج کی تائید کرتے ہوئے حتمی طور پر یہ بات کہتے ہیں:

'بقول مولانا سلیمان ندوی یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ علمی و ادبی زبان کی حیثیت سے اردو کی نشوونما کہیں بھی ہوئی ہو مگر تخلیقی زاویۂ نگاہ سے اس کی پہلی اینٹ یقیناً سندھ ہی میں رکھی گئی تھی جہاں اب سے بہت پہلے، اول اول مشرق کی دو عظیم سماجی قوتوں، آریائی اور سامی تہذیبوں کا تعارف ہوا تھا۔'[۲۶]

اردو اور سندھی کے لسانی روابط میں سماجیاتی پہلو

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:

'اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کے لسانی وثقافتی روابط ایک ایسا موضوع ہے جسے جس انداز سے بھی پرکھا جائے اور جس رخ سے اس کا تجزیہ کیا جائے نتیجہ مثبت ہی نکلے گا کیونکہ یہ روابط اتنے واضح اور گہرے ہیں کہ ان کا سارا تانا بانا آئینے کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ لسانیات کا ایک ادنیٰ سا طالب علم بھی جانتا ہے کہ اردو کا خمیر ان ہی زبانوں سے اٹھا ہے جو آج پاکستان کی علاقائی زبانیں کہلاتی ہیں اور صدیوں سے اپنے اپنے علاقے میں مروج ہیں بلکہ لسانی نظریات کے حوالے سے دیکھا جائے تو پنجاب میں اردو، سندھ میں اردو، بلوچستان میں اردو، ملتان میں اردو وغیرہ جیسے موضوعات پر، جو سکہ بند تحریریں علمائے لسانیات وادب نے پیش کی ہیں، ان میں سے ہر مصنف نے اپنے علاقے کو اردو کا مولد ومسکن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو اردو اور ان زبانوں کی قریبی مشابہت کا بین ثبوت ہے۔'[۲۷]

زبانوں کے لسانیاتی تعلقات اور عروض وقواعد کی بحثیں نسیم کے یہاں خصوصی مطالعہ کی

۲۵۔ مقدمہ، کلیاتِ ناز (خیر پور پریس: ناشر ادارہ سہ روزہ مراد)، ص ۱۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۵

۲۷۔ اردو اور علاقائی زبانوں کے لسانی وثقافتی روابط، مشمولہ اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، جلد ۷، شمارہ ۵، ص ۱

حامل ہیں۔ان کی کتابیں نقاوۂ شعر[۲۸] معراج العروض،[۲۹] جدید آ ئین اردو،[۳۰] آ ئین اردو،[۳۱] لفظ 'جیسا' کی تشریح میں ان کا ایک مضمون[۳۲] اور لغت کی تنقیدوں پر بعض جائزے[۳۳] اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔علامہ محمد داؤد[۳۴] بدرالہ آبادی[۳۵] اور حیات عباس ہاشمی[۳۶] کی تخلیقات پر ان کی تقاریظ اور دیباچوں میں بھی ان لسانی پہلوؤں کونظرانداز نہیں کیا گیا۔سندھ میں ان کے دورِ قیام کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ:

'اس عہد میں انکا بیشتر ادبی کام لسانیاتی حوالے سے ہے انہوں نے جہاں سندھی زبان کے قواعد پر لکھا وہاں بہت وسیع سطح پر اردو لغت ولسانیات کے بڑے مراحل طے کیے۔نسیم اللغات، رئیس اللغات، الصرف، النحو، آئینِ اردو، ادبی کہانیاں، ہماری زبان اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔'[۳۷]

ڈاکٹر جاوید اقبال سندھ میں نسیم کی لسانیاتی خدمت کوان کی اہم خدمت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

'میری نظر میں ان کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے سندھی اور اردو کے لسانیاتی رشتوں پر کام کیا۔'[۳۸]

سندھی اور اردو کے لسانیاتی روابط کا کھوج وہ اس کے سماجی پس منظر میں تلاش کرتے ہیں

۲۸۔ (الہ آباد: برکات اکبر پریس)

۲۹۔ (الہ آباد: مطبع انوار احمدی)

۳۰۔ حصہ دوئم (لاہور: کتاب منزل)

۳۱۔ حصہ سوئم (لاہور: کتاب منزل)

۳۲۔ جیسا،مشمولہ اردونامہ کراچی، شمارہ جولائی تا ستمبر ۱۹۶۱ء، ص ۴۶ تا ۵۱

۳۳۔ نمونہ لغت کی تنقیدوں پر ایک نظر، مشمولہ اردونامہ کراچی، اکتوبر تا دسمبر، ص ۸۷ تا ۹۴

۳۴۔ تحفۂ رضویہ (رامپور: مرتضٰی پریس، سنہ اشاعت ندارد)

۳۵۔ ضیائے سخن (کراچی: ابنِ حسن آفسٹ پریس، ۱۹۷۷ء)

۳۶۔ بدرِ کامل (کراچی: ابنِ حسن آفسٹ پریس)

۳۷۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، بیسوی صدی اور جدید مرثیہ (کراچی: محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلی کیشنز، طبع اول فروری ۱۹۹۴ء)، ص ۵۲۲

۳۸۔ بحوالہ مکتوب ڈاکٹر جاوید اقبال، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ سادات امروہہ، مطبوعہ کراچی فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۲۰۳

مختلف معاشرتی گروپوں کا مل کر رہنا اور پھر ان کے اقتصادی و سیاسی مفادات سے وہ اس کے سرے جوڑتے ہیں۔ ایک ماہرِ لسانیات، تہذیبی، ثقافتی اور سماجی تبدیلیوں کو پیش نظر رکھ کر جب نتیجے پر پہنچتا ہے تو اس کی تحقیق پر ہم پورا اعتماد کر سکتے ہیں۔ نسیم نے لسانیاتی اصولوں اور اس کی حقیقتوں کو سماجی مطالعہ سے گزار کر ہم تک پہنچایا ہے۔ ایسے کاموں کی مشکلات کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

'جب دو ملکوں یا دو قوموں کے لوگ ایک دوسرے سے اس طرح گھل مل جاتے ہیں جیسے باہر سے آنے والے مختلف ملکوں کے مسلمان اور ہندوستان کے باشندے تو ان کا اثر ایک دوسرے پر اتنی لاتعداد صورتوں میں پڑتا ہے جن کو الگ الگ ظاہر کرنا یا انہیں پوری طرح سمجھنا بہت دشوار ہو جاتا ہے سیاسی، سماجی اور اقتصادی جذبات کو الگ الگ اور ملا جلا کر دیکھنا بہت سی پیچیدہ مشکلات پر روشنی ڈالے گا زبان کو انسان کے سماجی اعمال نے ہی جنم دیا ہے اور اس عمل کے بدل جانے سے اس میں تبدیلی ہوتی ہے۔'[۳۹]

لسانیاتی بحثیں اگر چہ ایک پیچیدہ کام ہے لیکن نسیم اپنے طرزِ اظہار اور سماجی تجزیے کے سہل انداز سے اس موضوع کو بھی سہل کر دیتے ہیں:

'آج جب ہم اردو کے ذخیرۂ الفاظ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کے اسماء صفات اور افعال و روابط قدم قدم پر اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ جس وقت نو وارد اور مقامی اصحاب کے اختلاط سے ایک نئی زبان بننے لگی تھی اور اسے میزبانوں اور مہمانوں کی بولیوں سے ہر قسم کے الفاظ مانگنے کی ضرورت پیش آئی تھی تو عرب نے اسے محدود اور مختصر اسماء صفات دے کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا اور اپنے افعال و روابط سے کوئی حصہ نہیں دیا تھا۔ حالانکہ عرب کے اس عطیے میں کچھ سکے ایسے بھی تھے جو خود انہوں نے سندھ سے مستعار لے کر بالکل اپنا لیے تھے۔ مگر سندھ نے اپنی عالی ظرفی سے بڑی دریا دلی کے ساتھ اردو کو ہر قسم کے الفاظ دے ڈالے تھے۔ جو کسی نہ کسی صورت میں آج تک اس کے سرمائے میں محفوظ ہیں ان کے علاوہ بہت سے ایسے الفاظ بھی ہیں جو سندھی نے انیسویں صدی کے وسط میں اپنی تشکیلِ نو کے بعد برصغیر کی دوسری زبانوں سے مستعار لیے اور ساتھ ہی حسنِ اتفاق سے ان ہی الفاظ کو اردو نے بھی اپنایا۔ جس سے ان دونوں زبانوں کی سابقہ مماثلت میں اور

۳۹۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء) ص ۱۱

پختگی اور اگلی یکسانیت میں مزید استواری پیدا ہوگئی۔"[۴۰]

نسیم نے کلیاتِ ناز کے مقدمے میں سندھی اور اردو لفظوں کی مماثلت پر بنیادی باتیں لکھی ہیں جن میں وہ اسمائے ذات، اسمائے صفات، اسمائے اعداد اور ضمیروں وفعلوں کے حوالے سے مثالیں دے کر اپنی بات ہم تک پہنچاتے ہیں۔ اس طویل مقدمے[۴۱] میں سے صرف چند باتیں انہی کے لفظوں میں ہم نقل کر رہے ہیں:

اسمائے ذات

سندھی میں برادر کو 'بھاؤ' (ڀاءُ) کہا جاتا ہے اردو میں اسے بھائی کہتے ہیں۔ سندھ کے لوگ ہمشیرہ کو بھینڑ (ڀيڻ) کہتے ہیں اردو میں بہن۔ کٹھو (ڪٺو) مجتمع ہونے کے معنی میں، سندھی ہے، جو اردو میں (اکٹھا) بولا جاتا ہے...... چھوکرا (ڇوڪرا) اور چھوکری (ڇوڪري) سندھ الاصل ہیں جو کہ اردو کی عوامی بولی میں بلا تکلف بغیر کسی تبدیلی کے استعمال کیے جاتے ہیں...... سندھی میں 'آب' کو پانڑی (پاڻي) بولتے ہیں، اردو میں پانی...... مکان کے پٹاؤ کو، جو دیواروں پر کڑیاں رکھ کر سائے کے لیے ڈالا جاتا ہے، اردو والے 'چھت' کہتے ہیں، سندھی میں یہی لفظ چھت (ڇت) ہے۔

کئی اعضائے جس کے سندھی نام جوں کے توں اردو میں بولے جاتے ہیں۔ مثلاً چھاتی (ڇاتي) پیٹ (پيٽ) اور پیر (پير) تینوں سندھی زبان کے لفظ ہیں۔ جو بلا کسی تبدیلی کے اردو میں مستعمل ہیں۔

اسمائے صفات

اسمائے صفات میں اردو اور سندھی لفظوں کی یکسانیت دیکھیے۔ سندھی میں شیریں کو 'مٹھو' (مٺو) کہتے ہیں اردو میں میٹھا...... سندھی میں سیاہ رنگ کو 'کارو' (ڪارو) کہتے ہیں اردو میں کالا سندھی میں آسمان کے رنگ کو 'نیرو' (نيرو) کہتے ہیں اردو میں نیلا...... سندھی میں

۴۰۔ مقدمۂ کلیاتِ ناز (خیر پور پریس: مراد برقی پریس، سنِ اشاعت ندارد)، ص ۱۷

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۸ تا ۲۰

گیندے کے پھول کا رنگ 'پیلو' (پیلو) کہلاتا ہے، اردو میں پیلا۔

اسمائے اعداد

اردو کے اسمائے اعداد پر نظر ڈالیے تو بیشتر سندھی سے متاثر نظر آتے ہیں...... سندھی میں 'ھک (ھك) کہتے ہیں، اردو میں ایک...... سندھی میں دو کو 'بہ' (بہ) کہتے ہیں، اردو میں بائیس، بتیس، بیالیس اور باسٹھ وغیرہ میں یہی 'ب' (ب) ہے جو دو کے معنی دے رہا ہے۔...... سندھی میں 'ٹرے' (ٹیی) اردو میں تین...... سندھی کے 'چار' (چار) اردو میں بغیر کسی ترمیم کے چار ہی بولا جاتا ہے۔

ضمائر افعال

ضمیروں کو دیکھیے تو وہ بھی دونوں زبانوں کے نمایاں تماثل کی طرف رہ نمائی کرتی ہیں۔

جہاں تک فعلوں کا تعلق ہے، اردو کے تقریباً ستر اسی فی صد افعال سندھی سے ہم آہنگ ہیں۔ اردو میں کم فعل ایسے نکلیں گے جو سندھی الفاظ سے صوتی تشابہ کا رشتہ نہیں رکھتے۔ اور اس سے بغیر کسی اور دلیل کے خود بخود یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ان میں ایک اصل ہے اور دوسرا اس کی نقل، جس کے لباسِ ظاہری میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دی گئی ہے۔

کلیاتِ ناز کے حوالے سے نسیم امروہوی کی خدمات کا ذکر پیر حسام الدین راشدی نے بھی کیا ہے۔[۴۲]

پروفیسر عارف عبدالمتین شعبۂ لسانیات میں نسیم کی کارکردگیوں کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ:

'انھوں نے حرف و لفظ کے بارے میں جدید تحقیقی و تدوینی اسلوب کو کبھی صرفِ نظر نہ ہونے دیا۔'[۴۳]

۴۲۔ اردو زبان کا اصلی مولد سندھ، مشمولہ ماہنامہ تخلیق لاہور، سندھی ادب و ثقافت نمبر، جلد ۱۹، شمارہ ۱، ۲، ۱۹۸۸ء حاشیہ ص ۴۷

۴۳۔ نسیم امروہوی کی وفات پر مشاہیر علم و ادب کے تاثرات، مشمولہ بجھی وہ شمع، مرتبہ شبیہ الحسن (لاہور: اظہار سنز، جون ۱۹۸۷ء)، ص ۳۸

زبان جو اپنے سماجی ماحول سے پیدا ہوتی ہے اس کے بارے میں نسیم سماج کی تمام تر روایتوں کو پرکھنے اور جاننے کی طرف ہمارے ذہن کو لے کر جانا چاہتے ہیں۔ ادب و سماج کے رشتوں کو انہوں نے لسانیات کے حوالے سے بھی سمجھا اور سماجی و تاریخی پس منظر سے بھی۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

'ادب کی لسانی ساخت کے علاوہ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ ادب ماضی میں کن کن سماجی، تاریخی اور مذہبی ماحولوں سے گذرا ہے ایک دوسرا طریقہ بھی ہے۔ وہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس ادب کے روایاتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے۔ یعنی یہ دیکھا جائے کہ اس ادب میں کس کس قسم کی ادبی، تاریخی اور مذہبی روایات کی نمائندگی پائی جاتی ہے۔ بطور مثال انگریزی لٹریچر یونانی علمِ الاصنام کی کہانیوں سے بھرپور ہے۔ عربی ادب میں یہودی روایات اور مسیحی تلمیحات کی کثرت ہے۔ فارسی کی تمامتر روایات عرب سے ماخوذ ہیں۔ آپ فارسی ادب میں عشق ومحبت کا قصصی اور مثالی کردار اگر تلاش کریں گے تو لیلیٰ مجنوں، وامق عذرا اور یوسف زلیخا کے رومان قدم قدم پر ملیں گے۔ فارسی ادب میں یہ روایات بالکل عام ہیں...... انگریزی لٹریچر میں یونانی علمِ الاصنام کی جھلک رومی برطانی اختلاط اور ان تاریخی واقعات کی صریحی شہادت ہے جو رومن امپائر کے عروج وکمال سے وابستہ ہیں، جب جزیرۂ برطانیہ رومی شاہنشاہیت کا ایک جزو تھا اور انگریزی دل و دماغ رومی اور یونانی اثرات سے معمور تھے۔ عربی ادب میں اسرائیلی اور مسیحی روایات کی موجودگی، عرب کی اس ذہنی، دماغی اور سیاسی حالت کا قدرتی نتیجہ ہے جو قبل از اسلام وہاں پائی جاتی تھی۔ فارسی ادب میں عربی روایت کی کثرت، عربی ایرانی تعلقات اور مذہبی وتمدنی اتحاد کا واضح اور غیر مشتبہ ثبوت ہے۔ کسی ادب کی تاریخی وتمدنی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے ایک تیسرا طریقہ بھی استعمال کیا جاتا ہے یعنی اس ادب کے نفسیاتی رجحانات کو روشنی میں لایا جاتا ہے۔ ہر ادب میں ایک مخصوص روح پائی جاتی ہے، جو اس قوم کے اجتماعی مزاج سے پیدا ہوتا ہے جس نے اس ادب کی تشکیل میں حصہ لیا۔[۴۴]

سندر نرائن مشران کے خطبات پر مقدمہ لکھتے ہوئے وہ زبان کو پریم کا بندھن اور محبت کا

۴۴۔ اردو کی پیدائش اور اس کا پس منظر، مشمولہ ششماہی میراث، کراچی، چھٹا شمارہ جنوری تا جون ۱۹۹۳ء، ص ص، ۲۶، ۲۷

رشتہ کہتے ہیں [۴۵] سندھ میں جب بھی سندھی اور اردو کے اختلافات کو ہوا دی گئی زبان کے بارے میں انہوں نے اسی نظریے سے کام لے کر دلوں سے نفرتیں دور کیں۔ ان کا طرزِ فکر کتنی اپنائیت لیے ہوتا ہے اس کا اندازہ ان کے ایک نایاب مضمون 'اردو کی تشکیل میں سندھی کا حصہ' کے اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

'اردو کی پہلی شاخ سندھی کے درخت سے پھوٹی۔ سندھ نے اردو کو پیدا کیا۔ اسے اردو زبان سے وہی تعلق ہے جو ماں باپ کو اولاد سے ہوتا ہے۔ اولاد اپنے والدین سے بڑھ جائے تو والدین اس کی فوقیت اور مقبولیت سے باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ اور مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔ سندھی اگر اردو کے سرسبز اور مقبول عام ہونے سے دلی خوشی محسوس کرے تو اسے واقعی طور پر اس کا حق پہنچتا ہے۔ کیونکہ وہ اردو سے ایک مہربان ماں اور ایک مشفق باپ کا رابطہ رکھتی ہے۔ اردو پھولی پھلی تو گویا سندھی کا لگایا ہوا پودا بارور ہوا۔ اور اس طرح سندھی کی شاخیں اردو کے روپ میں سندھی کے مرغزار سے نکل کر نہ صرف پورے پاکستان میں بلکہ ہندوستان کے بھی گوشے گوشے میں پھیل گئیں۔ اب جب تک اردو باقی ہے جہاں جہاں باقی ہے وہاں کے اہلِ علم اور تاریخ دان اصحاب کبھی اس حیثیت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ یہ سندھ کے درخت کا ایک لطیف پھل ہے۔' [۴۶]

سندھ میں ایک تعلیم یافتہ اور سویلائزڈ معاشرے کی ضرورت

سندھی اور اردو کے لسانیاتی رشتوں پر نسیم کی خدمات سے جو سب سے اہم پہلو جھلکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک زبان ہی ایک ایسی طاقت ہے جو پورے معاشرے کو محبت کے ایک رشتے میں پروئے رکھتی ہے۔ اس زبان سے وہ محبت کی ایک ایسی تعلیم دیتے ہیں جس میں انسانیت کا پیغام زیادہ ہو اور جس میں دور دور تک کسی بھی تعصب کی کوئی جھلک نہ ہو۔ لوگ بہت شعور سے کام لیں اور جذباتیت کو قریب نہ آنے دیں جس معاشرے میں یہ قدریں پائی جائیں گی اسی کو وہ ایک تعلیم یافتہ سویلائزڈ اور روشن خیال معاشرہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے سماجی مطالعہ میں یہی حقیقت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

زندگی کے بہت سے مسائل خصوصاً ایسے مسائل جن کا تعلق قوموں، نسلوں اور مختلف گروہوں کی

۴۵۔ خطباتِ مشران (حصہ اول (لکھنؤ: یونائیٹڈ انڈیا پریس، ۱۹۴۲ء) ص ۳۱

۴۶۔ 'صداقت' (اخبار) جیکب آباد سندھ، اشاعت ۴/ مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۴

زبان سے ہوا ان میں جذباتیت کا عنصر سارے معاملات بکھیر کر رکھ دیتا ہے۔ نسیم ہر حوالے سے خصوصاً زبان کے حوالے سے ہونی والی بحثوں میں روشن خیالی کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک:

'روشن خیالی کسی قانون کی شق نہیں ہے جسے نافذ کرنے کے لیے سخت اصول اپنائے جائیں روشن خیالی کا سفر ان ابتدائی کلاسوں کے طالب علموں کی تربیت سے شروع ہوتا ہے جن کے ذہن ابھی کچے ہیں اور جو کسی بھی اثر کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔'[۴۷]

محکمۂ تعلیمات صوبۂ سندھ کے تحت نسیم نے سندھ کے طلبا و طالبات کے لیے 'میٹرک اردو کورس' کی کئی کتابیں ترتیب دیں۔ اسی سلسلے کی ایک کتاب کے پیش لفظ میں وہ مضامین کے انتخاب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ان پر جو نوٹ لکھے گئے ہیں ان کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسائلِ حیات کو سمجھنے میں روشن خیالی اُجاگر ہو۔[۴۸] نسیم کی روشن خیال ذہنیت کا ایک بہت روشن پہلو جس کا ذکر دوسرے باب میں آیا ہے یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں سے وہ چاہے ان کی نظمیں ہوں یا ان کا نثری اظہار ان تمام میں وہ زندگی کے بجھے بجھے تصورات کو زیرِ بحث نہیں لاتے بلکہ ایسے جذبات جن میں ایک روشن زندگی کا اظہار ہو رہا ہو۔ جن سے زندگی جھلک رہی ہو ان کو وہ اُجاگر کرتے رہتے ہیں۔ سندھ کی قبائلی زندگی کے معاشرے میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح نسیم زندگی بیزار قدروں کے نہیں زندگی افروز قدروں کے نمائندہ بن جاتے ہیں ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

'ایک ایسے معاشرے میں جس میں زندگی تا ہنوز قبائلی اور جاگیرداری اقدار کے تحت گذاری جا رہی ہے شہری زندگی کے بہت چھوٹے چھوٹے پاکٹس ہیں اور اگر ان علاقوں میں مقیم ادیب وجودیت یا زندگی بیزاری کے رجحانات کو فروغ دینے لگیں تو پھر ہمارے سماج کی زندگی افروز اقدار اور تشکیلِ نو کی امنگ ختم ہو کر رہ جائے گی ہمیں مغربی ادب کی زندگی بیزار اقدار سے بہت نقصان پہنچا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان کے ادیب روشن خیال معاشرے کی تعمیر کے لیے ادب تخلیق کریں۔'[۴۹]

۴۷۔ شاہ ولایت پبلک اسکول میں ایک تقریر، مشمولہ خبر نامہ (انجمنِ سادات امروہہ، ۱۹۷۶ء شمارہ ۲۱) ص ۱۲

۴۸۔ نثر اردو (کراچی: انوار بک ڈپو بندر روڈ، بار اول، جون ۱۹۴۸ء) ص (ج)

۴۹۔ محمد علی صدیقی سے ایک گفتگو، مشمولہ حسن رضوی، اندازِ گفتگو (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء) ص ۳۶۵

انجمنِ ترقی اردو خیر پور

معاشرے کی خیر اور فلاح جن جن باتوں میں پوشیدہ ہے اس میں جیسا کہ ذکر ہوا نسیم زبان کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ وہ قومی زبان (اردو) اور علاقائی زبان (سندھی) کے درمیان بعض ان نزاکتوں کو بہت سنجیدگی سے پیشِ نظر رکھتے ہیں جو نفرتوں اور اختلافات کا سبب بن جاتی ہیں۔ انہوں نے سندھ میں رہ کر اردو داں طبقے کو سندھی زبان کی قدر و منزلت کا احساس دلایا۔ اس زبان کے قواعد اور لسانیاتی اصولوں پر لکھا۔ اردو اور سندھی کے لسانی روابط کو اس طرح سمجھایا کہ ساتھ رہنے والوں میں محبت اُجاگر ہو اسی طرح سندھ کے قدیم و جدید لوگوں کو جن کی مادری زبان سندھی ہے انہیں اردو کی وقعت کا احساس دلایا اور اس کے عوامی پھیلاؤ کے اسباب بتائے۔ اس جذبے کے تحت نسیم نے خیر پور میں ایک اردو کانفرنس منعقد کی۔ جس میں پاکستان میں اردو کی سرپرستی کرنے والے سب سے اہم بزرگ بابائے اردو مولوی عبدالحق اور سندھ کی تاریخ، ثقافت و ادب کی اہم شخصیت پیر حسام الدین راشدی کو دعوت دی اس باب کے آغاز میں راشدی صاحب کی ایک تحریر کا اقتباس ہم نے دیا تھا اس کی دو سطریں دوبارہ نقل کی جارہی ہیں۔ راشدی صاحب لکھتے ہیں:

> 'نسیم صاحب اور میری پہلی ملاقات ۱۹۵۲ء میں خیر پور میں ہوئی جب آپ نے اردو کانفرنس بلائی اور میں مولوی عبدالحق مرحوم کے قافلے میں وہاں پہنچا۔'[۵۰]

نسیم امروہوی لکھتے ہیں:

> 'خیر پور میں ایک عظیم الشان کل پاکستان اردو کانفرنس کے دو اجلاس زیرِ صدارت ڈاکٹر محمود حسین وزیر ریاست ہائے پاکستان و زیر سرپرستی بابائے اردو مولوی عبدالحق منعقد ہوئے جس میں انجمن ترقی اردو خیر پور کا قیام عمل میں آیا۔'[۵۱]

انجمنِ ترقی اردو کے رسالے 'قومی زبان' نے اس ذیل میں یہ خبر شائع کی:

> '۵ رفروری ۱۹۵۱ء کو خیر پور میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی صدارت میں جلسہ ہوا اور انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا اور قائم رضا صاحب، نسیم امروہوی اس کے معتمدِ اعزازی مقرر ہوئے۔'[۵۲]

بابائے اردو مولوی عبدالحق 'ترقی اردو کے ذیل میں نسیم کی کوششوں اور ان کی سرگرمیوں

۵۰۔ نسیم امروہوی کو جیسا میں نے پایا، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۷۴ء)، ص ۱۳

۵۱۔ پیش لفظ نسیم اللغات (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء)، ص ۵

۵۲۔ قومی زبان، اشاعت ۱۶ رفروری ۱۹۵۱ء، ص ۱۹

کے قدر دانوں میں رہے ہیں تقسیم سے پہلے بھی نسیم انجمنِ ترقی اردو کے رکن تھے[۵۳] اور اب خیر پور شاخ کے معتمدِ اعزازی کے منصب پر فائز ہو کر انھوں نے سندھ میں اردو کی ترویج کے لیے نئے سرے سے کام کیا۔ نسیم صاحب نے جو کانفرنس بلائی اس میں بابائے اردو نے جو خطبہ دیا وہ ترویجِ اردو کے سلسلے میں اصل مقصد پر روشنی ڈالتا ہے اس خطبے کا ایک اقتباس یہ ہے:

"بعض بزرگ یہ اعتراض فرماتے ہیں کہ اردو پاکستان کے کسی صوبے کی زبان نہیں اس لیے وہ قومی زبان بھی نہیں ہو سکتی۔ حضرت معترض اعتراض کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کے حق میں یہی تو سب سے بڑی دلیل ہے۔ اگر وہ کوئی صوبائی زبان ہوتی تو اس کی بھی مقامی بولی کی حیثیت ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ مقامی بولی کا رقبہ محدود ہوتا ہے اس لیے اس کا اثر اور اس کی قوت بھی محدود ہوتی ہے اور اس کی آواز ایک حلقے سے آگے نہیں پہنچتی۔ اگر اس وقت کوئی صاحب آپ کے سامنے یا مغربی پاکستان کے کسی شہر میں بنگالی زبان میں تقریر کریں تو اس کے سمجھنے والے کتنے نکلیں گے؟ اسی طرح اگر کوئی سندھ یا مشرقی پاکستان میں پشتو زبان میں یا پشاور یا چاٹگام میں سندھی میں تقریر کرے تو کون سمجھے گا۔ لیکن اگر میں یا اور کوئی صاحب اردو میں تقریر کریں تو اس کے سننے اور سمجھنے اور قدر کرنے والے کثرت سے سارے پاکستان میں ملیں گے۔ پاکستان میں جتنی زبانیں مروج ہیں وہ سب ہماری زبانیں ہیں۔ ہر شخص کو اپنی مادری یا صوبائی زبان سے محبت ہوتی ہے اور ہونی چاہیے اور کسی کو اس کی ترقی میں حائل ہونے کا حق نہیں ہے۔ لیکن صوبائی بولیاں محدود ہوتی ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے کوئی میل نہیں ہوتا۔ اگر ہر صوبہ اپنی اپنی زبان پر اصرار کرے اور قومی زبان کے رواج کے مانع ہو تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ ایک طرف پشتونستان اور دوسری طرف بلوچستان، ادھر سندستان اور اُدھر پنجابستان۔ پاکستان کہیں نہیں رہے گا۔"[۵۴]

بابائے اردو اور انجمن کے دیگر ارکان نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ سندھ میں تعلیمات کے فروغ اور اس کی ترویج کے لیے ایک لغت ترتیب دی جانا چاہیے چنانچہ نسیم امروہوی کو اس علمی

۵۳۔ نسیم القواعد (آگرہ: گیا پرشاد پبلیشرز، ۱۹۳۷ء)

۵۴۔ خطبۂ صدارت خیر پور اردو کانفرنس، مشمولہ ماہنامہ قومی زبان اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۷

ادرادبی کام کے لیے منتخب کیا گیا۔ نسیم اللغات ان کی اس ریاضت کا پھل ہے۔ اس کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

'انجمن مذکور کے ارکان نے بالاتفاق اس بات پر زور دیا کہ زبان اردو کی خدمت کے سلسلے میں سب سے پہلے ایک لغت مرتب کیا جائے جو ان تمام لغات کا اگر نعم البدل نہیں تو کم از کم بدل ہی بن سکے۔ جو برصغیر کی تقسیم کے بعد بھارت میں رہ گئے۔ چنانچہ ناچیز نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اس سلسلے میں پاکستان کے چھپے ہوئے تمام لغات مہیا کر کے ان کا مطالعہ شروع کیا۔ اگر چہ میں اپنے رفیقوں کے اصرار سے ترتیب لغت پر آمادہ ہو گیا تھا مگر ابھی تک اس کام کو محض ایک تحصیلِ حاصل سمجھ رہا تھا کیونکہ میرے خیال میں وہ لغات معمولی کام چلانے کے لیے کافی تھے جو پاکستان میں لاہور وغیرہ سے شائع ہوئے ہیں۔ لیکن جب ان لغات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تو بہت جلد یہ محسوس ہو گیا کہ ان لغتوں میں ایک بھی کام کا نہیں کیونکہ ان میں بعض نہایت مختصر ہیں، جن میں کل ضروری الفاظ بھی نہیں ملتے۔ کچھ ایسے ہیں۔ جو صرف طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے ہیں۔ ایک آدھ کی قیمت اتنی ہے جسے ہر شخص ادا نہیں کر سکتا۔ اور بعض جو دیکھنے میں کسی قدر ضخیم ہیں اور ان کی قیمت بھی زیادہ نہیں، ایسے اغلاط و نقائص سے پُر ہیں۔ جو محض معمولی اور رسمی نہیں۔ بلکہ اکثر و بیشتر مقامات پر دن کو رات اور رات کو دن بنا دینے کے مترادف ہیں۔ اب ارکانِ انجمن کے خیال کی اہمیت سمجھ میں آئی۔ اور پختہ عزم کر لیا گیا کہ اب اردو لغت کی تکمیل کے بعد ہی کوئی اور کام کیا جائے گا۔ چنانچہ شب و روز کی محنتِ شاقہ کے نتیجے میں زیر نظر لغت مرتب ہوا۔'[۵۵]

سندھی اور اردو پر مشتمل ذوالّلسانی اخبار 'مراد'

قیامِ پاکستان کے تقریباً تین سال بعد نسیم امروہوی نے خیر پور سے اردو اخبار جاری کیا۔ اس نئے ملک میں یہ پہلا اخبار تھا جو بیک وقت دو زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ سندھی اور اردو پر مشتمل یہ ذوالّلسانی اخبار صحافت میں نسیم کے اس مقصدِ اعلیٰ کا سب سے اہم اظہار ہے کہ علاقائی اور قومی زبان کا شیر و شکر ہو کر ایک ساتھ آگے

۵۵۔ پیش لفظ، نسیم اللغات (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، پہلا ایڈیشن، ۱۹۵۵ء)، ص ۵

کی جانب قدم اٹھانا ہی اس صوبے اور اس ملک کی ترقی کا ضامن ہوگا۔

برصغیر میں اردو صحافت کی تاریخ کے ابتدائی دور کا تذکرہ کرتے ہوئے ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے اخبار 'جام جہاں نما' کے جاری ہونے کا حوالہ دیتے ہوئے گربچن چندن لکھتے ہیں:

> 'اس دور کے سنگلاخ ماحول میں، جو نئے برطانوی سامراج کی پابندیوں اور سختیوں سے عبارت تھا، ایک ایسی زبان میں اخبار نکالنا جو صدیوں سے بول چال ہی کی سرحد پر کھڑی پر تول رہی تھی، ایک کٹھن اور صبر آزما تجربہ تھا۔ ہری ہردت جس نے سب سے پہلے اس تجربے کا خواب دیکھا اور اسے عملی جامہ پہنایا یقیناً ایک جری اور آتشِ نمرود میں کودنے والا شخص تھا۔ اس نے کہا کہ میں خالص ہندوستانی میں ایک ایسا اخبار نکال رہا ہوں جو قارئین کی تفریحِ طبع اور ذہنی تسکین کا سامان پیش کرے گا'
>
> اس نے اس اخبار کا لائسنس دو زبانوں فارسی اور ہندوستانی کے لیے لیا تھا لیکن آغاز ہندوستانی سے کیا۔ اردو قارئین کا حلقہ بنانے میں ابتدا میں اسے ناکامی ہوئی۔ چنانچہ اجرا کے قریب دو ماہ بعد اس نے اسے یکسر فارسی ایڈیشن میں بدل دیا لیکن اردو سے اس کی محبت مسدود نہیں ہوئی۔ ایک سال بعد اس نے پھر اردو کی طرف رجوع کیا اور تقریباً پانچ سال تک فارسی ایڈیشن کے ساتھ چار اوراق کا ایک اردو ضمیمہ بھی شائع کیا۔[۵۶]

اردو صحافت کے ابتدائی زمانے میں 'جام جہاں نما' کی اشاعت کو گربچن چندن نے ایک کٹھن اور صبر آزما تجربہ قرار دیا۔ نسیم امروہوی نے اگرچہ 'مراد' اس زمانے میں جاری کیا جبکہ اخباری صحافت کی ایک تاریخ بن چکی تھی۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ایک ایسے اخبار کا اجراء جس میں اردو کے ساتھ ساتھ سندھی کو بھی مرکزیت حاصل تھی اس اعتبار سے نسیم کے لیے بھی ایک کٹھن اور صبر آزما تجربہ تھا کہ سندھیوں اور مہاجروں کے دلوں میں اپنی اپنی زبان کے تحفظ کا جو ایک جوش اور جذباتیت تھی اور ایک دوسری زبان کے مقابلے میں ان کے جو اپنے اپنے خدشات تھے ان کی راہیں ہموار کرنا کچھ آسان کام نہ تھا مگر نسیم نے ایک وطن دوست اور دیانت دار صحافی کی ذمہ داریوں کو قبول کرتے ہوئے ایک چیلنج کے طور پر اس سفر کا آغاز کیا۔ ضمیر نیازی ایک صحافی کی ذمہ داری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۵۶۔ برصغیر میں اردو صحافت کی ابتدا، مشمولہ 'قومی زبان' نومبر ۱۹۹۳ء، ص ص ۴۷، ۴۸

'چاروں طرف پھیلی ہوئی اس گندگی کے باوجود، صحافی کی ذمہ داری ہے کہ وہ روزمرہ کے واقعات کو قلم بند کرتا رہے اور تمام سچائیوں کا بیان نہ سہی لیکن جو سامنے کی سچائیاں ہیں انہیں درست تناظر میں بیان کرتا رہے واقعات اور حقائق کی ایک اپنی زندگی ہوتی ہے وہ مقتدر یا مخالف لوگوں کی خواہشوں، مطالبوں اور امنگوں سے ماورا بلکہ صاحب قلم کی مصلحتوں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔'[۵۷]

قیام پاکستان کے بعد خیر پور کی ریاست جب ریاست کے مخصوص اور محدود دائرے سے نکل کر پہلی بار جمہوریت سے آشنا ہوئی تو اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے نسیم نے مراد اخبار جاری کیا۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے اس کی تاریخِ اجراء مارچ ۱۹۵۱ء لکھی۔[۵۸] اخبار کے اجراء کا پس منظر اور اپنی مشکلات کا ایک تفصیلی اظہار نسیم امروہوی نے خیر پور کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے کیا ہے۔ درج ذیل اقتباس اس تمام صورتِ حال کا خلاصہ ہے۔ نسیم لکھتے ہیں:

'تین سال کی قلیل مدت میں مجموعی طور پر یہ ریاست انگریزوں کے گزشتہ زمانے کی فرسودہ روایات کی یادگار ہونے کے بجائے ایک عہد آفریں اور جمہوریت نواز ریاست بن گئی۔ اس عہد میں کئی قومی اور شخصی فیکٹریاں قائم ہوئیں اور پرانے کارخانوں میں توسیع کی گئی۔ قومی ملکیت کے اصول پر ٹرانسپورٹ کا محکمہ قائم کیا گیا۔ جس سے ایک طرف تو ریاست کی آمدنی میں معقول اضافہ ہوا اور دوسری طرف نقل و حمل کے سلسلے میں کم سے کم پیسہ خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ آسانیاں حاصل ہوگئیں بہت سے چھوٹے چھوٹے شخصی کارخانے عوام نے ذاتی سرمایہ سے قائم کیے۔ حکومت کی جانب سے دیہات میں مزید مدرسوں کا قیام عمل میں آیا۔ نئی نئی سڑکیں اور عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ مزارعین کے لیے ٹریکٹرز منگوائے گئے۔ ناقابل کاشت زمینوں کو قابل کاشت بنایا گیا۔ ولایتی کھاد اور اچھا بیج تقسیم کیا گیا۔ ریاست میں خام اجناس کی فراوانی اور صنعتوں سے عوام کی دلچسپی کے پیشِ نظر ایک نیا محکمہ ترقی صنعت کے نام سے قائم کیا گیا جس نے نشر و اشاعت کے ذریعے عوام کو ریاست کی خام اجناس کے استعمال سے روشناس کرایا۔ جس

۵۷۔ حکایاتِ خونچکاں (کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، طبع اول ۲۹ راپریل ۱۹۹۷ء)، ص ۳۶

۵۸۔ مقدمہ مراثی نسیم، جلد اول (کراچی: ایجوکیشنل پریس، مطبوعہ ۱۹۹۲ء)، ص ۱۷

کے نتیجہ میں کئی صنعتوں نے رواج پایا۔ دیہات کے باشندوں کی فلاح و بہبود کے لیے امداد باہمی کا محکمہ قائم ہوا اور اس کے لیے ایک رجسٹرار اور دوسرے عمال مقرر کیے گئے محکمۂ اصلاح دیہات کے قیام کی ابتدائی منزلیں طے کی گئیں۔ ان تمام چیزوں نے مل جل کر ریاست کا ماحول ہی بالکل بدل دیا۔ عوام کی ذہنیت میں ایک صالح انقلاب پیدا ہوا اور ان کا سیاسی شعور سوتے سوتے جاگ اُٹھا۔ عین اس وقت جبکہ ترقی اور اصلاح کی یہ رو بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ پوری ریاست کے طول و عرض میں دوڑ رہی تھی راقم الحروف نے اس رو بہ ترقی ذہنیت کو استوار کرنے کی غرض سے ایک ہفت روزہ اخبار 'مراد' کے نام سے ریاست میں جاری کر دیا۔ جس وقت یہ اخبار نکلا ہے اس وقت تک گزشتہ دور کے ایسوسی ایشن ایکٹ کی کچلی ہوئی غلامانہ ذہنیت کے اثرات اس قدر باقی تھے کہ عوام اس اخبار کے کارکنوں کو حکومت کا مجرم سمجھ کر ان سے دور بھاگتے تھے اور کئی مہینے تک عام لوگوں کو مفت بھی 'مراد' کا مطالعہ منظر عام پر کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ [۵۹]

نسیم امروہوی جن کی تمام ادبی زندگی کا بڑا حصہ دوسری خدمات کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگاری میں گزرا اور یہ فن پاکستان میں ان کی پہچان بھی بنا اور لوگ انہیں انیس دوراں کے نام سے یاد کرنے لگے۔ اس شہرت اور عظمت کے باوجود اخبار کے اجراء اور قومی صحافت کو وہ مرثیہ نگاری سے بھی بڑا کام کہتے ہیں۔ مرثیے میں بہادروں اور سپاہیوں کا ایک مسلسل بیان ہوتا ہے لیکن نسیم اخبار کو کاغذ کا ایک ایسا سپاہی قرار دیتے ہیں جو لاکھوں فوجوں پر بھی بھاری ہوتا ہے ان کے ایک مرثیے کی یہ ایک بیت اور ایک بند اس کا مکمل اظہار ہے:

اب نہ جبّہ اور نہ دستار و عمامہ چاہیے
قوم کے شایان شان اک روزنامہ چاہیے

وعظ ہوں یا مرثیے دم میں ہوا ہیں یہ تمام
ہے عبث تبلیغِ وقتی جب نہ ہو ابلاغِ عام
وقت کی آواز ہے قومی صحافت کا قیام
بے بسی میں ہے یہی حق کی محافظ والسّلام

۵۹۔ تاریخِ خیر پور (خیر پور میرس سندھ: مراد برقی پریس، ۱۹۵۵ء)، ص ص ۱۲۲، ۱۲۳

کاغذی کشتی نہیں ہوتی ہے موجوں پر گراں
ہے یہ کاغذ کا سپاہی لاکھ فوجوں پر گراں[۶۰]

نسیم امروہوی ۱۹۶۱ء میں ترقی اردو بورڈ سے وابستگی کے سبب خیر پور سے کراچی منتقل ہوگئے۔ اس طرح ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک نسیم کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ اخبار بند تو نہیں ہوا لیکن اس کی ادارت اور اس کے انتظام سے دوسری شخصیات وابستہ ہوگئیں اور یہ وہی افراد تھے جو نسیم کے ساتھ 'مراد' کے پورے دور میں ان کے ساتھ رہے۔ نسیم امروہوی کے چھوٹے صاحب زادے وسیم حیدر کے پاس محفوظ نوادراتِ نسیم میں وہ لیٹر پیڈ میں نے دیکھا ہے جس پر نسیم امروہوی کا نام بحیثیت نگراں لکھا ہوا ہے۔ اس لیٹر پیڈ سے درج ذیل معلومات بھی ملیں:

۱۔ لیٹر پیڈ کی پہلی سطر میں یہ جملہ لکھا ہوا ہے 'کراچی اور خیر پور میرس سے بیک وقت شائع ہونے والا سہ روزہ مراد' اس سے اندازہ ہوا کہ نسیم امروہوی کے کراچی منتقل ہوجانے کے بعد یہ کراچی سے بھی شائع ہونے لگا تھا۔
۲۔ کراچی سے شائع ہونے والے مراد اخبار کا دفتری پتہ یہ درج ہے '۵/۴۰ رسی ون لیاقت آباد، کراچی۔۱۹' جبکہ خیر پور کے دفتر کے حوالے سے '۴۲/۴۴ نظامانی لکھا ہوا ہے۔
۳۔ نسیم امروہوی (نگراں) کے نام کے بعد مدیر و ناظم میں علی اطہر جعفری کا نام درج ہے۔
۴۔ مدیر برائے خیر پور میرس میں غلام حسن مخدومی اور یکتا امروہوی کے نام لکھے ہوئے ہیں۔

یکتا امروہوی بھی بعد میں خیر پور سے کراچی منتقل ہوگئے راقمہ نے جمعہ ۲۸ ردسمبر ۲۰۰۱ء کو کراچی میں مراد اخبار کے حوالے سے ان سے ایک انٹرویو کیا[۶۱] جس سے یہ معلومات حاصل ہوئیں:

۱۔ 'اس اخبار کے اجراء سے جناب نسیم امروہوی کے مقاصد یہ تھے کہ پرانے سندھیوں اور نئے سندھیوں (مہاجرین) میں محبت کا رشتہ اُستوار ہو۔ مہاجرین سندھی زبان کی قدر و منزلت سے واقف ہوں اور سندھی احباب اردو کی قومی طاقت کو سمجھیں جب دونوں ایک دوسرے کی زبانوں سے قریب ہوجائیں گے تو ان کے قومی وسماجی مسائل سمجھنے میں بھی

۶۰۔ مرثیہ، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن سادات امروہہ پاکستان، ۱۹۹۲ء)، ص ۲۹۵
۶۱۔ بمقام، مکان ۱۰۷۰، بلاک ۲۰/، فیڈرل بی ایریا کراچی

آسانی ہوگی'

۲۔ 'عوام الناس سے ہٹ کرنسیم صاحب نے پڑھے لکھے لوگوں اور اہلِ علم حضرات کے لیے سندھی اور اردو کے لسانی روابط پر عالمانہ مضامین بھی لکھے اگر یہ مضمون دستیاب ہوسکیں تو میری رائے یہ ہوگی کہ انہیں سندھ کے اردو اور سندھی نصاب کا حصہ بنایا جانا چاہیے'

۳۔ 'جو مضامین اردو میں ہوتے وہی سندھی میں ہوتے تھے ایک ہی شخص ترجمہ کرتا تھا'

۴۔ 'پریس خیر پور میں نہیں تھا سکھر میں چھپتا تھا پھر ایک چھوٹا سا پریس بک رہا تھا نسیم صاحب نے اسے خرید لیا اور خیر پور میں لے آئے'

۵۔ مراد اخبار کا دفتر مین بازار خیر پور میں تھا اخبار کی اشاعت ایک ہزار سے بھی زیادہ ہوتی تھی کبھی کبھی یہ دو ہزار بھی چھپا'

۶۔ 'کتابت کرنے والوں میں ایک شوکت تھا جو لاہور کا رہنے والا تھا دوسرے کا نام یاد نہیں رہا'

۷۔ 'نسیم صاحب کے بعد اِسے ترتیب دینے والوں میں ایک میں تھا دوسرے غلام حسن مخدومی تھے۔ وہیں رہا کرتے تھے۔ عمر میں بھی مجھ سے چھوٹے تھے ماشاءاللہ ابھی بقید حیات ہیں'

۸۔ 'میں سمجھتا ہوں کہ مراد کے اداریے بہت اہم ہیں۔ اگر یہ پرچے دستیاب ہوسکیں اور نسیم صاحب کے لکھے ہوئے ان اداریوں کو یکجا کیا جائے تو ہمیں ان کی وسعتِ نظر کا اندازہ ہوسکے گا'

۹۔ 'مراد اخبار کی خدمات کا سماجی مطالعہ بہت اہم ہوگا بشرطیکہ اس کی فائلیں مل جائیں میرے بیٹے حسن حیدر کے پاس شاید کچھ مل جائے۔ غلام حسن مخدومی کے پاس اس کے کچھ پرچے ہونے چاہئیں۔ کراچی میں علی اطہر جعفری مرحوم کے فرزند وزیر حیدر جعفری کے پاس بھی فائلیں تھیں مگر وہ مرحوم ہوگئے۔ اب کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ کہاں سے فائلیں ملیں گی'

سندھی زبان وادب کے ایک بزرگ ادیب کریم بخش خالد نے اپنے ایک مضمون میں مراد اخبار کے حوالے سے نسیم کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ اس مضمون کے دو اقتباسات درج ذیل ہیں:

'حضرت نسیم امروہوی سے میری نادیدہ محبت کا سلسلہ ۱۹۵۳ء سے تھا۔ پیرزادہ عبدالستار مرحوم سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے اور میں افسرِ اطلاعات کی حیثیت سے ان کے ہمراہ سکھر کے دورے پر جاتا رہتا تھا۔ ایسے ایک موقع پر مجھے 'مراد' اخبار دیکھنے کا اتفاق ہوا جو خیر پور سے اردو/سندھی میں شائع ہوتا تھا۔ اخبار کا لے آؤٹ اور گیٹ اَپ تو خیر معمولی سا تھا لیکن مقامی خبروں خصوصاً خیر پور ریاست کے ترقیاتی کاموں، اصلاحی اور معلوماتی مضامین اور تعمیری نوعیت کے اداریوں کے اعتبار سے وہ صحیح معنوں میں صحیفہ تھا۔' [۶۲]

'مراد' کے دو چار شمارے دفترِ اطلاعات سے دستیاب ہوئے جن کے مطالعے کے نتیجے میں نسیم صاحب کی علمی بزرگی اور ادبی عظمت نے میرے ذہن پر ایسا نقش اُبھارا جو آج تک محو نہ ہو سکا۔ ان شماروں میں 'ہجرت کا فلسفہ' اور سندھی اُردو دو بہنیں ایسے مضامین تھے جو نہ صرف نسیم صاحب کے جذبۂ ایمانی، انسان دوستی اور حب الوطنی کو آشکار کرتے تھے بلکہ صحافت کے بنیادی مقاصد اور ابلاغ کے قوی تقاضوں کی تکمیل بھی کرتے تھے۔ [۶۳]

نسیم نے اس اخبار کو خبروں کے ساتھ ساتھ موضوعات کا بھی ایک پھیلاؤ دیا تھا جس میں زندگی کے مختلف پہلو صاف جھلکتے تھے۔ جابرانہ نظام کی خامیوں کا بیان ہوتا تھا جمہوریت کے روشن پہلوؤں پر اکثر مضامین شائع ہوتے تھے۔ ایک زرعی ملک کس طرح آہستہ آہستہ ایک صنعتی میدان بنتا ہے اور معاشرے کو اس کے کیا کیا فوائد ہوتے ہیں اس پر اکثر لکھا گیا۔ توہم پرستی، قدامت پرستی اور دقیانوسیت ایک سماج کے لیے کس قدر زہرِ قاتل کا درجہ رکھتی ہے اس عنوان سے کئی تحریریں مراد میں شائع ہوئیں۔ جاگیردارانہ نظام کی خرابیاں اور اس کی چکی میں پسے ہوئے لوگوں کے حالِ زار پر افسانوی طرز میں مختلف تحریریں اس کا ایک حصہ تھیں مراد کے مضامین میں مذہب پر بھی بہت لکھا گیا اور یہ بتایا گیا کہ مذہب دراصل آدمی بناتا ہے جو سماج کو آگے لے کر چلتا ہے اور سیاسی نظام دیتا ہے۔ وطن دوستی پر مختلف ادبی تحریریں بھی شائع ہوئیں۔ مسئلہ کشمیر پر بھی بہت سنجیدہ بحثیں کی گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی بعض شگفتہ تحریریں چھپتی تھیں۔ بعض ایسی نظمیں بھی اس کا حصہ ہوتی تھیں جو خود نسیم نے بچوں کے لیے لکھیں۔ ایک نظم 'دریائے سندھ طالب علموں کے

۶۲۔ نسیم امروہوی کے علمی و ادبی کارناموں پر ایک نظر، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ سادات امروہہ پاکستان، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۰۳

۶۳۔ ایضاً

لیے' سے یہ اقتباس دیکھیے:

نشاں ہے جو نقشے میں اک گول سا — پہاڑوں سے یہ سندھ دریا چلا
تڑپتا بپھرتا مچلتا ہوا — سمٹتا اکڑتا سنبھلتا ہوا
وہ لہروں کی ہل چل وہ پانی کا زور — وہ دھاروں کی شورش وہ موجوں کا زور
نشیبوں کی جانب کو بڑھتا ہوا — زمینوں کی چھاتی پہ چڑھتا ہوا
بھٹکتا ہوا گنگناتا ہوا — چٹانوں کے پتھر بہاتا ہوا
جو چڑھتا ہے اِک قہر ڈھاتا ہے یہ — پہاڑوں سے ٹکرا کے آتا ہے یہ
نرالا ہے اس کی روانی کا ٹھاٹ — جو کوسوں کا دھارا تو میلوں کا پاٹ
وہ سکھر میں ہیں اس کی نہریں رواں — زمیں سندھ کی جن سے ہے گل ستاں
رتیلی زمیں کو وہ دی ہے تری — اُمیدوں کی کھیتی ہے جس سے ہری
ہر اک نہر اس کی ہے شاخِ نبات — ہر اک موج اس کی ہے آبِ حیات
وہ سرسبز فصلیں اُگاتا ہے یہ — زمانے کو روٹی کھلاتا ہے یہ
کہاں اور دریا کی یہ شان ہے — ہمارے وطن کی تو یہ جان ہے
یہ قطروں کی کثرت یہ موجوں کی فوج — یہ ہے سندھ میں خاص جنت کی موج

سمندر کے دامن میں رکھا ہے خاک
ہوئی سندھ دریا سے یہ خاک پاک[۶۴]

مراد اخبار کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ جن شخصیات پر تعارفی حصے شامل کیے جاتے تھے ان میں اس پر زیادہ زور دیا جاتا تھا کہ اس شخصیت نے معاشرے کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے وہ کون سے کارنامے تھے جنھوں نے سماجی زندگی کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اخبار کے مدیر/منتظم سید علی اطہر کے انتقال پر جو'اطہر نمبر' شائع کیا گیا اس میں ان کی خدمات کو اسی زاویے سے دیکھا گیا۔ ان کے تعارف کے ذیل میں یہ اقتباس دیکھیے:

'سید علی اطہر نے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۰ء تک صحافت میں حصہ لیا اس مدت میں تین جرائد ماہنامہ 'نیا زمانہ' ہفت روزہ 'نوائے مہاجرین' اور ہفت روزہ 'پیامِ نو' کراچی سے نکالے۔

۶۴۔ مراد، جلد۱۴/ ۱۱ اگست ۱۹۶۳ء، ص۳

قیامِ پاکستان کے بعد کلیمز اور دیگر اہم عمرانی و سماجی مسائل حل کرانے میں انھوں نے بہت بنیادی کردار ادا کیا۔ آبادکاری بورڈ کے وہ چیئرمین بھی رہے۔[۶۵]

مراد کی اشاعت کے عمرانی اثرات

نسیم امروہوی نے خیر پور کی تاریخ لکھتے ہوئے مراد کی اشاعت کے عمرانی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے جن چند بنیادی باتوں کا اظہار کیا ہے وہ یہ ہیں ہفت روزہ 'مراد' (جواب سہ روزہ ہے) پاکستان میں اپنی نوعیت کی واحد اور مثالی حیثیت لے کر منصۂ شہود پر آیا۔ اس کی امتیازی خصوصیت یہ رہی کہ اس میں ایک طرف اردو ہوتی ہے اور دوسری طرف اس کا سندھی ترجمہ۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اردو اور سندھی کے ان ملے جلے مضامین کی مسلسل اشاعت سے خود بخود ایک نئی دنیا پیدا ہونے لگی۔ جو ہر شعبۂ زندگی میں انصار و مہاجرین کے شیر و شکر ہو جانے کا پر کیف منظر بھی لیے ہوئے ہے۔ یہ اخبار بہت تھوڑے عرصہ میں اتنا مقبول ہوا کہ اسے ہفتہ وار کے بجائے 'سہ روزہ' کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس اخبار نے تعمیری رجحانات کو بہت تقویت پہنچائی۔ اور احساسِ آزادی جو عوام میں پیدا ہو چکا تھا اتنا اُجاگر کر دیا کہ انہیں اپنے گرد و پیش ہر قسم کی ترقی کی وسیع راہیں بے روک ٹوک کھلی نظر آنے لگیں اور ترقیات کی رفتار بہت جلد تیز سے تیز تر ہوگئی۔ ان تمام تحریکات اور عملی اقدامات کا نتیجہ ریاست کے باشندوں کی معاشی خوشحالی کی صورت میں نمودار ہوا اور تقریباً تمام بے روزگار لوگ کسی نہ کسی روزگار سے لگ گئے اور وہی اشخاص جو دو برس پہلے ہاتھ دھرے بیٹھے تھے قسم قسم کے نفع بخش کاروبار میں حصہ لے رہے ہیں۔[۶۶]

تاریخِ خیر پور

نسیم امروہوی کی یادگار تصانیف میں 'تاریخِ خیر پور' کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ تاریخ کتابی صورت میں ۱۹۵۵ء میں منظرِ عام پر آئی۔[۶۷] ۱۹۵۸ء میں اخبار مراد کی ایک ضخیم اشاعت بھی اس سے منسوب کی گئی۔[۶۸] حکومتِ پاکستان کے ایک سابق وزیر، کراچی یونیورسٹی کے سابق شیخ الجامعہ اور شعبۂ تاریخ کے

۶۵۔ مراد، جلد ۱۵، نمبر ۳۵، ۳۶، ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۲

۶۶۔ تاریخِ خیر پور (خیر پور میرس سندھ: مراد برقی پریس، ۱۹۵۵ء)، ص ۱۲۳

۶۷۔ مراد برقی پریس ۱۹۵۵ء

۶۸۔ جلد ۸، شمارہ ۱، ۱۵ / مارچ ۱۹۵۸ء

پروفیسر ڈاکٹر محمود حسین کی تعارفی تحریر اس کتاب کی ابتدا میں شامل ہے یہ تاریخ، خیر پور کی سماجی تاریخ سے ادبی تاریخ تک اور جغرافیائی اور ریاستی تاریخ سے تہذیبی تاریخ تک کا احاطہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین اس کے تعارف میں لکھتے ہیں:

'جناب سید قائم رضا صاحب نسیم کا شمار اردو کے مشہور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ آپ کی تصانیف سے اُردو داں دنیا پہلے سے واقف ہے۔ پاکستان آ کر آپ نے خیر پور کو اپنا وطن بنایا۔ اس وقت آپ خیر پور کے سہ روزہ اخبار 'مراد' کی ادارت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ 'تاریخ' سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں۔ چنانچہ خیر پور میں رہ کر آپ کو خیر پور کی تاریخ مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ میں نے زیرِ نظر تاریخ کو دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ نسیم صاحب نے یہ تاریخ بڑی محنت اور جستجو سے مرتب کی ہے۔ بہت مطالعہ کے بعد کتاب لکھی گئی ہے اور خیر پور کے متعلق تمام اہم تاریخی واقعات کتاب میں آ گئے ہیں۔ نسیم صاحب کا اندازِ تحریر دل نشین ہے اور ترتیب میں بڑے سلیقہ سے کام لیا گیا ہے۔'[۶۹]

اس کتاب کی تحقیقی اہمیت خصوصیت کی حامل ہے۔ نسیم نے بعض اہم نایاب، تاریخی، تہذیبی و سیاسی دستاویزات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس تاریخ کی تدوین کے مراحل سے گزرتے ہوئے ان کے پیشِ نظر یہ ماخذ تھے۔[۷۰]

۱۸۹۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کی سرکاری گزٹ کی فائلیں، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے پمفلٹ، شعبۂ عدلیہ اور دیگر محکمہ جات کے ریکارڈ، خیر پور کی عمارتوں کے کتبات، سہ روزہ مراد اخبار (خیر پور) اور اخبار وادیٔ سندھ (شکارپور)، خیر پور ریاست کی چیف سکریٹری کی انگریزی تحریریں، میر رستم علی خاں اور میر علی مراد خاں اول کے درمیان عہد نامے کی دستاویز، مرزا قلیچ بیگ کی سندھی زبان میں لکھی گئی تاریخ، لیاقت علی خان، نواب اشتیاق احمد گورمانی، ڈاکٹر محمود حسین، پیر حسام الدین راشدی اور دوسرے عمائدینِ شہر کے بیانات، ان کے ساتھ ساتھ ماخذ کا بڑا ذریعہ نسیم کے مشاہدات اور ان کی اپنی معلومات بھی تھیں۔

۶۹۔ مشمولہ، تاریخِ خیر پور (خیر پور میرس سندھ: مراد برقی پریس، ۱۹۵۵ء)، ص ۸

۷۰۔ ایضاً، ص ۴۹

کریم بخش خالد لکھتے ہیں:

'سابق ریاست خیر پور کے بارے میں یہ نہایت تفصیلی اور مستند کتاب ہے اس سے پہلے شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ نے سندھی زبان میں تاریخ مرتب کی تھی جو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی۔'[۷۱]

سندھی زبان کے ایک اسکالر اور کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ سندھی کے سابق صدر ڈاکٹر نواز علی شوق اس تاریخ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'نسیم صاحب جب خیر پور میں تھے تو علمی، ادبی محفلیں عروج پر تھیں انہوں نے تاریخِ خیر پور جیسی معیاری کتاب لکھ کر نہ فقط اہلِ خیر پور بلکہ پورے سندھ پر بڑا احسان کیا۔'[۷۲]

کم وبیش ۲۸۰ ذیلی سرخیوں کے تحت تاریخِ خیر پور کا خاکہ تیار کیا گیا جن میں اہم عنوانات یہ ہیں:

خیر پور کی سرکاری زبان، کارخانے، دواخانے اور حمل ونقل، سندھ میں انگریزوں کا اقتدار ختم ہونے کے اسباب، کراچی پر انگریزوں کا قبضہ، ریاست خیر پور میں برطانوی حکومت کا آغاز، دورِ علی مراد میں تعلیمی، زرعی اور سماجی ترقیوں کی رفتار اور منصوبے، ترویج تعلیم، وظائف اور خیرات، والیٔ ریاست کی آزادی پسندی اور عوام کی سماجی حالت، اقلیتوں کے ساتھ مساوات، جاگیرداروں کی لاقانونیت، شعرا اور علما کی قدر دانی، خیر پور میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، کاشتکاروں کی اصلاح حال، نظم ونسق میں اصلاحات، عوام کی تحریک سے نظام میں ردوبدل، انسدادِ رشوت کی مہم، قائداعظم کی تین امانتیں، جمہوریت کے عملی اقدامات، کُل پاکستان اردو کانفرنس، کل سندھ پرائمری تعلیمی کانفرنس، عبوری دور، محکمۂ ترقی دیہات، تیل کے چشموں کی تلاش، خیر پور میں گھریلو صنعتیں اور اصلاحِ دیہات وغیرہ۔

تاریخِ خیر پور میں نسیم محض ایک مورخ یا واقعات کو قلمبند کرنے میں صرف ایک راوی کے طور پر سامنے نہیں آئے اس تاریخ میں انہوں نے سندھ خصوصاً خیر پور کے سماجی ڈھانچے کو پیشِ نظر رکھ کر ایسے پہلوؤں کو اُجاگر کیا اور یہاں کی زندگی کے ایسے گوشے ظاہر کیے جن سے تاریخ کے اس وسیع جائزے میں ان

۷۱۔ نسیم امروہوی کے علمی و ادبی کارناموں پر ایک نظر، مشمولہ ارمغان نسیم (کراچی: انجمنِ سادات امروہہ، فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۱۰۴

۷۲۔ تعزیت نامہ، مرتبہ قسیم ابنِ نسیم، کراچی ۱۹۸۷ء

کے سماجی مطالعہ کی قدر نمایاں ہو کر سامنے آئی ۔ چند بنیادی نکات ملاحظہ کیجیے:

'خیر پور میں اگر چہ مختلف نسلوں اور برادریوں کے لوگ آباد ہیں۔لیکن صدیوں کے تمدنی اختلاط نے خیر پور کی تمام آبادی کو تقریباً ایک سماجی سانچہ میں ڈھال دیا ہے۔اگر چہ مختلف علاقوں اور قبیلوں کی اپنی اپنی رسوم اور قبائلی رواج موجود ہیں تاہم پوری ریاست میں ایک مجموعی تمدن کی یکسانیت اور ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ جو ہمسایہ سندھی علاقوں کی طرزِ معاشرت کی مماثل ہے۔ ریاستی تمدن کی نمایاں خصوصیات، ایثار، مہماں نوازی، سادگی، حلم اور قناعت ہیں عام لوگ خانہ نشینی اور سکون کی زندگی کو پسند کرنے کے عادی ہیں، پاکستان بننے کے بعد یہاں کی آبادی میں نئے تمدنی عنصر کا اضافہ ہوا ہے۔(ص،۱۱)

نئی حکومت کے دل میں صنعتی اور زرعی ترقیات اور دیگر اصلاحات کے بہت سے ولولے بھی تھے۔اور منصوبے بھی، مگر ان سب سے اہم یہ مسئلہ تھا کہ ریاستی عوام کے دل میں یہ احساس پیدا کر دیا جائے کہ اب وہ غلام نہیں رہے ہیں اور ان کی اپنی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ جو انہیں کے تعاون سے ان منصوبوں کو بروئے کار لا سکتی ہے جن سے ان کی معاشی اور سماجی سطح بلند ہو گی۔(ص،۱۹۹)

پہلے یہاں اخلاقی قیدیوں کو اس خیال کے تحت نظر بند رکھا جاتا تھا کہ انہیں جسمانی سزا سے تکلیف دی جائے تا کہ وہ پھر بداخلاقی میں مبتلا نہ ہوں۔لیکن اب انہیں اس زاویہ نگاہ سے جیل میں رکھا جاتا ہے کہ وہ یہاں سے نکلنے پر کسی کاروبار سے لگ جائیں اور افراد کاسبہ کی صف میں بیٹھ کر بقیہ زندگی بسر کریں۔ان کے لیے ہر قسم کی اخلاقی تعلیم اور صنعتی تربیت کے انتظامات کیے گئے ہیں۔اسی زمانے میں شہر کے اس میدان میں جو خیر پور سے روہڑی جانے والی ریلوے لائن سے متصل ہے۔سنٹرل جیل کی ایک عالی شان عمارت تعمیر کر دی گئی جس میں رہ کر قیدی وسیع اور پُر فضا خطۂ ارض کی صاف اور تازہ ہوا سے مستفیض ہوتے ہیں اور اس کا ان کی صحت اور خیالات پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔(ص،۱۲۷)

صنعت وحرفت کے اس ہرے بھرے درخت سے ایک اور شاخ پھوٹتی ہے اگر

انسان زمین کا لگان کسی ثانوی آمدنی سے ادا کر سکے تو اس کے پاس زیادہ روپیہ پس انداز ہوسکتا ہے۔صنعت وحرفت کے عروج سے زراعت کے پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ پیشہ کی طرف انسان کم تعداد میں رجوع ہوتے ہیں اور ایسی صورت میں زمین کی پیداوار، کسانوں کی بہت کم تعداد میں تقسیم ہوجاتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دیہی آبادی کی اکثریت شہروں کا رخ کرے تو دیہات کی حالت بہتر ہوجائے لیکن اس علاقے کے عوام اس عالمگیر اصول سے ابھی تک مستفیض نہیں ہوئے ہیں۔یہ امر موجب تاسف ہے کہ یہاں کی کل آبادی کا تقریباً نوے (۹۰) فیصدی حصہ دیہات میں گذر بسر کرتا ہے اور شہروں کے مفاد کی خاطر اس بھاری اکثریت کے مفاد کو قربان کر دیا جاتا ہے اگر کوئی قوم سنجیدگی اور دیانت داری سے ترقی کی خواہشمند ہے تو اسے چاہیے کہ شہروں کے مفاد پر دیہات کے مفاد کو قربان کرنے کا فرسودہ طرزِ عمل تبدیل کردے اور دیہات وشہر کی باہمی خانہ جنگی اور ردِ عملی کو ختم کرکے ایک جدید ہمرنگی پیدا کرے۔(ص،۱۳۷)

دیہات میں اس سال عام اصلاحات کے علاوہ تعلیمِ بالغاں اور لڑکیوں کی تعلیم کے اسکول حکومت کی جانب سے قائم کیے گئے ہیں جن میں لڑکیوں کو اس قسم کی دستکاری سکھائی جارہی ہے جس سے وہ گاؤں میں بیٹھ کر کسب معاش کرسکیں۔اچھی نسل کی مرغیاں پالنے اور ان کی نسل اور انڈوں سے نفع حاصل کرنے کے کاروبار کو بھی دیہات میں رواج دیا گیا ہے۔'(ص،۱۴۲)

سندھی زبان کے اہم شعرا کے افکار

سندھ کے حوالے سے تاریخِ خیر پور، تونسیم کا بہت بنیادی اور ایک ایسا تحقیقی کام ہے جس سے انہوں نے سندھ کے ایک مرکزی علاقے کی تہذیب و تاریخ کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایسے موضوعات پر بھی مسلسل لکھا ہے جس سے کسی سماج کا حقیقی چہرہ نظر آتا ہے۔سرسید احمد خاں نے جس طرح ادب کو زندگی کی ایک بنیادی قدر قرار دیا اور اس سے تہذیبی وسماجی زندگی کے سفر میں نئے حوصلوں کے لیے راہیں کھولیں۔نسیم بھی اسی فکر کی شخصیت ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اپنے سماج کو آگے لے کر چلنا ہے تو عوام کو اس کی تاریخ کے ادبی دانشوروں سے روشناس کرانا ضروری ہے اس سلسلے کا سب سے پہلا

نام سچل سرمست کا ہے اس بزرگ صوفی شاعر کی اس اہمیت کو بھی انہوں نے بیان کیا کہ وہ اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اس سے ان کا مقصد سماج کے ہر طبقے کے جذبات کا اظہار تھا۔نسیم کے ایک مضمون سے تین مختصر اقتباس دیکھیے :

'اس مقام پر یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ ۱۷۳۸ء میں جب سچل پیدا ہوئے، اردو زبان اصلاح وتہذیب کی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی سچل نے تقریباً ۱۷۵۴ء میں شعر کہنا شروع کیا۔اس وقت وؔلی دکنی وفات پا چکے تھے۔انعام اللہ خان یقین کا آخری وقت تھا، قائم چاندپوری،خواجہ میر دردؔ اور میر تقی میرؔ کی شاعری کا چرچا شروع ہو چکا تھا۔نظیرؔ اکبرآبادی نے شعر گوئی کی بسم اللہ پڑھی تھی ناسخ ابھی مکتب میں ابتدائی درسیات پڑھ رہے تھے'۔[۷۳]

'سندھ کی سرزمین پر، خیرپور کے قریب، درازا شریف میں ایک شاعر پیدا ہوا، جو سندھی، سرائیکی، ملتانی زبانوں میں غوامضِ تصوف والہیات کے چہرے سے جہلِ علم کی نقاب اٹھا کر، وحدت الوجود کے بے روک ٹوک جلوے دکھاتا تھا اور بنی نوع انسان کی غمخواری اور کمزوروں کی دستگیری کا وہ عالم گیر پیغام سناتا تھا، جو انسانیت اور مساوات کی دنیا میں آج دو سو برس گزر جانے کے بعد بھی اپنی پوری قوت اور تاثیر کے ساتھ زندہ ہے'۔[۷۴]

'سچل میں ایک امتیازی وصف بھی نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنے عہد کی شاعری کے عام ماحول سے متاثر ہو کر اپنی غزل میں تفنن کے طور پر بھی بے مطلب اور سطحی باتوں کو جگہ نہیں دی۔علاوہ ازیں غزل میں معاشرے کی اصلاحِ حال کے لیے وعظ و پند کا طریقہ۔ جس نے حالؔی کے دور میں خوب فروغ پایا۔اس زمانے کے شعرا میں سچل کے یہاں ایک نمایاں عنصر کے طور پر پایا جاتا ہے'۔[۷۵]

بے معنی گوشہ نشینی سے انحراف

توکل وقناعت اگرچہ ایک عمدہ اضافی وصف ہے اور اسلامی طرزِ حیات میں اسے بہت اہمیت حاصل ہے لیکن نسیم نے ایسے توکل وقناعت کو جو انسان کو ایسی گوشہ نشینی کی طرف لے جائے جس سے زندگی کی سرگرمیاں بجھ

۷۳۔ سچل کی اردو اور فارسی شاعری،مشمولہ،اردونامہ کراچی،جولائی تا ستمبر،۱۹۶۱ء،ص ۷

۷۴۔ ایضاً،ص ۸

۷۵۔ ایضاً،ص ۹

جائیں اور انسان کا اپنے سماج سے تعلق ٹوٹ جائے کبھی پسند نہیں کیا۔ سچل پر لکھتے ہوئے انہوں نے اس نکتے کو بہت نمایاں کیا۔ اس شاعرِ ہفت زباں کے سماجی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ:

'وہ ایسے علاقے کے باشندے تھے جہاں کے لوگ صدہا سال سے غلامی در غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہونے کے باعث توکل وقناعت اور گوشہ نشینی کے عادی ہو گئے تھے ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنے کے بعد سچل اپنی غزلوں میں اگر تغزل کے رواجی مضامین نظم کرتے تو ان کی شاعری اور زندگی میں قطعاً تطابق باقی نہ رہتا۔'[۷۶]

سچل سے نسیم امروہوی تک

نسیم امروہوی نے خیر پور میں رہ کر سندھی شعرا کی شعری خدمات پر مختلف زاویوں سے لکھا۔ مراد اخبار میں اس حوالے سے ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ والیانِ ریاست سے لے کر عام شعرا اور ان کی عام شعری محفلوں تک کی ادبی سرگرمیاں اور ان سے بننے والی تاریخ ان کے پیشِ نظر تھی انہوں نے 'تاریخِ خیر پور' میں بھی ان کا جائزہ لیا ہے۔ خیر پور میں نسیم کی ان ادبی سرگرمیوں کا ایک بڑا سبب والیانِ ریاست کی سخن شناسیوں کا جذبہ تھا۔ والیِ ریاست علی نواز کے دور سے اس کی ایک تاریخ ہمیں ملتی ہے یہ وہ دور تھا جب نسیم کے دادا شمیم امروہوی رام پور سے خیر پور آتے تھے انہوں نے اپنے مسدّس کے ایک بند میں اس کا اظہار کیا ہے:

بندہ نوازیوں میں ہے یکتا علی نواز
سلطانِ وقت اور غلامِ شہہ حجازؐ
حق کا نیاز مند زمانے سے بے نیاز
یہ میر بھی ہے، نیک رعایا بھی پاکباز
ہر شخص اہلِ دل ہے عجب یاں کی سیر ہے
یہ خیر پور اصل میں بھرپور خیر ہے[۷۷]

۷۶۔ سچل کی اردو اور فارسی شاعری، مشمولہ اردو نامہ کراچی، جولائی تا ستمبر ۱۹۶۱ء، ص ۱۰

۷۷۔ بشکریہ وسیم ابن نسیم امروہوی، مقیم جدہ سعودی عرب

ڈاکٹر شاہدہ بیگم اپنے تحقیقی مقالے 'سندھ میں اردو' میں لکھتی ہیں:

'سندھ میں اردو کی نشر و اشاعت میں خیر پور نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اس ادب پرور ریاست کا ہر فرماں روا خود بھی شاعر تھا اور شاعر نواز بھی۔ میر علی مراد اول سے لے کر میر علی مراد خاں ثانی تک ہر والی ریاست کے دور میں مختلف نہج و اعتبار سے ادب کی خدمت کی گئی اور سچل سرمست سے لے کر نسیم امروہوی تک مقامی و غیرہ مقامی کی تمیز کے بغیر قلم کاروں پر نوازش و اکرام کی بارش ہوتی رہی۔ ۷۸

کلیاتِ ناز

ریاست خیر پور کے والی میر علی نواز (۱۸۸۴ء۔۱۹۳۵ء) جو شاعری میں ناز تخلص کرتے تھے۔ ان کی تمام شاعری کو نسیم امروہوی نے مرتب کر کے خیر پور ہی سے شائع کیا۔ کلیاتِ ناز ۷۹ بیسویں صدی کے ایک اہم سندھی شاعر کے اردو کلام پر مشتمل مجموعہ ہے جس پر نسیم نے ایک مربوط مقدمہ بھی لکھا ہے۔

سندھ کی ادبی تاریخ میں یہ بات ایک درخشاں باب کی حیثیت رکھتی ہے کہ سندھی زبان کے متعدد شعرا نے اردو زبان کی قدر و قیمت میں بغیر کسی تنگ نظری یا لسانی تعصب کے بہت اضافہ کیا۔ سچل سرمست کی خدمات تو اپنی جگہ پر ہیں دورِ جدید میں بھی اس کی اپنی ایک تاریخ ہے اس رائے سے ہمیں اتفاق کرنا چاہیے کہ:

'دورِ جدید کے سندھی عالموں، ادیبوں اور شاعروں نے اردو زبان میں بہت سا ادبی و علمی کام کیا ہے اور اردو کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا' ۸۰

نسیم امروہوی نے سندھی زبان کے ایسے شعرا کو ہمیشہ اہمیت کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ چاہتے تھے کہ سندھی شعرا اردو میں بھی لکھیں اور اردو شعرا سندھی زبان کو بھی اختیار کریں ان کا اخبار 'مراد' اسی روایت اور اسی تحریک کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے 'کلیاتِ ناز' کے مقدمے میں نسیم نے میر علی نواز ناز کی اردو شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے ان کے سماجی رشتوں کا بھی

۷۸۔ (کراچی: مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ، جون ۱۹۸۰ء)، ص ۱۸۸

۷۹۔ (خیر پور میرس: ناشر ادارہ سہ روزہ 'مراد')

۸۰۔ سید غوث علی شاہ، اردو ادب پر سندھ کی ثقافت کے اثرات، مشمولہ، تخلیق، مجلّہ بزمِ ادب (کراچی: وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج، ۱۹۸۵ء)، ص ۹۷

اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

'کلیاتِ ناز' کے مقدمے میں نسیم لکھتے ہیں:

ناز مرحوم کی شاعری کا ایک اہم ترین پہلو یہ بھی ہے کہ آپ کی شاعری کا بیشتر حصہ آپ کی زندگی کے واقعات اور طبیعت کے رجحانات سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ اگر ایک طرف آپ نے مسندِ ریاست پر متمکن ہونے کے بعد اپنے حدود اختیار میں غریب اور پسماندہ ہاریوں اور مزدوروں کی تکالیف دور کرنے کے لیے سب سے پہلا یہ حکم نافذ کیا کہ بیگار لینے کی رسم جو یہاں ایک مدت سے رائج ہے اسے فی الفور قطعی طور پر بند کر دیا جائے اور مزارعین کی اصلاح و فلاح کے لیے امدادی انجمنیں قائم کی جائیں تو دوسری جانب اپنی غزلوں میں بھی جا بجا ایسے خیالات کا اظہار کیا جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ آپ تہہ دل سے انسانی مساوات اور تمام بنی نوع سے ہمدردی کے قائل تھے۔

شعر گوئی اور فقیرانہ طرزِ زندگی کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ میر صاحب کو بھی ان کی شاعرانہ فطرت نے فقیر منش بنا دیا تھا۔ چنانچہ آپ اختیاراتِ حکومت اور اصنافِ نعمت میسر ہونے کے باوجود ان لوازم سے مبرا تھے جو دنیا میں جہاں بانی کا جزو لاینفک سمجھے جاتے ہیں۔ مہمان نوازی اور غربا پروری آپ کے خمیر میں شامل تھی۔ آپ کا دربار امتیازاتِ شخصی سے پاک و صاف تھا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کو بار یابی کا موقع ملتا تھا۔ اور سب کے ساتھ آپ یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ کسانوں اور مزدور پیشہ لوگوں کا دکھ درد سنتے تھے۔ اور ان کی امداد کرتے تھے۔[۸۱]

کلیاتِ ناز کے مقدمے میں میر علی نواز ناز کی شاعری اور ان کی شخصیت پر اظہار کرتے ہوئے نسیم نے سندھی زبان کے ان اہلِ قلم حضرات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اردو سے بھی اپنا ادبی رشتہ قائم کیا۔ نسیم کا یہ مرغوب موضوع ہے وہ کیونکہ نوعمری ہی سے لغت نویس اور زبان کے مزاج اور اس کے سماجی تعلق کو پرکھنے والے ادیب رہے ہیں اس لیے سندھی اور اردو کے باہمی رشتے کو بھی بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ناز کی اردو شاعری کے تذکرے میں وہ لکھتے ہیں:

ہمارے بعض احباب کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک سندھی نژاد (ناز مرحوم) نے اردو

۸۱۔ (خیر پور میرس: ناشر ادارہ سہ روزہ 'مراد')، ص۹

شاعری کے ماحول سے کوسوں دور ہونے کے باوجود کس طرح اس زبان میں ایسا بہترین کلام کہہ لیا جو اردو کے مزاجدانوں کی نگاہ میں کسی پہلو سے محل نظر نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جبکہ امیر خسرو، ابوالفضل، فیضی، اقبال اور ان کے ایسے بہت سے ہندی نژادوں کی معتبر اور ٹکسالی فارسی کے بے شمار نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں جو فارسی کے اہل زبان نہ تھے...... حقیقت یہ ہے کہ فارسی اور اردو کی طرح سندھی اور اردو میں بھی نا قابل انکار حقائق کی بنا پر اصل ونسل کے اعتبار سے باہم جو رشتہ ہے، اس نے ان دونوں کے خط دخال میں اس قدر یکسانیت اور مماثلت پیدا کر دی ہے، جس کے پیش نظر ایک سندھی النسل ادیب میں اردو زبان کو اس کے لطیف نکات کے ساتھ برتنے کا سلیقہ پایا جانا اور نظم ونثرِ اردو میں استاوانہ کمال پیدا کر لینا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ناز کے علاوہ بھی ہم نے سندھ کے متعدد شاعروں کا اردو کلام دیکھا ہے جس کی زبان اور اسلوب بیان وہی ہے جو ان کے عہد میں برصغیر کے دوسرے شعرائے اردو کا تھا۔ مرزا قلیچ بیگ مرحوم (حیدرآباد) نے سندھی زبان کا شاعر ہونے کے باوجود اردو کے بھی بہترین اشعار کہے ہیں اور ڈرامے لکھے ہیں۔ ان سے بھی بہت پہلے شاہجہاں کے عہد میں عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی نے اردو کے بہت سے اشعار کہے ہیں جو سندھی ادبی بورڈ نے ان کے کلیات میں شائع کیے ہیں۔ اسی طرح مخدوم صوفی محمد معین بیراگی، سرفراز عباسی کلہوڑا اور سچل سرمست وغیرہ نے اردو میں کافی غزلیں کہی ہیں۔ جو بڑی حد تک ویسی ہی ہیں جیسے کہ ان کے ہم عصر شاعروں کی۔[۸۲]

فرہنگِ لطیف

نسیم کے دورِ آخر کے چند یادگار کاموں میں ادبی و مذہبی نوعیت کے تین کاموں کا تذکرہ ان سے متعلق مختلف تحریروں میں ملتا ہے:

۱۔ فرہنگِ لطیف کی تدوین

۲۔ سندھی زبان میں تفسیرِ قرآن

۸۲۔ (خیر پور میرس، ناشر ادارہ معنہ روزہ مراد)، ص ۳۰

۳۔ اصولِ دین کی وضاحتوں سے متعلق سندھی زبان میں مختصر کتابچے

جیسا کہ گذشتہ ابواب میں بھی اس کا تذکرہ آچکا ہے کہ نسیم کی بنیادی ادبی شخصیت کے تعارف میں ان کی لفظ شناسی اور لغت نویسی کو اولیت حاصل ہے۔ اردو اور علاقائی زبانوں کے بڑے شعرا کے فکر و خیال کو عوام الناس تک پہنچانے کے لیے ان کے نزدیک ایک بہت موثر ذریعہ یہ بھی ہے کہ ان کے الفاظ اور ان کی تراکیب کی ایک ایسی وضاحت اور تشریح کر دی جائے کہ شعر کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے جو رکاوٹیں حائل ہو رہی ہوں وہ دور ہو جائیں۔ لغت نویسی کے ساتھ ساتھ فرہنگ نویسی میں کسی ایک شاعر کے تمام کلام کے الفاظ اور اس کی بیشتر تراکیب کی وضاحت ان کے بڑے ادبی کارناموں کا ایک یادگار حصہ ہے۔ اقبال کے جملہ اردو اور فارسی کلام کی فرہنگ[۸۳] تو ہمارے سامنے ہے ہی۔ لیکن نظیر اکبرآبادی، انیس اور جوش کے لفظوں پر مشتمل مشترکہ فرہنگ بھی ان کے ادبی منصوبوں کا ایک حصہ تھا جسے وہ مکمل کر نہ سکے۔[۸۴]

اپنے عہد کے ایک جدید طرز کے مرثیہ نگار شاعر سید آل رضا کی تراکیب کو یکجا کر کے وہ ایک فرہنگ ترتیب دینا چاہتے تھے مگر یہ کام بھی آگے نہ بڑھ سکا۔[۸۵] یہ تو وہ شعرا ہیں اردو شاعری میں جن کا بڑا نام ہے۔ عربی، فارسی اور اردو پر نسیم کی مکمل گرفت سے یہ کام ان کے لیے مشکل ہوتے ہوئے بھی مشکل نہ تھے لیکن سندھی ادب سے ایک مسلسل ذہنی تعلق نے ان کی طبیعت کو اس بات پر مائل کیا کہ وہ اس زبان کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے تمام کلام کی فرہنگ تیار کریں۔ نسیم نے سندھ میں زندگی کا ایک طویل وقت گزارا۔ سندھی زبان کے شاعروں کی نفسیات اور ان کے درویشانہ طرزِ حیات پر ان کی نظر گہری تھی۔ ایسے ماحول میں عارفانہ شاعری کی اہمیت سے وہ بخوبی واقف تھے۔ بھٹائی کے کلام کی فرہنگ تیار کرنے میں بھی یہی فلسفہ پوشیدہ تھا کہ وہ یہاں کے سماج میں رہنے والوں کے لیے زندگی کے مطالعہ کو آسان تر بنانا چاہتے تھے۔

سندھی کے ایک ادیب کریم بخش خالد، نسیم سے اپنی ملاقات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

’پروگرام یہ طے ہوا تھا کہ فرہنگِ اقبال (فارسی) کی اشاعت کے بعد ’فرہنگِ لطیف‘ پر کام شروع کیا جائے گا۔ یہ ایک تاریخی اور یادگار نوعیت کا ادبی شاہکار ہوتا لیکن افسوس

۸۳۔ فرہنگِ اقبال (اردو)، مطبوعہ ۱۹۸۴ء فرہنگِ اقبال (فارسی)، مطبوعہ ۱۹۸۹ء (لاہور: اظہار سنز)

۸۴۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، منتشر سطریں، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ، فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۱۶۲

۸۵۔ نسیم امروہوی، سید آل رضا کی مرثیہ گوئی، ایضاً، ص ۲۴۵

کہ نسیم صاحب نے ایفائے عہدِ الست کو ترجیح دی اور ہم تہی دامن ہی رہ گئے'۔[۸۶]

البتہ نسیم کے چھوٹے صاحب زادے کا کہنا ہے کہ والد کی وفات کے بعد ان کی کئی نایاب تحریریں ہماری نظروں سے گزری ہیں جن میں فرہنگِ لطیف سے متعلق چند صفحات بھی تھے۔[۸۷]

سندھی میں تفسیرِ قرآن

نسیم کے بڑے صاحبزادے کا کہنا یہ ہے کہ:

'والد مرحوم اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ سندھ کے لوگ درویشانہ مزاج سے بہت قریب ہیں اور یہ چیز ان کی زندگی میں ایک سادہ طرزِ حیات کے پہلو ضرور اُجاگر کرے گی لیکن فقیرانہ روش اپنی جگہ پر، اور دین و مذہب کی اصل حقیقتوں کو سمجھنا ایک دوسری ضرورت اور اہمیت رکھتا ہے چنانچہ وہ یہ چاہتے تھے کہ سندھی میں تفسیرِ قرآن لکھ کر یہاں کے لوگوں کو علم و معرفت کی حقیقی تعلیم سے بھی آراستہ کیا جائے'۔[۸۸]

سندھی زبان میں قرآن کے تراجم کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے مولانا اعجاز الحق قدوسی نے ۸۸۳/۸۴ عیسوی میں لکھے جانے والے پہلے ترجمے کا ذکر کیا ہے۔[۸۹] ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی نے بزرگ بن شہریار کی کتاب 'عجائب الہند' کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

'منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمر ہباری کے زمانے میں (۱۰۵۰ء سے پہلے) قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ سندھی زبان میں ہوا'۔[۹۰]

نسیم سے متعلق جو تحریریں اور جو تذکرے ہمارے پیشِ نظر ہیں ان میں کچھ مقامات پر سندھی میں ان کے ترجمۂ قرآن کی کاوشوں کا بیان ملتا ہے۔ ترقی اردو بورڈ میں لغت نویسی کے کاموں سے فراغت اور اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد جدہ میں مقیم اپنے چھوٹے صاحبزادے کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

۸۶۔ نسیم امروہوی کے علمی و ادبی کارناموں پر ایک نظر، ایضاً، ص ۱۰۵

۸۷۔ ملاقات ۲۷ر فروری ۲۰۰۳ء کراچی

۸۸۔ ملاقات ۲۱ر اکتوبر ۲۰۰۴ء کراچی

۸۹۔ سندھ کی تاریخی کہانیاں (کراچی: تحریر پرنٹرز دریا آباد، طبع دوم ۱۹۸۸ء)، ص ۱۰۳

۹۰۔ سندھی ادب کی مختصر تاریخ، مترجم، حافظ خیر محمد اوحدی (جامشورو: انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی، اشاعت اول جولائی ۱۹۸۳ء)، ص ۲۴

'میرا پروگرام یہ ہے کہ کوٹ ڈی جی میں مقیم ہوں ۔ وہاں مرثیے ٹھیک کر رہا ہوں اور ساتھ ساتھ قرآن کا ترجمہ اردو اور سندھی میں کر رہا ہوں، دو ڈھائی برس میں تیار ہو گا۔'[۹۱]

نسیم کے کچھ عکسی خطوط ارمغانِ نسیم میں شائع ہوئے ہیں انہی خطوط میں سے ایک خط سکھر ڈویژن کے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹیٹر کے نام بھی ہے اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

'میں اردو اور سندھی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر لکھ رہا ہوں اور اسے شائع کرانے کے لیے اپنی محدود آمدنی سے بچا بچا کر کچھ رقم جمع کرتا رہتا ہوں۔'[۹۲]

کریم بخش خالد کا مشاہدہ یہ ہے کہ:

'میں دیکھتا تھا کہ وہ کس عرق ریزی سے مختلف لغات اور تفاسیر کے تقابلی مطالعے کے بعد ترجمے کا چناؤ کرتے تھے بعض اوقات یہ نشستیں دوسرے دن دو پہر تک بغیر کسی وقفے کے قائم رہتیں۔'[۹۳]

روزنامہ جنگ کراچی نے ان کی وفات پر اپنے اداریے میں لکھا کہ 'وہ کلامِ الٰہی کا سندھی زبان میں ترجمہ کر رہے تھے لیکن تین پارے مکمل کیے تھے کہ وہ رحلت فرما گئے'[۹۴] یہ ترجمہ و تفسیر ۱۹۸۳ء میں کراچی سے شائع ہو چکا ہے[۹۵] ان کی علمی و ادبی زندگی کی آخری تالیفات میں وہ کتابچے بھی شامل ہوں گے جو اصولِ دین سے متعلق سندھی زبان میں شائع ہوئے۔[۹۶]

نسیم کی وفات پر ان کے صاحبزادے نے جو شخصی مرثیہ لکھا اس کی ایک بیت یہ ہے ؎

۹۱۔ غیر مطبوعہ مکتوب بنام وسیم حیدر، مرقومہ ۱۳؍دسمبر ۱۹۷۹ء کراچی فوٹو اسٹیٹ نقل بشکریہ وسیم ابن نسیم، مقیم جدہ سعودی عرب

۹۲۔ مکتوب بنام سید فہیم حیدر، مرقومہ ۲۰؍دسمبر ۱۹۸۲ء کوٹ ڈیجی، مشمولہ ارمغانِ نسیم، (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۳۵۴

۹۳۔ نسیم امروہوی کے علمی و ادبی کارناموں پر ایک نظر، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ پاکستان، فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۱۰۴

۹۴۔ اشاعت ۲؍مارچ ۱۹۸۷ء، ص ۲

۹۵۔ قرآن مجید پارہ عم معہ سورہ حمد اردو اور سندھی (کراچی: انجمن پریس، ۱۹۸۳ء)

۹۶۔ دینیات جو پھریون کتاب (خیر پور میرس: مہران بک سینٹر شاہی بازار، ۱۹۸۴ء)

فارسی اور عربی میں بھی مہارت تھی کمال
ہر نفس دل میں تھا سندھی کی ترقی کا خیال [۹۷]

سندھ کی مظلوم عورتوں اور حقدار بستیوں کے حقوق

سندھ میں رہتے ہوئے سندھی زبان کی ادبی وعلمی ترقی ہی نسیم کا کوئی پہلا اور آخری ہدف نہیں تھا اور محض یہ بھی نہیں کہ وہ سچل سرمست، شاہ لطیف، میر علی نواز ناز یا سندھی زبان کے دوسرے اہلِ قلم یا سندھی ترجمہ وتفسیر ہی پر اپنی تمام تر توجہ رکھتے رہے۔ ان کی پوری زندگی اس بات کا ایک واضح اظہار ہے کہ وہ اپنے سماجی رشتوں اور عوام الناس سے ذہنی طور پر ہی نہیں جسمانی طور پر بھی کبھی الگ نہیں رہے یعنی اپنے سماج کی ترقی اور اس کی دیکھ بھال میں ان کی دوڑ دھوپ کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ارمغانِ نسیم کے مرتب نے لکھا ہے کہ سندھ کی غریب اور حقدار بستیوں کے رہنے والوں میں وہ اکثر زکوٰۃ اور خمس کی رقمیں تقسیم کرنے جایا کرتے تھے۔ [۹۸] سندھی معاشرے میں عورتوں کے حقوق کی پامالی کو انہوں نے شدت سے محسوس کیا۔ سندھی زبان وادب کے دانشور ڈاکٹر ایاز قادری لکھتے ہیں:

> 'سندھی معاشرہ جاگیردارانہ قدامت پرستی کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ معاشرہ تب تک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتا جب تک اس معاشرے میں عورت کو عزت اور احترام حاصل نہیں ہوگا یقیناً آج اسے وہ مقام حاصل نہیں جس کی وہ مستحق ہے۔' [۹۹]

سندھی زبان میں تفاسیرِ قرآن پر مشتمل نسیم کی تحریروں میں عورتوں کے حقوق کا بہت واضح ذکر ملتا ہے۔ ڈاکٹر عقیل رضوی نے لکھا ہے کہ نسیم ہمارے عہد کے وہ واحد مرثیہ نگار شاعر ہیں جنہوں نے اس عہد میں عورتوں کے حوالے سے اپنے مرثیوں میں زندگی کے بہت سے پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ [۱۰۰]

۹۷۔ قسیم ابن نسیم، شخصی مرثیہ، شاعری خون میں رچ بس کے ورق تک پہنچی، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن سادات امروہہ پاکستان، فروری ۱۹۹۴ء)، ص ۱۷۵

۹۸۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، سوانحی خاکہ، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ پاکستان، ۱۹۹۴ء)، ص ۵

۹۹۔ پاکستانی معاشرہ اور سندھی ادب، مشمولہ پاکستانی معاشرہ اور ادب، مرتبین ڈاکٹر حسین محمد جعفری، احمد سلیم (کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی یونیورسٹی)، ص ۱۷۰

۱۰۰۔ مرثیے کی سماجیات (دہلی: خواجہ پریس جامع مسجد، ۱۹۹۳ء)، ص ۸۱

چھٹا باب

اقبالیات کا مطالعہ

- اسلامی اقدار کی ترویج میں فکرِ اقبال سے استفادہ
- ملّتِ اسلامیہ کا خاکہ
- نسیم اور اقبال کی فکری مماثلتیں
- اقبال شناسی میں نسیم کا ذہنی سفر
- اردو زبان کے اسالیبِ بیان کی توسیع میں اقبال کا حصہ
- نظم خطاب بہ اقبال
- اقبالیات کے مطالعے کی بنیادی کڑی، فرہنگِ اقبال
- فرہنگِ اقبال اردو
- فرہنگِ اقبال فارسی

چھٹا باب

اقبالیات کا مطالعہ

بیسویں صدی کے شعر وادب پر علامہ اقبال کے اثرات ایک بہت اہم موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے طرزِ فکر اور ان کے مفکرانہ ذہن نے پورے عہد کو متاثر کیا ہے۔ان کی سوچ اور ان کے افکار و خیالات ایک ایسی اہمیت اختیار کر گئے ہیں کہ اقبالیات کو خود ایک علیحدہ موضوع کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

ہماری تاریخ کے بعض بڑے شاعر، ادیب اور دانشور اقبال کی فکر سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔نسیم امروہوی کا شمار بھی ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے اقبال پاکستان کے نظریاتی بانی ہیں۔نسیم صاحب کی اقبالیات سے دلچسپی کا ایک سبب تو یہی تھا۔چنانچہ وہ اُن کے پیغام اور اُس کی تاثیر کو اس مملکت کے لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

فکری حوالے سے ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ نسیم کی شعری دنیا کا ایک بڑا حصہ صنفِ مرثیہ سے وابستہ رہا اور مرثیہ بھی وہ جس میں جدید اسلامی دور کی مختلف تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔جس میں اصولِ حیات اور کردار و گفتار سے لے کر اسلامی سماج تک کے موجودہ تقاضے ایک بڑے موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں اردو شاعری میں اقبال اسی موضوع کی سب سے بڑی آواز ہیں۔نسیم کی مرثیہ گوئی پر لکھتے ہوئے پروفیسر سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ’مرثیے کا یہ لہجہ معلمانہ اور خطیبانہ ہے اور اس لہجے کا محرک اہلِ وطن کی اصلاح کا جذبہ ہے۔اصلاح کے اس احساس کو شاعر نے وہی صورت دی ہے جس کا اظہار حالی کے مسدس اور اقبال کے شکوہ و جوابِ شکوہ میں بڑے دلنشین شاعرانہ انداز میں ہوا ہے۔نسیم

نے اپنے خیال کے اظہار کے لیے جو پیرایہ اختیار کیا ہے اس میں صاف حالی اور اقبال کی گونج سنائی دیتی ہے۔'[۱]

اسلامی اقدار کی ترویج میں فکرِ اقبال سے استفادہ

۱۹۲۳ء میں نسیم نے اپنی شعری زندگی کی پہلی طویل نظم 'گلِ خوش رنگ' کے عنوان سے لکھی[۲] جسے بعد میں انہوں نے اپنے پہلے مرثیے کا چہرہ بنالیا۔ اس مرثیے کا موضوع ہی مسلمانوں میں اسلامی اقدار کی تباہی اور ان سے دوری کا ہے اور اس سلسلے میں نسیم جس شاعر کی فکر سے سب سے زیادہ متاثر ہوکر آگے بڑھے ہیں وہ اقبال ہیں۔

۱۹۲۳ء میں نسیم کا شمار نئی نسل کے نوخیز شاعروں میں کیا جاتا تھا۔ اس وقت اقبال اپنی شاعری کے ارتقائی دور سے گزر رہے تھے۔ اور فارسی مجموعہ 'پیامِ مشرق' شائع ہوگیا تھا۔[۳] نسیم کے ذہنی پس منظر میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کی تعلیم و تربیت بھی تھی۔ وہ اقبال کی فکر کو ان کے اردو کلام سے بھی سمجھ رہے تھے اور فارسی کلام سے بھی۔ بیسویں صدی کے اس تیسرے عشرے میں نئے ذہن کا شاید ہی کوئی نوجوان شاعر ہو جو اقبال کی فکر کے اثرات قبول نہ کررہا ہو۔ ان اثرات میں سب سے پہلا اثر اپنے شاندار ماضی کو یاد کر کے نئی سماجی تبدیلیوں کو پیشِ نظر رکھ کر بیداری کا پیغام دینا تھا۔ عبدالرؤف عروج اس ذیل میں لکھتے ہیں:

'نسیم امروہوی نے معاشرے کی اصلاح اور نوجوانوں کی ذہنی اور فکری تربیت پر زور دیا۔ ان کے نزدیک جب تک فکر میں تبدیلی پیدا نہ کی جائے، لوگوں کے غور وفکر کا انداز نہ بدلا جائے کسی ترقی پذیر معاشرے کا پیدا ہونا اور صحت مند انقلاب کا آنا ممکن نہیں۔ ان کے یہاں جدیدیت کا تصور انارکی، انتشار، تخریب اور بربادی نہیں، یہ پرانی بنیادوں پر، نئی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی جدیدیت تاریخی، تہذیبی اور سماجی قدروں سے ابھرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرثیوں سے ہمارے ذہن میں وہ باتیں تصویروں کی طرح ابھرنے لگتی ہیں جن کا تعلق ہمارے شاندار ماضی سے ہے۔ ہمارا ماضی

۱۔ نسیم امروہوی کی مرثیہ گوئی، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ پاکستان، مطبوعہ ۱۹۷۴ء) ص ص ۵۴، ۵۵

۲۔ عظیم امروہوی، مرثیہ نگارانِ امروہہ (کراچی: الاتحاد کمیٹی کورنگی ۱۹۸۴ء) ص ۵۰۱

۳۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، سرگزشتِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء) ص ۱۴۸

ہمیں کہیں مستقبل کی روشنی دکھا تا ہے اور کہیں اس کے سہارے ہم حال کی ارتقائی منزلیں طے کرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری، عمل اور تحریکِ عمل کی شاعری بن گئی۔'[۴]

عمل اور تحریکِ عمل کی اس شاعری میں نسیم کا ذہنی رشتہ سب سے زیادہ علامہ اقبال سے رہا۔ مسدس کی فارم اور اس کے بیانیہ طرزِ اظہار میں وہ یقیناً انیس سے متاثر ہوئے لیکن جہاں عمل، تحریک عمل اور ایک اسلامی سماج کی تصویر ان کے یہاں اُبھرتی ہے وہ اقبال کے اثرات میں آ جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے شعرا میں وہ سب سے زیادہ اقبال سے قریب نظر آتے ہیں اور ان کی فکر سے براہِ راست اثر قبول کرتے ہیں اس لیے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال اسلامی سماج کے لیے نجات دہندہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

اقبال کو ایک مصلح قرار دادیتے ہوئے ڈاکٹر علی شریعتی کا طرزِ فکر یہ ہے:

'ایک ایسا مصلح جو نہ صرف اسلامی معاشرے بلکہ تمام انسانی معاشرے اور خود اس معاشرے کی حالت پر جس میں وہ خود زندگی بسر کر رہا ہو غور وفکر کرنا اور اس کی نجات، بیداری اور آزادی کے لیے جدوجہد اور سعی و کوشش بروئے کار لانا ہے۔'[۵]

رئیس امروہوی لکھتے ہیں:

'نسیم امروہوی کی رثائی نظموں میں جہاں اصلاح وتجدید کے پہلو نمایاں ہوئے ہیں وہاں حالی اور اقبال کے اثرات گہرے ہیں۔'[۶]

نسیم امروہوی کے فکر وخیال پر اقبال کے اثرات کا جائزہ بدلتے ہوئے معاشرتی اقدار کے ساتھ ساتھ اور بامعنی ہوتا چلا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے نسیم کی فکر پر اقبال کے اثرات کا مزاج دوسرا ہے اور ۱۹۴۷ء کے بعد اس کی کیفیتیں دوسری ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ سر سید احمد خاںؔ اور حالیؔ کے ساتھ ساتھ اقبالؔ سے جہاں متاثر نظر آتے ہیں وہ اسی اصلاح وتجدید کا جذبہ ہے جس کا ذکر مندرجہ بالا اقتباس میں رئیس امروہوی نے کیا ہے۔ 'گلِ خوش رنگ' جو نسیم کی سب سے پہلی نظم اور نظرِ ثانی کے بعد نوعمر نسیم کا سب سے پہلا

۴۔ نسیم امرہوی کے مرثیے میں عمل اور تحریکِ عمل کے نئے پہلو، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ پاکستان، مطبوعہ ۱۹۷۴ء)، ص ۲۱۰

۵۔ ہم اور اقبال، مترجم ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی، مشمولہ، اقبال شناسی کے زاویے، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور: بزمِ اقبال، طبع اول مئی ۱۹۸۵ء)، ص ۳۴

۶۔ نسیم امروہوی شخص وشاعر مقدمہ مراثی نسیم جلد اول (کراچی: پاکستان ریڈرس گلڈ، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۰

مرثیہ کہا جائے گا۔اس کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں:

'سب سے پہلے چند بندوں میں موجودہ دور کے مسلمانوں کی زبوں حالی پر رنج وغم کا اظہار کیا گیا ہے۔مسلمانوں میں نہ طلبِ فن کی خواہش ہے نہ آرزوئے ہنر۔وہ کسبِ معیشت کی طرف سے غافل ہیں، ہر طرف بے عملی کا دور دورہ ہے اور مسلمانوں کو فاقہ مستی، کام سے زیادہ عزیز ہے، اور انہوں نے یہ بات قطعاً فراموش کردی ہے کہ کام ہی مسلمان کی میراث ہے اور یہ میراثِ ابراہیمؑ، نوحؑ اور کلیمؑ جیسے پیغمبروں سے گزر کر احمدِ مختار صلعم کے گھرانے کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہے، اور کام کی اس مسلسل اور متواتر میراث میں معماری، بخاری، زرہ سازی کے علاوہ ایندھن کی لکڑیاں چننے اور چکی پیسنے کی مشقتیں بھی شامل ہیں، اور ہم کہ جو اس مقدس ورثے کے وارث اور امین ہیں فقر و ناداری کی مملکت کے تاجدارِ بے ملک بنے محض اپنی عالی نسبی کے تصور میں مگن، زندگی کے شب و روز بسر کر رہے ہیں، مسلمانوں کی اس زبوں حالی کی طرف اشارہ کر کے شاعر نے انہیں عصرِ نو کے تقاضوں کی طرف متوجہ کیا ہے جو پکار پکار کر انسان کو دعوتِ عمل اور دعوت انقلاب دے رہے ہیں۔'[۷]

ملّتِ اسلامیہ کا خاکہ

ہم نے اپنے تیسرے باب 'تحریکِ پاکستان میں نسیم امروہوی کی قلمی خدمات اور ان کا سماجی پس منظر' میں ان کے ایک اہم مسدس 'برق و باراں' کا جائزہ لیا ہے۔۲۷۹ بندوں پر مشتمل یہ نظم جو ۱۹۴۰ء میں لکھی گئی تھی اس میں ملّتِ اسلامیہ کا ایک خاکہ اُبھرتا ہے۔تلاطمِ امواج، برقِ خرمن، نوید برشگال، بارانِ رحمت اور پاکستانِ رحمت کے عنوان سے اس طویل نظم کے پانچ حصے ہیں۔گلِ خوشرنگ (۱۹۲۳) کے بعد یہ نسیم کی دوسری بڑی نظم ہے جس میں فکرِ اقبال کے چراغ جگہ جگہ روشن ہیں۔پروفیسر وقار عظیم نے نسیم کی اس نظم پر اقبال کے فکری اثرات کا تذکرہ کیا ہے۔تیسرے باب میں اس ذیل میں کئی اہلِ قلم کی تحریروں سے ہم نے اقتباسات بھی دیئے ہیں اور نظم کے بند بھی نقل کیے ہیں۔اس لیے یہاں ان تمام باتوں کو دُھرانے سے گریز کرتے ہوئے یہ بات مختصراً کہی جارہی ہے کہ ۲۷۹ بندوں پر مشتمل یہ مسدس 'برق و باراں' نسیم کے مطالعۂ اقبال کے سلسلے کی

۷۔ نسیم امروہوی کی مرثیہ گوئی، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ پاکستان، مطبوعہ ۱۹۷۴ء) ص ۵۱

بہت اہم کڑی ہے۔

نسیم اور اقبال کی فکری مماثلتیں

جیسا کہ اس باب کی ابتدا میں ہم نے لکھا کہ نسیم نے اپنے مرثیے کو کیونکہ عہدِ جدید میں اسلامی سماج کے نئے تصورات کی بحثوں سے آراستہ کیا اس لیے اپنے موضوع کی نسبت سے وہ اقبال کی فکر سے قریب تر ہو گئے۔ انہیں یہ احساس ہے کہ اقبال کے افکار کو ان کے ہم نفسوں اور ہم نواؤں نے نہیں سمجھا۔ اقبال پر انہوں نے جو نظم لکھی ہے اس کے ایک شعر میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔

ترے ہم نفس نہ پہنچے ترے شعلۂ نفس تک
ترے ہم نوا نہ سمجھے، تری زمزمہ نوازی ۸

نسیم امروہوی نے اپنے پورے شعری سفر میں جہاں جہاں اقبال سے استفادہ کیا اور اپنی سوچ سے اس میں ایک نیا راستہ پیدا کیا وہ تمام خیالات انہیں ذہنی طور پر اقبال سے نزدیک لے آتے ہیں۔ نسیم کی تمام نظموں، غزلوں، قطعات و رباعیات خصوصاً ان کے تمام مرثیوں کو اگر چھانا جائے تو ہمیں جگہ جگہ اقبال کے افکار و خیالات ایک نئے پیرائے میں نظر آئیں گے یہ رنگ و آہنگ تو نسیم کے یہاں ان کے شعری سفر کے آغاز ہی سے ملے گا۔ ان کی پہلی نظم 'گلِ خوش رنگ' کا اس سلسلے میں ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں لیکن خصوصاً ۱۹۴۷ء کے بعد جب پاکستان کی صورت میں ایک نئی مملکت وجود میں آئی تو نسیم نے یہاں کے رہنے والوں کی زندگی کے لیے ایک لائحہ عمل اپنی شاعری میں ترتیب دیا جہاں جگہ جگہ اقبال کی فکر سے انہوں نے نئے چراغ روشن کیے جن کی روشنی میں وہ اہلِ وطن کو لانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> 'پاکستان علامہ اقبال کے خواب کی عملی تعبیر ہے اس لیے اگر پاکستان میں علامہ اقبال کے فکر و فن کی تفہیم و تشریح کے لیے دانشوروں، نقادوں اور فلاسفروں نے اپنی بہترین ذہنی صلاحیتیں اور ابلاغِ عامہ کے تمام ذرائع فکرِ اقبال کی ترویج میں اپنا کردار بطریقِ احسن ادا کرنے کے لیے سعی کناں ہیں تو یہ بات باعثِ تعجب نہیں' ۔۹

۸۔ خطاب بہ اقبال، مشمولہ معجزۂ فن، مجلّہ بحوالہ صد سالہ جشنِ ولادتِ اقبال (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ پاکستان، ۱۹۸۱)، ص ۱۷

۹۔ دیباچہ، اقبال شناسی کے زاویے، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور: بزمِ اقبال، طبع اول مئی ۱۹۸۵ء)، ص (ط)

فکرِ اقبال کی ترویج میں نسیم کا ادبی کردار بہت اہم ہے لیکن یہ بات ہمیں پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ وہ فکرِ اقبال کے محض کوئی وقتی مبلغ نہیں ہیں بلکہ یہ فکر خود ان کے علمی و ادبی ذہن کا ایک حصہ ہے۔ ان کی تقریباً ۶۵ رسال کی ادبی زندگی میں اس احساس اور اس طرزِ فکر کی بہت روشنی نظر آتی ہے جو اقبال کی شاعری اور ان کے خطبات سے پھوٹی۔ نسیم اور اقبال کی ذہنی مماثلتوں کے لاتعداد پہلو ہیں۔ ہم ان میں سے چند پہلوؤں کی یہاں نشاندہی کریں گے:

۱۔ اقبال کی شاعری میں پیغامِ قرآنی کے لاتعداد رنگ موجود ہیں۔ قرآنی آیات سے انہوں نے جس قدر استفادہ کیا ہے اس کی مثالیں اردو شاعری میں کسی دوسرے شاعر کے حوالے سے نہیں دی جاسکتیں۔ قاضی عمر ظریف کی رائے تو یہ ہے کہ:

'جب تک قرآن حکیم نگاہوں کے سامنے نہ ہو اقبال کا کلام کما حقہ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔'[۱۰]

اقبال کے بعد نسیم اس صدی کے دوسرے ادیب و شاعر ہیں جنہوں نے قرآنی آیات کو محورِ فکر بنایا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی تو ان کے بارے میں یہ تک کہتے ہیں کہ:

"نسیم امروہوی کے مرثیوں کی جان ہی اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ وہ قرآنی آیات سے حد درجہ استنباط کرتے ہیں۔"[۱۱]

۲۔ دنیا کی کسی بھی زبان کے کسی بھی بڑے شاعر کا ہم مطالعہ کریں۔ ہمیشہ یہ دیکھیں گے کہ اس کے فکر و خیال کا محور انسان اور اس کی ذات ہے۔ اس نے کہیں فلسفیانہ حوالے سے کہیں محض ایک تبصرے کے طور پر یا کہیں محض ایک رائے کا اظہار کرتے ہوئے انسان کو ضرور اپنے خیال کا مرکز بنایا ہوگا۔ اگر میر تقی میر نے یہ طرزِ فکر اختیار کیا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

تو غالب نے اس لہجے میں بات کی۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

۱۰۔ اقبال قرآن کی روشنی میں (لاہور: کتاب منزل، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۵۸ء) ص ۵

۱۱۔ نسیم امروہوی، تعقل پسند مرثیہ گو، مشمولہ، ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ پاکستان، ۱۹۹۴ء)، ص ۸۲

اقبال اس اعتبار سے ہماری زبان کے پہلے شاعر ہیں کہ ان کی شاعری میں انسان کے بارے میں ایک مربوط فکر پائی جاتی ہے۔ اسلامی افکار کو ذہن میں رکھا جائے تو اقبال کے پیغام میں ایک باقاعدہ نظامِ حیات ہمیں نظر آئے گا۔ مسلمانوں کو زندگی گزارنے کی اعلیٰ اقدار سے انہوں نے روشناس کیا اور کئی ایسے تصورات جو محض ہماری نادانی اور کم علمی کی وجہ سے ہمیں بھٹکاتے رہتے ہیں اقبال نے اس کی حقیقتوں پر سے پردہ اُٹھایا مثلاً تقدیر، کیا ہے؟ کیا انسان کی تقدیر لکھ دی گئی ہے یا انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔ نسیم امروہوی نے اپنی نظموں میں ان پہلوؤں پر بھی بہت روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مرثیوں کے چہروں میں بھی انسان کی تقدیر سے بحث کی گئی ہے جس میں قرآنی آیات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور بہت علمی بنیادوں پر وہ اس موضوع کو آگے لے کر چلے ہیں۔ ان کی ایک مختصر نظم 'انسان' کا یہ شعر دیکھیے ؎

صبحیں ہیں تیری صبحیں، شامیں ہیں تیری شامیں
جب تیرے ہاتھ میں ہے تقدیر کی لگامیں

تقدیر کی لگامیں اپنے ہاتھ میں ہونا اس نکتے کی تشریح ہے کہ دنیا ویسی ہی بنے گی جو انسان بنانا چاہے گا۔ یعنی انسان کا جذبۂ تعمیر ہی اسے بلندیوں کی طرف لے کر چلے گا۔ تقدیر کے بارے میں غلط فہمی پر مبنی فرسودہ مذہبی تصورات نے ہی مسلمانوں کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔ نسیم ان زنجیروں کو توڑ دینا چاہتے ہیں۔ اقبال نے اپنی پوری شاعری میں تقدیر کو جو معنی پہنائے ہیں نسیم نے اسی فکر سے اپنی راہ نکالی ہے۔

۳۔ اقبال نے اپنی شاعری کی بنیادیں جن افکار پر اُٹھائی ہیں ان میں فلسفۂ عشق اور فلسفۂ عقل کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ نسیم امروہوی نے اپنے ایک مرثیے کے چہرے میں اسی فلسفۂ عقل و عشق کو بنیاد بنایا۔

اقبال کی شاعری میں عشق کا جو فلسفہ ہے اور اس سے جو مفہوم اخذ کیے جاسکتے ہیں اس پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

'بے شمار اشعار میں اقبال نے رومی کی طرح عشق ہی کو آدم کی حقیقی خودی کا جوہر قرار دیا ہے۔ عشق خلاقی اور ربوبیت سے بہرہ اندوزی ہے۔ خلاقی نت نئی آفرینش اور ربوبیت، ارتقائے حسن و جمال اور قوت و جلال کی ضامن ہے۔ انسان کا کام بنی بنائی دنیا میں محض حصولِ بقائے جسمانی کے لیے ماحول سے موافقت پیدا کرنا نہیں بلکہ اپنے اندر سے نادر عوالم کی تخلیق ہے۔ انسان جب زندگی میں محض تکرار و تواتر و جمود دیکھتا ہے تو اس کی

فطرت بیزار و پریشان ہو جاتی ہے۔ کسی ایک حالت پر قائم ہو جانا ہی موت ہے، خواہ وہ حالت کیسی متوازن کیوں نہ ہو۔ ہر موجودہ توازن کو متزلزل کر کے اعلیٰ تر سطح پر جدید توازن قائم کرنا عشق ہی کا کام ہے۔ عقل محض بنی بنائی دنیا کا مطالعہ ہے۔[۱۲]

نسیم کے مرثیے کی فلسفیانہ بنیادوں پر لکھتے ہوئے پروفیسر طاہر حسین نے اپنے تجزیے میں یہ بات کہی ہے کہ:

'مشاہیر شعرا میں بعض عشق کو اساس سمجھتے ہیں اور بعض عقل کو، نسیم امروہوی کا یہ نظریہ ہے کہ دونوں تنہا اساس بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔'[۱۳]

نسیم نے اپنے ایک مرثیے میں 'انسان' کو موضوع بناتے ہوئے عظمتِ انسان کو ہر حقیقت اور ہر صداقت سے برتر قرار دیا ہے۔

اسلام نے انسان کی جن بلندیوں کو بہت اہمیت دی ہے ان میں خود انسان کے عظیم ہونے کو نسیم بلند ترین کہتے ہیں اسی مرثیے میں انہوں نے فلسفۂ عقل و عشق پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مرثیے کا مطلع یہ ہے ؎

زیورِ شاہدِ اسلام ہے انساں ہونا[۱۴]

اس مرثیے کے چہرے سے یہ چند بند ملاحظہ کیجیے جس میں عقل و عشق کے حدود سے بحث کی گئی ہے۔ تنقیدی نظر سے دیکھا جائے تو نسیم نے ایک طرح اقبال ہی کی فکر کو اپنے لفظوں میں اور سلجھا کر پیش کر دیا ہے:

آدمی وہ نہیں دراصل جو ہو آدم زاد — عقل اور عشق ہیں انساں کی اساس و بنیاد
عقل سے پائے بشر معرفتِ حق کی مراد — عشق سے ذوقِ عبادت، خلشِ حقِ عباد
عقل سے فرقِ حقیقی و مجازی سیکھے
عشق سے بندگی و بندہ نوازی سیکھے

۱۲۔ اقبال کی شاعری میں عشق کا مفہوم، مشمولہ مطالعۂ اقبال، مرتبہ گوہر شاہی (لاہور: بزمِ اقبال کلب روڈ، طبع اول جون ۱۹۷۱ء)، ص ص ۱۷۴، ۱۷۵

۱۳۔ مراثی نسیم میں جدت پسندی کے رجحانات، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ پاکستان، ۱۹۷۴ء)، ص ۲۸۱

۱۴۔ نسیم امروہوی، مراثی نسیم، جلد دوم، (کراچی: پاکستان ریڈرس گلڈ، ۱۹۷۶ء) ص ۴۸

عقل کے پانو سے طے کر کے دو عالم کے طبق　　　عشق کے ہاتھ سے تحریر کرے دل کا ورق
عقل کی آنکھ سے کرتا ہوا نظارۂ حق　　　عشق کے کان سے رہ رہ کے سنے غم کا سبق
عقل سے ملکِ طلب فتح کرے مرد بنے
عشق کے فیض سے فیاض ہو ہمدرد بنے

عقل کے نور سے ہر سود و زیاں پر ہو نظر　　　عشق اُس سود و زیاں سے ہو بہت بالاتر
عقل تجدید و تجدد کی بنے راہ گزر　　　عشق قائم رہے ہر حال میں اک حالت پر
عقل ہو فکرِ بشر، فکر کی بنیاد ہو عشق
عقل حالات کی پابند ہو آزاد ہو عشق

عقل ہو مصحفِ تدبیر و تدبر کا ورق　　　عشق تلقینِ عقیدت کا دل افروز سبق
عقل جذبات میں ناحق کو نہ ٹھہرائے حق　　　عشق وجدانِ حقائق کا ہو ذوقِ مطلق
عقل کو جادۂ بینش میں پس و پیش نہ ہو
عشق ہو مُصلحِ کل مصلحت اندیش نہ ہو

عقل ہو فاتحِ ابواب رموز قدرت　　　عشق ہر باب سے ہو داخلِ قصرِ عظمت
عقل ہو دل کی گرہ عشق ہو دل کی بہجت　　　عقل ہو سعی و طلب عشق خمیر و فطرت
عقل کو نور ملے عشق کی تنویروں سے
عقل اقدار سے واقف ہو یہ تقدیروں سے

عقل جلوت بنظر عشق ہو خلوت بکنار　　　عقل ہو عینِ نظر، عشق نگاہِ سرشار
عقل ہو قافلۂ عشق کے جادے کا غبار　　　ناقۂ عشق کی ہو عقل کے ہاتھوں میں مہار
عشق بتلائے خطِ عقل کی پرکار ہے کون
عقل تجویز کرے عشق کا حقدار ہے کون

۴۔　نسیم کی نظموں اوران کے رثائی ادبیات کے کثیر حصوں میں اجتماعی طور پر قوم کے شعور کو بیدار کرنے کی تڑپ بہت دکھائی دیتی ہے۔ 'گل خوش رنگ' سے نسیم نے جب اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تو وہ اقبال سے اسی حوالے سے زیادہ متاثر تھے اور رفتہ رفتہ یہ ان کی فکر کا مرکزی دھارا بنتا گیا ان کے آخری دور کے جتنے مسدس ہیں ان میں قوم کے شعور کی سطح کو بلند کرنے کی ضرورت کا احساس بہت نظر آتا ہے۔ وہ قوم سے ناامید نہیں

ہوتے۔اس سے پہلے بھی گذشتہ ابواب میں ان کی فکر کے اس پہلو کا ذکر کیا گیا ہے کہ ناامیدی، افسردگی یا مایوسی ان کے کسی بھی خیال میں کہیں ظاہر نہیں ہوتی:

کروٹیں لیتی ہے ذہنوں میں ترقی کی امنگ — منزلِ تقدیر میں تدبیر کا جمتا ہے رنگ
کیا حیات آموز ہے صہبائے جرات کی ترنگ — ضرب سے نبضِ عمل کی بج رہا ہے طبلِ جنگ

زور و زر اس عزم کو مغلوب کر سکتے نہیں
قوم کے جذبات دب سکتے ہیں مر سکتے نہیں

تختِ شاہی مقصدِ تخلیق ہے جس کا نہ تاج — مختلف دنیا سے ہے جس کی سیاست کا مزاج
مضطرب ہے روح جس کی قتل وخوں ریزی سے آج — جس کے ذمہ ہے زمانے بھر کا روحانی علاج

یہ کفن دُزدانِ عالم کیا سنواریں گے اسے
اس کے جوہر خود جلا دے کر نکھاریں گے اسے

نسیم نے اپنے ایک مرثیے 'عہدِ رفتہ کی طرح گو منتشر اب ہم نہیں، میں اس فکر کو بہت اُجاگر کیا ہے۔ یہ دونوں بند اسی مرثیے کا حصہ ہیں۔ پہلی مرتبہ اس مرثیے کا چہرہ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا جس میں ۳۸ بند تھے [۱۵]۔ ان میں سے کئی بند پروفیسر طاہر حسین نے اپنے ایک مضمون میں نقل کیے جس میں مندرجہ بالا دونوں بند بھی شامل تھے اور ساتھ ساتھ اپنی یہ رائے بھی دی جس میں نسیم کو اقبالِ ثانی قرار دیا۔

پروفیسر طاہر حسین کے طویل مضمون کا ایک اقتباس یہ ہے:

'ان تمام بندوں میں اقبال کا آہنگ جاری وساری ہے۔ وہی تیور وہی انداز وہی جوشِ بیاں بلکہ بعض جگہ وہی الفاظ مثلاً 'کفن دز' غرض اس رنگ میں نسیم اس قدر کامیاب ہیں کہ انہیں اقبالِ ثانی کہا جائے تو بجا ہے۔' [۱۶]

اقبال شناسی میں نسیم کا ذہنی سفر

اقبال شناسی کے ذیل میں نسیم کے ذہنی سفر کے تین زاویے بہت اہمیت کے حامل ہیں جن کا اظہار ان کے ایک مضمون، ایک نظم اور اردو و فارسی پر مشتمل فرہنگِ اقبال کے مطالعہ سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ ذیل میں ہم

۱۵۔ مجلہ امروہہ (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ، نومبر ۱۹۶۶ء)، ص ۲ تا ۹

۱۶۔ مراثیِ نسیم میں جدت پسندی کے رجحانات، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ پاکستان، ۱۹۷۴ء)، ص ۲۹۲

ان کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

اردو زبان کے اسالیبِ بیان کی توسیع میں اقبال کا حصہ

اردو زبان کی نشو و نما اور اس کے قومی فروغ کے حوالے سے نسیم کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ پانچ سو الفاظ پر مشتمل ان کی ایک قلمی لغت کا تذکرہ ہم نے دوسرے باب میں کیا ہے جو ان کی طالب علمی کے زمانے کی ایک کاوش ہے اس وقت ان کی عمر صرف بیس سال تھی۔ اس طالب علمی کے زمانے سے دورِ آخر تک وہ اردو زبان کو ایک وسیع ترین زبان کا درجہ دینے کی کوششوں میں ہمیشہ شامل رہے بلکہ پیش پیش رہے۔ پاکستان میں ترقی اردو کے لیے ان کے اقدامات بہت اہم ہیں۔ قیام ملک کے بعد ان کی سب سے پہلی کتاب جو یہاں شائع ہوئی اس پر ناظمِ انجمن ترقی اردو خیر پور کے لفظ لکھے ہوئے ہیں۔[۱۷] نسیم اللغات کے متعلق ان کے ناشر نے یہ وضاحت کی ہے کہ 'اس میں وہ الفاظ بھی شامل کیے گئے ہیں جو آج تک کے تمام سیاسی اور معاشرتی انقلاب کے بعد اردو میں جگہ پاتے رہے اور خاص و عام کی زبان پر آتے رہے۔[۱۸] نسیم اللغات میں شامل الفاظ کا محققین نے ذکر کیا ہے۔ مضمون 'لاہور کی تہذیبی قدریں' میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔[۱۹] نسیم فارسی زبان کے ایک بڑے عالم تھے لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد انہیں اس بات کی زیادہ لگن رہی کہ اردو کو اولیت دی جانی چاہیے اور اسے ملکی سطح پر ہر جگہ رائج کرنا چاہیے۔ علاقائی زبانوں کی ترویج و اشاعت کو بھی انہوں نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اقبالیات کے مطالعے میں انہوں نے اقبال کی زبان ان کے بیان اور اس بیان کے اسالیب کو بہت خصوصیت کے ساتھ پیشِ نظر رکھا۔ ادب کے سماجی مطالعے میں نسیم نے زبان کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا اسی لیے اقبال کو پڑھتے ہوئے انہوں نے اردو زبان پر اقبال کے اثرات کا بھی بھرپور جائزہ لیا۔ ۱۹۶۲ء میں اقبال کی عام ادبی تحریروں اور ان کی شاعری کو اسی نقطۂ نظر سے اپنے مطالعے کا حصہ بنایا اور یہ جائزہ لینا چاہا کہ اردو کے اسالیبِ بیان کی توسیع میں اقبال کا کیا حصہ ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے اپنے ایک مقالے کا آغاز ہی اس فکر کے ساتھ کیا:

> 'اس میں شک نہیں کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی فکری، فلسفیانہ، تخلیقی اور تحقیقی عظمت اور ان کی رفعتِ تخیل اور ندرتِ مضامین کے بارے میں اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن

۱۷۔ نسیم امروہوی، نسیم اللغات (لاہور: کتاب منزل، پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵)، ٹائیٹل کا صفحہ

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر، تہذیب و تحقیق (لاہور: یونیورسل بک، ۱۹۸۵)، ص ۵

جہاں تک ان گراں قدر خدمات کا تعلق ہے جو انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اردو زبان اور اسالیبِ بیان کی توسیع کے سلسلے میں انجام دی ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ ابھی تک تشنۂ بیان ہیں بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ جب بھی لسانی نقطۂ نگاہ سے اقبال کی اردو شعر گوئی اور فن سے واقفیت کا ذکر آتا ہے تو ایک طبقے کی طرف سے ان کی اردو شاعری پر مذکورۂ بالا زاویۂ نگاہ سے طرح طرح کے شکوک وشبہات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ طبقہ محدود سہی، تاہم اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان حضرات کے خیال میں اقبال نے توسیع زبان کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کی۔ اس قسم کا اعتراض کرنے والوں کے نزدیک 'زبان' غالباً ان مفرد الفاظ کا نام ہے جن کے ایک مخصوص معنی لغت کی کتابوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ یا وہ الفاظ زبان کہلاتے ہیں جو انھوں نے برصغیر کے درباری شاعروں کے کلام میں دیکھے ہیں۔'[۲۰]

مندرجہ بالا اقتباس کی آخری سطر سے ہم یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ اس بات کی تردید کر رہے ہیں کہ الفاظ محض وہ نہیں ہوتے جو لغت کی کتاب میں لکھ دیے گئے یا برصغیر کے اُن شاعروں کے کلام کے الفاظ جو درباروں سے وابستہ رہے۔ یعنی نسیم ان لکھنے والوں کو اولیت دیتے ہیں جن کا تعلق دربار سے نہیں بلکہ عوام سے اور سماج سے قائم رہا ہے۔ اقبال ان کے نزدیک اسی لیے اہم شاعر ہیں کہ وہ اپنے گردوپیش سے رابطہ رکھتے ہیں۔ غالب اور اقبال کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

'دونوں کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فارسی زبان کے شاعر ہیں اور انھوں نے اردو میں جو کچھ کہا ہے اگرچہ وہ بالکل اچھوتی تخئیل ہے مگر زبان کے اعتبار سے محض تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب نے تو اپنے متعلق خود یہ غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ کہتے ہیں:

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

لیکن اردو میں غالب کے اس دانستہ اظہارِ عجز کے باوصف آج نہ صرف نظم میں بلکہ اردو نثر میں بھی غالب کو جو درجہ حاصل ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ بالکل یہی حال اقبال کا ہے کہ انھوں نے فارسی میں علم استادی بلند کرنے کے باوجود اردو کی

۲۰۔ نسیم امروہوی، اردو اسالیبِ بیان کی توسیع میں اقبال کا حصہ، مشمولہ اردو نامہ سہ ماہی، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۲ء، شمارہ ۷، ص ۱۴۱

نوک پلک سنوار کے، اسے فلسفیانہ روپ عطا کر کے، الفاظ کی تراکیب اور تشبیہات و استعارات نو بنو سے مالا مال کر کے 'تنگنائے غزل' کو 'بقدر شوق' وسعت دے کر اردو زبان کو بحر بیکراں بنانے میں جو خدمت انجام دی ہے اس کی مثال ان کے ہمعصروں میں نہیں ملتی۔'[۲۱]

نسیم صاحب اردو زبان کو وسعت دینے والے شعرا میں اقبال کو غالب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس کی وجوہات کا انہوں نے اظہار بھی کیا ہے جس میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ کیونکہ اقبال کے موضوعات وسیع ہیں اور وہ مناظرِ فطرت اور فلسفیانہ افکار سے لے کر اپنے قومی و سماجی معاملات تک آتے ہیں۔ چنانچہ ان کے الفاظ اور ان کے اسالیبِ بیان میں وسعتیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں جو باتیں کہتے ہیں ان میں سے ایک کا اقتباس یہ ہے:

'غالب کے بعد ان کے شاگرد حالی اور ذوق کے جانشین آزاد نے کرنل ھالرائڈ کے ایما پر اردو میں جدید مکتب شعر کی بنیاد ڈالی۔ جس کا وقت کے تمام شعرا پر اثر پڑا چنانچہ حالی کے بعد کے شعرا مثلاً اکبرالہ آبادی شوق قدوائی، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، اسمٰعیل میرٹھی، عزیز لکھنوی اور مولانا صفی وغیرہ سب نئے رنگ سخن سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اور ان کی زبان، اگلے زمانے کے شاعروں کی زبان سے کچھ نئی نئی سی محسوس ہوتی ہے۔ اقبال ان شعرا میں سب سے ممتاز ہیں کیونکہ وہ مشرقی و مغربی فکر کے جامع ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ہمہ رنگ شاعر بھی تھے۔ انہوں نے مناظرِ قدرت پر بے نظیر نظمیں کہنے کے علاوہ، قومی، سماجی اور فلسفیانہ موضوعات کو اپنا ہدف فکر بنایا اور اردو زبان میں ایک نئے مکتبِ تفکر یعنی 'فلسفۂ خودی' کے بانی ہوئے۔ یہ فلسفہ اپنے ساتھ بہت سے نئے الفاظ، نئے فقرے اور اسالیبِ بیان لے کر اردو زبان کی محفل میں آیا۔ اور بڑی دھوم دھام سے آیا۔ یہاں تک کہ محض اسی ایک خیال نے اردو زبان میں اتنے الفاظ اور اتنے فقروں کا ذخیرہ جمع کر دیا کہ جتنا کہ کسی اور تخئیل نے اس سے پہلے الفاظ و تراکیب اردو کی

۲۱۔ نسیم امروہوی، اردو اسالیبِ بیان کی توسیع میں اقبال کا حصہ، مشمولہ اردو نامہ سہ ماہی، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۲ء، شمارہ ۷، ص ۴۲

تاریخ میں شاید نہیں کیا تھا'۔[۲۲]

نسیم صاحب نے اقبال کے ایک ایک مصرع اور ایک ایک لفظ کو پڑھا ہے اور پرکھا ہے اور یہ تلاش کیا ہے کہ ان لفظوں سے اردو زبان کو کیا کیا وسعتیں ملی ہیں ان کی محنت اور ان کی تحقیقی جستجو کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 'بانگِ درا' کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے یہ کہا کہ صرف اسی ایک مجموعے میں کم از کم دو ہزار استعارے اور تشبیہیں ایسی ہیں جن سے اسالیبِ بیان کے بڑے نایاب موتی چنے گئے ہیں[۲۳]۔ ان کے نزدیک اقبال کے الفاظ ہماری زندگی اور ہمارے اطراف کی سماجی، فکری اور علمی دنیا کو سمجھنے کے لیے ایک انتہائی موثر ذریعہ ہیں:

> 'اقبال نے 'شاہین' کو بلند نظری، 'عقاب' کو فلک پیمائی، 'دراج' کو کمزوری، 'زجاج' کو نزاکت، 'سنگ' کو صلابت 'ضربت' کو قوت، 'نمود' کو اظہارِ خودی، 'زمان و مکاں' کو فلسفیانہ وقت اور جگہ کے بجائے عارفانہ منازل۔ 'جوہر' کو سیرت، 'آئینے' کو قلب اور 'کدو' کو نشانِ فقر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے یہاں 'مدرسہ، مکتب خانقاہ، فقر، روباہی، تقدیر، میشی، امت، ملوکیت، دین، لادینی، شرع، قرآن، مومن، کافر، تکبیر، اذاں، حجاز، عجم، حسین، یزید، ابراہیم، نمرود، اسماعیل، بولہبی، حیدری، ابوذری، قلندری اور ہوسنا کی، وغیرہ سیکڑوں اور ہزاروں الفاظ کو خاص خاص مطالب اور مفاہیم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جنھوں نے ان لفظوں کو نیا رتبہ، نیا زور نئی قوت اور نئی وسعت دے دی ہے۔'[۲۴]

نظم خطاب بہ اقبال

اقبالیات کے مطالعہ میں خود نسیم امروہوی کے ذہن کو سمجھنے کے لیے جہاں ان کی وہ نثری تحریریں اہم ہیں جن میں اقبال کی فکر اور ان کے فلسفے سے بحث کی گئی ہے۔ وہ اقتباسات بھی اہمیت رکھتے ہیں جو کسی اور موضوع پر لکھتے ہوئے اقبال سے متعلق بحث کا حصہ بن گئے ہیں۔ ان نثری حوالوں کے ساتھ ساتھ ان کی ایک نظم

۲۲۔ نسیم امروہوی، اردو اسالیبِ بیان کی توسیع میں اقبال کا حصہ، مشمولہ اردو نامہ سہ ماہی، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۲ء، شمارہ ۷، ص ۴۵

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۸

۲۴۔ ایضاً، ص ۵۰

'خطاب بہ اقبال' کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ نظم نسیم نے اقبال کی ولادت کے سو (۱۰۰) سال کی یادگار پر ۱۹۷۷ء میں لکھی تھی۔ چار سال بعد اس کی اشاعت ایک مجلّہ میں ہوئی [۲۵] جو اقبال کے فکر وفن سے منسوب تھا۔ یہ نایاب نظم جو ۲۲ اشعار پر مشتمل ہے۔[۲۶] جہاں اقبال شناسی کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے وہاں نسیم شناسی کا بھی یہ ایک اہم باب ہے۔ اس نظم کا اسلوب اور لہجہ بھی اقبال کے لہجے اور اسلوب سے اس قدر مماثلت رکھتا ہے کہ جہاں نسیم کے استادانہ کمال کی داد دینی پڑتی ہے وہاں ہر مصرع اور ہر شعر میں فکر کی جو روانی ہے وہ بھی لائق تحسین ہے۔ اقبال کے افکار کو سمجھنے کے لیے نسیم کے حوالے سے یہ نظم ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا ہر شعر ایک نئی تشریح لیے ہوئے ہے:

بعروج بام فطرت تری زمزمہ طرازی — جو خدا کی جاں نوازی تو خودی کی دل نوازی

کبھی اک نوائے ہندی ترا بذلۂ عراقی — کبھی اک سرود رومی ترا نغمۂ حجازی

ترا شوق والہانہ، ترا سوز دلبرانہ — ترا غزنوی تصور گہہ شیوۂ ایازی

ترے فلسفے سے ظاہر تری شاعری سے روشن — تری جہد خود فروزی، تری سعی خود فرازی

ترے نعرۂ خودی سے خجل و خفیف اب تک — وہی معرکوں کے ملا وہی مسجدوں کے غازی

تری نظم فارسی کے وہ مسائلِ تصوف — عجمی صراحیوں میں عربی شراب تازی

تری فکر پر کشا کا کوئی ولولہ تو دیکھے — وہ طیور پر شکستہ، بہ کمال شاہبازی

ترے جذبۂ نہاں کو کوئی کیا سمجھ سکے گا — ہمہ با خودی و بے خود ہمہ راز دار رازی

ترے عجز ظاہری میں ترے ناز باطنی میں — کبھی اک نیاز مندی کبھی ایک بے نیازی

ترے ہم نفس نہ پہنچے ترے شعلۂ نفس تک — ترے ہم نوا نہ سمجھے تری زمزمہ نوازی

ترے اہل صومعہ سے ترے اہلِ زاویہ سے — مجھے پوچھنا پڑے گا بہ امید کار سازی

ترے صومعے میں کب تک یہ حضور بے حضوری — ترے زاویے میں کب تک یہ نماز بے نمازی

غم این و آں میں تجکو غمِ عاشقی نہ بھولا — پئے دیگراں بہ سوزی پئے خویشتن بسازی

چہ وجود دلنشینی کہ بجان و دل مکینی — چہ نمود نازنینی کہ بہ خویشتن بہ نازی

نئی جستجو کی ضامن نئی آرزو کی حامل — تری جستجو پسندی تری آرزو نوازی

بخدا کہ لاکھ باطل نہ حریفِ معرکہ ہوں — جو شریک معرکہ ہو کوئی ایک مردِ غازی

۲۵۔ معجزۂ فن مجلّہ بحوالہ صد سالہ جشنِ ولادت اقبال (کراچی: انجمن سادات امروہہ پاکستان ۱۹۸۱ء)

۲۶۔ یہ نظم قلمی صورت میں بھی نسیم صاحب کے صاحبزادے قسیم ابن نسیم کے کتب خانے سے ملی ہے۔

ترا ثمرۂ طلب ہے ترا نعرۂ رجز ہے | یہ جو خاک ایشیا پر ہے جہاد ترک تازی
ترا پرتو تصور، ترا جلوۂ تخیل | یہ عجم کے آئینے میں جو ہے جوہر حجازی
جو بساطِ زندگی پر نئی فتح کا قرینہ | وہی بازیٔ طلب تو ہے جنوں کی شاہبازی
ترے سوز کا نتیجہ ترے ساز کا کرشمہ | تری محفلِ نوا میں مرا قصدِ نے نوازی
اسی کشمکش میں گزریں تری زندگی کی راتیں | 'کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی'

تجھے پیش کررہا ہوں ترا ارمغان یثرب
تری نذر کررہا ہوں ترا تحفۂ حجازی [۲۷]

اقبالیات کے مطالعے کی بنیادی کڑی، فرہنگِ اقبال

اقبالیات کے ذیل میں نسیم امروہوی کا سب سے اہم بلکہ یادگار کارنامہ اقبال کے تمام اردو اور فارسی کلام پر مشتمل فرہنگ کی تدوین و ترتیب ہے۔ فرہنگِ اقبال اردو ۱۹۸۴ء میں [۲۸] نسیم صاحب کی زندگی میں شائع ہوئی جبکہ فرہنگِ اقبال فارسی ان کی وفات کے دو برس بعد ۱۹۸۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔ [۲۹] اقبالیات کے حوالے سے نسیم کی خدمات کا سب سے اہم زاویہ اقبال کی زبان اور ان کے اسالیبِ بیان سے گہرا تعلق رکھتا

۲۷۔ نسیم امروہوی خطاب بہ اقبال، مشمولہ معجزۂ فن مجلہ بحوالہ صد سالہ جشنِ ولادتِ اقبال (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ پاکستان، ۱۹۸۱ء)، ص ۱۷

۲۸۔ بڑے سائز کے ۸۰۷ صفحات پر مشتمل یہ فرہنگ پہلی بار ۱۹۸۴ء میں اظہار سنز لاہور سے شائع ہوئی۔ نسیم امروہوی کے ہم عصر اور معروف شاعر رئیس امروہوی نے اس کا مقدمہ لکھا ہے۔ فرہنگ کے پہلے صفحے پر فرہنگ کے تعارف میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

'علامہ اقبال کے چاروں دواوین (بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز) باقیاتِ اقبال اور اخبارات و رسائل میں مطبوعہ کلام اور ان کی وضع کردہ نو بہ نو معنی خیز ترکیبات کا یکجائی، لغت، نیز کلام اقبال کی تلمیحات، استعارات اور متعلقہ اشخاص کا مکمل انسائیکلوپیڈیا یعنی فرہنگِ اقبال مع تحلیل صرفی و تاریخی حوالہ جات و شواہد و امثلہ از کلامِ اقبال'

۲۹۔ فرہنگِ اقبال فارسی بھی بڑے سائز کے ۹۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ فرہنگ بھی اظہار سنز لاہور نے شائع کی ہے۔ لغت و فرہنگ نویسی کے ذیل میں نسیم کی خدمات کے اعتراف میں ادبی شخصیات کی آرا ابتدائی دو صفحات میں محفوظ کی گئی ہیں۔ جن شخصیات کی یہ آرا ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جاوید اقبال، پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، میرزا ادیب، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، شان الحق حقی، وارث سرہندی، ڈاکٹر نواز علی بلوچ۔ صفحہ اول پر یہ وضاحت کردی گئی ہے کہ اس فرہنگ (جاری ہے)

ہے۔ زیرِ نظر باب کے گذشتہ صفحات میں ہم نے اس بارے میں بعض بنیادی باتوں کا تذکرہ کیا ہے اور یہ وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نسیم اقبال شناسی کے ذیل میں ان کی زبان اور اسالیبِ بیان کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام میں ان کے فلسفیانہ خیالات کے سبب کیونکہ پیچیدہ تراکیب اور ان کے الفاظ کے پیچھے کئی معنی پوشیدہ ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ قاری پہلے ان مشکلات کو آسانی سے حل کرے پھر وہ ان کی فکر اور ان کے فلسفے کو خود سمجھ لے گا۔ نسیم صاحب کا کہنا یہی ہے کہ 'اگر اقبالیات سے دلچسپی ہے تو مختصر المعانی یا مفول کا بغور دتعمق مطالعہ کر کے معانی و بلاغت کے اصول ذہن میں محفوظ کرلیں۔' [۳۰]

نسیم صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اقبال کسی مغربی فلسفے کو نہیں بلکہ قرآن حکیم کو اپنی فکر کی بنیاد بناتے ہیں اور اس کو سمجھنا اتنا آسان نہیں جب تک حدیث، تفسیر اور علم کلام سے آگہی نہ ہو اور کیونکہ اقبال کے ہر قاری کی یہاں تک پہنچ نہیں ہو سکتی اس لیے وہ یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ پہلے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے پھر اقبال کی فکر تک رسائی کا راستہ آسان تر ہو جائے گا۔ انہوں نے لکھا ہے وہ (نسیم صاحب) کیونکہ مشرقی علوم کا کچھ علم رکھتے تھے تو انہوں نے یہ چاہا کہ اس سے استفادہ کرتے ہوئے دوسروں کے لیے وہ اقبال شناسی کی راہیں کیوں نہ کھول دیں۔ ان کی تحریر سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> 'اقبال مغربی فلسفے کے اسرار و غوامض سے واقفیت تو رکھتے تھے مگر ان نظریات کے قائل نہیں تھے، جو نیٹشے اور ہیگل وغیرہ نے بیان کیے ہیں۔ ہم مسلمان ان کو 'حکیم الامت' کہتے ہیں۔ اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ قرآن حکیم کے فلسفے سے بحث کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس موضوع کے لیے حدیث، تفسیر، علم کلام، سیرت، تاریخ، معانی اور بیان غرض کہ جملہ مشرقی علوم کی مہارت ضروری ہے۔ جو شخص ان علوم پر نظر نہیں رکھتا وہ مرشد کی رہنمائی سے اقبال کا کلام 'من وجہٖ' سمجھ تو سکتا ہے مگر دوسروں کو سمجھانے یا اس کے متعلق بحث کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ [۳۱]

میں اقبال کے ساتوں فارسی دواوین، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، مثنوی پس چہ باید کرد اے، اقوامِ مشرق مع مسافر اور ارمغانِ حجاز کے علاوہ باقیاتِ اقبال اور اخبارات و رسائل میں جو ان کے فارسی اشعار محفوظ ہیں۔ یہ ان تمام الفاظ کی فرہنگ ہے۔ اس فرہنگ کا تفصیلی مقدمہ ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے۔

۳۰۔ فرہنگِ اقبال پر ایک مخصوص طبقے کے اعتراضات اور ان کے جوابات (لاہور: اظہار سنز، نومبر ۱۹۸۴ء) ص ۷

۳۱۔ ایضاً ص ۵

نامور ادبی شخصیت میرزا ادیب لکھتے ہیں کہ:

'فرہنگِ اقبال لکھ کر جناب نسیم امروہوی نے ان طالب علموں کی ایک بڑی مشکل دور کردی ہے جو اقبال فہمی کے باب میں اقبال سے متعلق بنیادی باتیں سمجھنا چاہتے ہیں۔'[۳۲]

ڈاکٹر عبید اللہ خاں کی رائے یہ ہے کہ اس فرہنگ سے:

'جہاں ہمیں اقبال کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور بہت سے ادق اور لاینحل مسائل کا حل ملتا ہے وہاں اس وسیلے سے ایک قاری بھی نسیم امروہوی مرحوم کی طرح اقبال شناسی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔'[۳۳]

فرہنگ اقبال اردو

نسیم، اقبال کے اسلوبِ شعر اور ان کے اسالیبِ بیان کو اردو زبان و ادب کی ترویج اور معاشرے میں اس کے فروغ کے سلسلے میں دوسرے شعرا کے اسلوبِ سخن کے مقابلے میں اولیت دیتے ہیں۔ اگر چہ خود ان کی شاعری میں انیس و دبیر کے اسلوب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ بقول مرتضیٰ حسین فاضل، نسیم کی شاعری میں انیس و دبیر کے اسلوب کی یکجائی نے خاص رنگ پیدا کیا ہے[۳۴] لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اقبال کے اسالیبِ بیان اور ان کے لفظوں میں پوشیدہ معانی کو فکر و خیال کی ایک نئی دنیا قرار دیتے ہیں۔

فرہنگ اقبال اردو، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ۱۹۸۴ء میں منظرِ عام پر آئی۔ بعض شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ترقی اردو بورڈ کے تحت اردو زبان کی سب سے بڑی اور اہم لغت کی ترتیب و تدوین کے دوران یکم ستمبر ۱۹۷۹ء کو وہ جب اپنے منصب سے ریٹائر ہوئے[۳۵] تو انہوں نے فرہنگِ اقبال کو تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ۱۹۸۰ء میں وہ لاہور منتقل ہو گئے اور اقبال کے اردو اور فارسی کلام پر اپنے کام کا

۳۲۔ حضرت نسیم امروہوی کا کارنامہ فرہنگِ اقبال، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ پاکستان ۱۹۹۴ء)، ص ۲۰

۳۳۔ نسیم امروہوی کی وفات پر مشاہیر علم و ادب کے تاثرات، مشمولہ بجھی وہ شمع، مرتبہ شبیہ الحسن (لاہور: اظہار سنز، جون ۱۹۸۷ء)، ص ۲۶

۳۴۔ تبصرہ مراثی نسیم، جلد اول، مشمولہ صحیفہ (سہ ماہی)، لاہور، ۳۲واں شمارہ، جولائی ۱۹۶۵ء، ص ۷۶

۳۵۔ خبر نامہ (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ، اکتوبر ۱۹۷۹ء)، ص ۸

آغاز کیا۔ ان دونوں فرہنگوں کے ناشر سید اظہار الحسن لکھتے ہیں:

"نسیم صاحب نے اردو الفاظ اور ان کی ترکیبات اٹھارہ لاکھ دفعہ سے زیادہ اپنے کلام میں استعمال کی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جناب نسیم صاحب نے ۱۹۲۳ء سے اب تک (یہ گفتگو ۱۹۸۰ء کی ہے) کم وبیش دوسو دس (۲۱۰) مرثیے تصنیف کیے۔ ان کے طویل اور مختصر مرثیوں میں بندوں کی تعداد کا اوسطاً شمار ۱۲۰ر بند فی مرثیہ ہوتا ہے اس طرح ان کے مرثیوں میں بندوں کی مجموعی تعداد پچیس ہزار بندوں سے زیادہ ہے یعنی انہوں نے تقریباً ۷۵ر ہزار اشعار یا یوں کہہ لیجیے کہ ڈیڑھ لاکھ مصرعے کہے۔ ہر مصرعہ میں سات لفظ فرض کر کے اگر ڈیڑھ لاکھ سے ضرب دی جائے تو حاصلِ ضرب ساڑھے دس لاکھ ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ نسیم صاحب نے دس لاکھ سے زیادہ الفاظ طرح طرح سے منفرداً اور مکرراً استعمال کیے۔ جہاں تک ان کی نثری تصنیفات و تالیفات کا تعلق ہے تو مراثی نسیم جلد دوم میں ان کی ۷۶ر کتابوں کی فہرست درج ہے اگر ان کے الفاظ شمار کیے جائیں تو آٹھ لاکھ سے کم نہ ہوں گے...... ان تفصیلات کی رو سے بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جناب نسیم نے اپنے کلامِ نظم ونثر میں اٹھارہ لاکھ سے زیادہ الفاظ استعمال کیے۔ ظاہر ہے کہ اقبال جیسے عظیم الشان شاعر کے کلام کی فرہنگ نگاری کے لیے نسیم صاحب سے بہتر مرتب ومؤلف کا ملنا مشکل ہوگا۔"[۳۶]

پاکستان میں جو ادیب لفظ شناسی میں مہارت رکھتے تھے ان میں نسیم کا نام صفِ اول کی فہرست میں آنا چاہیے۔ جوش ملیح آبادی جو خود الفاظ کے بادشاہ کہے جاتے ہیں یہ انہی کا قول ہے کہ 'میں لفظ پر نسیم امروہوی کی علمی گرفت کا معترف رہا ہوں'۔[۳۷] نسیم کی بنیادی شخصیت کیونکہ ایک شاعر کی شخصیت ہے اس لیے وہ لفظ کو جاننے اور پرکھنے کے بارے میں بھی شاعر کے احساس کو اولیت دیتے ہیں۔ اس ذیل میں ان کے کئی مضامین ہمارے پیش نظر ہیں جن میں سے لفظ 'جیسا' کے بارے میں[۳۸] اور دوسرا ترقی اردو بورڈ

۳۶۔ فرہنگِ اقبال 'پس منظر و پیش منظر' مشمولہ فرہنگِ اقبال فارسی (لاہور: اظہار سنز، اشاعتِ اول ۱۹۸۹ء)، ص ص ۲۰، ۲۱

۳۷۔ بحوالہ مکتوب بنام ہلال نقوی، مشمولہ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم (دہلی: انجمنِ ترقی اردو ۱۹۹۸ء)، ص ۱۷۲

۳۸۔ نسیم امروہوی 'جیسا'، مشمولہ اردو نامہ جولائی تا ستمبر ۱۹۶۱ء، ص ۴۶ تا ۵۱

کے تحت ترتیب پانے والی اردو کی سب سے بڑی لغت پر کی جانے والی تنقیدوں سے متعلق ان کا مضمون ۳۹
خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ صرف یہ نہیں دیکھتے کہ اقبال نے جو لفظ لکھا ہے یا ان کے یہاں جو ترکیب آتی ہے لغت کی رو سے اس کے کیا معنی ہوتے ہیں بلکہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اقبال نے کس ضرورت کے تحت اس لفظ کو لکھا ہے اور اس پس منظر میں اس کے کیا معنی ظاہر ہوتے ہیں۔ اس موقع پر رشید احمد صدیقی کی ایک تحریر سے یہ اقتباس ہماری بات کو اور واضح کر دیتا ہے:

'میر و انیس کے مقابلے میں آپ اقبال کی زبان کو شاید نا قابلِ التفات نہ سمجھیں لیکن یہاں زبان سے مراد صرف روزمرہ محاورہ اور اس قبیل کی باتیں نہیں ہیں بلکہ وہ زبان مدِ نظر ہے جو شاعر نے اپنے کلام میں مخصوص ضرورتوں کی بنا پر اختیار کی ہے۔' ۴۰

رشید احمد صدیقی کی اس رائے کو ہم اپنے لفظوں میں اس طرح آگے لے کر چل سکتے ہیں کہ اقبال نے ایک شاعر کے ذہن سے لفظ کو جس طرح فکر و خیال کا نیا لباس پہنایا ہے نسیم اسی کا اظہار چاہتے ہیں۔ رئیس امروہوی لکھتے ہیں:

'فرہنگ اقبال جنابِ نسیم کی تازہ ترین تالیف ہے، جس نے اقبال کو ایک منفرد الوجود اور فقید النظیر شاعر کی حیثیت سے سمجھنے اور ان کلاسیکی رجعت پسندوں کے منہ بند کرنے کا ایک نیا اور نامفتوح باب کھول دیا ہے، جو اقبال کو ایک مفکر، مصلح، متصوف اور فلسفی تو مانتے ہیں مگر ان کی شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف نہیں کرتے۔' ۴۱

فرہنگ نویسی میں نسیم نے اقبال کے شاعرانہ اسلوب کو مدِ نظر رکھ کر جس طرح الفاظ و تراکیب کی وضاحتیں کی ہیں اس میں ان کا یہ مقصد واضح طور پر جھلک رہا ہے کہ اقبال کے وہ اسلامی افکار جن میں آفاقی قدروں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے انہیں پڑھنے والوں کے ذہنوں تک پہنچا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ممکن تھا جب نسیم فرہنگِ اقبال کو محض لغت سمجھ کر ترتیب نہ دیں بلکہ اقبال کے خاص طرزِ فکر کو مکمل طور پر ذہن میں اُجاگر کر کے اقبال کے افکار و خیالات سے ہمیں آگاہ کریں اور وہ اس بات سے بہت بہتر طور پر خود بھی آگاہ تھے۔ اسی لیے اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

۳۹۔ نسیم امروہوی، نمونہ لغت کی تنقیدوں پر ایک نظر، اردو نامہ، (کراچی: ترقی اردو بورڈ، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۱ء)، ص ۸۷تا۹۵

۴۰۔ پیامِ اقبال، مرتبین م، ندیم (علیگ)، لطیف الزماں خاں (کراچی: میک برن ایجنسیز، اشاعت اول ۱۹۹۷)، ص ۸۰

۴۱۔ مقدمہ فرہنگِ اقبال اردو (لاہور: اظہار سنز، اشاعت اول ۱۹۸۴ء)، ص (د)

'الفاظ کی عام لغت لکھنا نسبتاً آسان کام ہے اس کے لیے دورِ سابقہ میں لکھی جانے والی لغات مثال میں رکھی جاسکتی ہیں لیکن کسی ایک شاعر اور وہ بھی اقبال جیسے عظیم شاعر کی لفظیات وتراکیب پر مشتمل فرہنگ ترتیب دینا چٹان کا سینہ چیرنے کے مترادف ہے، یہاں لفظوں کی ایک باڑھ ہے جو حدِ نظر تک کھنچی ہوتی ہے، تراکیب کی موج در موج روانیاں ہیں جو شاعر کے اپنے بحرِ فکر سے پیدا ہوتی ہیں ان کے پیچ وخم اور نشیب وفراز کو سمجھے بغیر اور ان میں اترے بغیر مفہوم کی حقیقت بے نقاب نہیں ہوسکتی۔'[۴۲]

ان تمام مرحلوں سے گزرنے میں نسیم نے صرف یہ نہیں کیا کہ اقبال کے مطبوعہ شعری مجموعے اپنے سامنے رکھے، اس میں سے تمام لفظ نکالے، ان کی فہرست بنائی اور الفاظ کے معنی لکھنے شروع کردیئے۔ وہ چاہتے تھے کہ اقبال کی فکر کے جملہ پہلو سامنے آجائیں اور یہ ان کے نزدیک اسی وقت ممکن تھا جب اقبال کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ پوشیدہ نہ رہے چنانچہ اس فرہنگ کو لکھنے میں ان کا تحقیق وتلاش کا یہ جذبہ بہت آگے رہا کہ وہ اقبال کو ان کے تمام تر کلام کی روشنی میں دریافت کریں فرہنگ اقبال کے مقدمہ نگار نے ایک جگہ اس کی وضاحت کی ہے:

'زیرنظر فرہنگ میں علامہ کے وہ تمام اشعار ومنظومات سے جو رسائل واخبارات میں ان کی حیاتِ مستعار کے دوران، ان کی مرضی سے شائع ہوئے تھے اور اب ان کے دواوین میں نظر نہیں آتے، یکجا کردیئے گئے ہیں، یہی نہیں بلکہ ان کے اصلی مآخذ (مع صفحہ و تاریخ) سے یا باقیات سے لے کر ان کے الفاظ وتراکیبات کے معنی ومطالب درج کیے گئے ہیں، ان کی وجۂ تصنیف بتائی گئی ہے اور ایسے اشارے بھی کیے گئے ہیں جن کی رو سے اقبال ایک عظیم المرتبت شاعر، بلکہ شاعر اعظم کی حیثیت سے صف شعرا میں ایک ممتاز اور بلند مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔'[۴۳]

اقبالیات کے مطالعے کی مختلف منزلوں میں ان پر لکھنے والوں نے یقیناً بڑے بڑے راستے طے کیے ہیں، کئی زاویوں سے ان پر کام ہوا، ان کے افکار کی تشریح میں کئی نئے گوشوں کی نشاندہی کی گئی لیکن نسیم صاحب نے ان کی تراکیب اور الفاظ کی تشریح میں منفرد راستہ اختیار کیا۔ اقبال کی بعض تراکیب اور

۴۲۔ مکتوب بنام ہلال نقوی، مشمولہ مقدمہ فرہنگِ اقبال فارسی (لاہور: اظہار سنز، اشاعتِ اول ۱۹۸۹ء)، ص ۱۱

۴۳۔ رئیس امروہوی، مقدمہ فرہنگِ اقبال اردو (لاہور: اظہار سنز، اشاعت اول ۱۹۸۴ء)، ص (د)

نظموں کے عنوانات کی وضاحت تو ان کی فکر کے پس منظر میں کی گئی لیکن جہاں ایک خالص لفظ آ گیا وہاں بھی اس کے سرسری معنی نہیں لکھے بلکہ اس کے تمام معانی بتانے کی کوشش کی گئی مثلاً ایک لفظ ہے 'زمانہ' کسی بھی لغت کو اٹھا لیجیے 'زمانہ' کے معنی دو تین لفظوں میں لغت نگار نے بیان کر دیئے ہوں گے مگر نسیم نے یہ کیا کہ اقبال نے جن جن مصرعوں یا شعروں میں زمانے کا لفظ لکھا ہے۔ اس کی تشریح، مصرع میں موجود مضمون کی روح کے مطابق کی اور وہ لفظ جس نظم سے لیا گیا اس کا عنوان، شعری مجموعہ اور صفحہ نمبر تک کی وہ تفصیل دیتے ہیں۔

فرہنگ اقبال سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

زمانہ (ف) مذکر

وقت، دن، روزگار ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

(پرندے کی فریاد، ب د، ۳۷)

دنیا ؎

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا

(حضور رسالتمآبؐ میں، ب د، ۱۹۷)

وقت و ماحول کے لوگ، لوگ ؎

زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

(تصویر درد، ب د، ۷۲)

ایک ادبی ماہ نامے کا نام جو اقبال کے زمانے میں کانپور (بھارت) سے پنڈت دیا نرائن نگم کے زیر ادارت شائع ہوتا تھا۔

(زمانہ کان پور، اپریل ۱۹۱۹ء، ب ا، ۲۲۱)

زمانۂ مرور خالص (Pure Duration) جو خارج میں نہیں پایا جاتا بلکہ انسان کی روح میں پوشیدہ ہے اور اسے صرف عادت کی نگاہ ہی دیکھ سکتی ہے۔ یہ مجرد عن المادّہ ایک حقیقت ہے۔ جو اسی طرح روح انسانی کے وجود سے پیدا ہوئی ہے جس طرح موتی

صدف سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی طرح یہ حقیقت روح انسان میں مخفی ہے جیسے موتی صدف میں پنہاں رہتا ہے۔ اگر اسے کوئی سمجھنا چاہے تو اپنی حقیقت کو اور اپنے نفس کو سمجھے پھر اسے بھی سمجھ لے گا۔ اقبال نے نظم کے عنوان میں جو لفظ 'زمانہ' لکھا ہے اس سے یہی معنی مراد ہیں۔

(زمانہ، ب ج، ۱۲۹)

ساری خدائی، سب دنیا والے۔

قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

(زمانہ، ب ج ۱۲۹)

یہ بال جبریل میں اقبال کی ایک نظم کا عنوان ہے، جس میں انہوں نے فلسفیانہ زاویۂ نگاہ سے اول زمانے کی حقیقت واضح کی ہے پھر موجودہ زمانے کی حالت پر سیاسی حیثیت سے تبصرہ کیا ہے اور ضمن میں بعض ایسی پیش گوئیاں بھی کی ہیں جو شاعر عالم وجدان میں کیا کرتا ہے اور سوفی صد درست نکلتی ہیں۔ اس نظم میں فلسفہ، سیاست، زندگی اور اس کے مضمرات اور انقلاب کا پیغام غرض کہ وہ سب کچھ ہے جس کی عصرِ حاضر میں ضرورت ہے۔[۴۴] (ب ج، ۱۲۹)

۸۷۰ صفحات پر مشتمل اس ضخیم فرہنگ میں اقبال کے ہزاروں الفاظ اور ان کی تراکیب شامل ہیں۔ اگر ہم یہاں اس کے حوالے دینا شروع کر دیں تو زیرِ بحث مضمون بہت طویل ہو جائے گا لیکن بہت اختصار سے چند حوالے دیے جا رہے ہیں تا کہ اقبال کی کسی ترکیب، یا نظم کے عنوان کی وضاحت میں نسیم کے اندازِ نظر کو بھی سمجھا جا سکے۔ اقبال کی تین نظموں، 'تصویرِ درد'، 'رخصت اے بزمِ جہاں' اور ہلال عید کی تشریح کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

تصویرِ درد: یہ بانگ درا میں اقبال کی ایک نظم کا عنوان ہے جو انہوں نے ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اقبال جغرافیائی بنیاد پر وطنیت کے قائل اور پکے وطن پرور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بڑے پُر درد لہجے میں غیر منقسم ہند کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاف پر نوحہ

۴۴۔ نسیم امروہوی، فرہنگِ اقبال اردو (لاہور: اظہار سنز، اشاعتِ اول ۱۹۸۴ء) ص (د)

خوانی کی ہے اور انہیں خبردار کیا ہے کہ اب بھی اگر تم متحد نہ ہوئے تو فنا ہو جاؤ گے۔

(ب د، ۶۸)

ابتداً یہ نظم ایک سو، تیس اشعار پر مشتمل تھی۔ بانگ درا میں اس کے انہتر شعر درج ہیں۔ باقی اکسٹھ شعر باقیاتِ اقبال میں 'مخزن' سے نقل کیے گئے ہیں۔ ایک شعر ایسا ہے جس کا پہلا مصرع بانگِ درا کی تدوین کے موقع پر علامہ نے بدل دیا ہے۔[۴۵]

رخصت اے بزم جہاں: یہ بانگ درا میں اقبال کی ایک نظم کا عنوان ہے جو ایمرسن کی ایک نظم سے ماخوذ ہے (ایمرسن کے تعارف کے لیے دیکھیے ایک پہاڑ اور گلہری) نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر انسان کائنات عالم کی حقیقت اور ان افعال کو جو کائنات کی مختلف چیزوں سے بغیر کسی ظاہری محرک اور فاعل کے ظہور میں آتے ہیں غور سے دیکھے اور سمجھے تو اس کی عقل یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اتنے بڑے کارخانے کا ایک خالق ضرور ہے۔ تخلیق عالم اور زندگی کا یہ بھید فلسفے سے نہیں بلکہ مطالعۂ فطرت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ (ب د، ۶۳)

اس عنوان سے جو نظم بانگِ درا میں شائع ہوئی ہے اس میں چھ شعر کم ہیں جو مخزن (مارچ ۱۹۰۴ء) میں چھپے تھے اور اب باقیات میں درج ہیں۔ (ب ا، ۳۱۵) [۴۶]

غرۂ شوال یا ہلال عید: یہ بانگ درا میں اقبال کی ایک نظم کا عنوان ہے اگرچہ بظاہر ان کا مخاطب ہلالِ عید ہے لیکن دراصل انہوں نے 'ہلال' کے پردے میں مسلم نوجوانوں سے یہ خطاب کیا ہے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جبکہ پوری قوم مصائب میں مبتلا تھی۔ ایران اور ترکی داخلی اور خارجی فتنوں کا شکار تھے۔ مسلمانوں کی آپس کی پھوٹ نے ہر اسلامی ملک کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا تھا اور ان مصائب کو دور کرنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی۔ چنانچہ علامہ نے اس نظم میں صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کو ان مصائب کے دفعیہ کا آخری علاج تجویز کیا ہے۔ نظم کی درد انگیز تاثیر کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ یہ نظم پڑھ کر اکبر الہ آبادی نے علامہ کو خط لکھا جس میں دو شعروں کی بہت

۴۵۔ نسیم امروہوی، فرہنگ اقبال اردو (لاہور: اظہار سنز اشاعت اول، ۱۹۸۴ء)، ص ۲۰۲

۴۶۔ ایضاً، ص ۳۹۲

تعریف کی ۔

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بت کدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ

اقبال کی اس نظم کو اگر وہ الہام قرار دیا جائے جو ہر پر خلوص شاعر پر ہوتا ہے تو یہ بات یقیناً حق بجانب ہوگی جس کا ثبوت یہ ہے کہ ترکوں نے 'خلافت کی قبا' ۱۹۲۴ء میں چاک کی، مگر اقبال نے اس نظم میں اس کی پیش گوئی کر دی تھی۔ (ب د، ۱۸۱)
یہ نظم مخزن (اکتوبر ۱۹۱۱ء) میں شائع ہوئی تھی۔ بانگ درا میں اس کے تین شعر حذف کر دیئے گئے جو صاحب باقیات نے درج کیے ہیں۔ (ب ا، ۳۶۳)[۴۷]

فرہنگ اقبال فارسی

اقبالیات کے حوالے سے نسیم کی فکر کا حاصل یہ رہا ہے کہ ان کے افکار کے ایک ایک پہلو اور ایک ایک زاویے سے پوری ملتِ اسلامیہ خصوصاً پاکستان کے رہنے والوں کو ضرور آگاہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ اقبال کے عام فارسی کلام کے بھی ایک ایک لفظ اور ایک ایک ترکیب کو اپنی فرہنگ میں شامل کیا اور دن رات اس کی ترتیب و تدوین میں مصروف رہے۔[۴۸] وراث سرہندی لکھتے ہیں:

'علامہ اقبال کی ادبی و ملی خدمات اور سیرت و کردار پر ایک مدت سے لکھا جا رہا ہے اور لکھنے والوں میں ملکی ہی نہیں غیر ملکی اہلِ قلم بھی شامل ہیں۔ یہ اقبال کا حق بھی ہے، کیونکہ اقبال نے اردو اور فارسی شعر و ادب میں ایک مجدد کا کردار ادا کیا ہے اور ان کی شاعری نے عالمی ادب بالخصوص اسلامی ادب پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اہلِ پاکستان کے لیے ان کی ادبی و ملی خدمات بدرجہ اولیٰ اہم اور لائق توجہ ہیں کیونکہ پاکستان کا قیام ان کی

۴۷۔ نسیم امروہوی، فرہنگ اقبال اردو (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۴ء)، ص ۵۷۰

۴۸۔ حیدرآباد دکن کے ایک شاعر باقر امانت فانی کے شعری مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۲؍ مارچ ۱۹۸۲ء کی ایک تحریر میں وہ لکھتے ہیں: 'لغاتِ اقبال (اردو، فارسی) کی تشکیل و تکمیل کے سلسلے میں ایک عرصے سے لاہور میں مقیم ہوں۔ دوسرے کسی موضوع پر توجہ دینے کی قطعی فرصت نہیں ملتی' (کراچی: گردِ اکبری، ستمبر ۱۹۸۲ء)، ص ۵۹

فکری اور عملی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے۔ ان کے افکار و خیالات، خواہ نظم کی صورت میں ہوں یا نثر کے پیکر میں ہمیشہ ہمارے لیے چشمۂ فیضان و ہدایت بنے رہیں گے۔ ایسی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ ان کے فکر و فن اور شخصیت کا ہر گوشہ اور ہر پہلو ہمارے سامنے ہو تا کہ ہماری موجودہ اور آئندہ نسلیں اقبال سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے۔ جب اقبال کی پہلو وار شخصیت اور افکار کے ہر پہلو اور زاویہ کو منضبط کر لیا جائے۔ اس میں شک نہیں اور یہ امر موجب اطمینان ہے کہ پاکستان کے اہلِ قلم نے اپنی اپنی بساط اور اپنے اپنے رجحان کے مطابق اس فریضہ کو انجام دینے کی پوری کوشش کی ہے۔ اب تک اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب اس سلسلے میں مزید گنجائش موجود نہیں ہے۔ مگر نکتہ طراز اور ژرف بین حضرات کوئی نہ کوئی ایسا پہلو تلاش کر لیتے ہیں جس پر کسی اور کی نگاہ نہ پڑی ہو اور کسی نے اس کی اہمیت محسوس نہ کی ہو مگر فی نفسہ اس کی اہمیت و افادیت میں کسی کو کلام نہ ہو۔ ایسی ہی نکتہ چینی کا ثبوت جناب نسیم امروہوی نے فرہنگ اقبال لکھ کر دیا ہے، فرہنگِ اقبال کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ واقعی اس کتاب کی ضرورت تھی اور یہ کتاب پہلے لکھی جانی چاہیے تھی۔'[۴۹]

یہ حقیقت ہے کہ اقبال کے افکار سے واقفیت کے لیے اردو کے ساتھ ساتھ ان کے فارسی کلام کو بھی پڑھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ مولانا گرامی کے نام ایک خط میں اقبال نے لکھا ہے:

'فارسی کی طرف زیادہ میلان ہوتا جاتا ہے اور وجہ یہ ہے کہ دل کا غبار اردو میں نہیں نکال سکتا۔'[۵۰]

مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کے فارسی زبان سے تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں:

'عربی شاعری فلسفہ و تصوف سے بالکل تہی دامن ہے اس لیے یورپ سے پلٹنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فلسفیانہ خیالات ادا کرنا چاہے تو انہوں نے اردو کو چھوڑ کر اس قسم کی شاعری کے لیے فارسی زبان اختیار کی۔'[۵۱]

۴۹۔ فرہنگِ اقبال پر ایک نظر، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ سادات امروہہ پاکستان، ۱۹۹۴)، ص ۱۱۰

۵۰۔ محمد عبداللہ قریشی، ردحِ مکاتیبِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اوّل، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۱۵

۵۱۔ اقبال کامل (مطبوعہ اعظم گڑھ، ۱۹۴۸ء)، ص ۱۶۲

پاکستان میں نسیم امروہوی کی شخصیت گنتی کے ان چند لوگوں میں شمار کی جاسکتی ہے جنہیں فارسی پر مکمل عبور حاصل تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اقبال کی وہ فارسی شاعری جس میں فلسفے کی مشکل منزلیں بھی آئی ہیں انہیں کبھی طے نہیں کر سکتے تھے۔ نسیم کی ۱۹۴۷ء سے پہلے کی جو تالیفات ہیں شرح مصباح فارسی[۵۲] شرح جواہر فارسی[۵۳] معیار الاشعار طوسی[۵۴]، تصحیح وتحشیہ تفسیر اصفی [۵۵] اور شرح دفتر ابوالفضل[۵۶] یہ کتابیں اور یہ تحریریں فارسی زبان ولسانیات سے ان کے گہرے شغف کا اظہار ہیں۔ نسیم صاحب کی وفات پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ان کے بارے میں ڈاکٹر حسین محمد جعفری لکھتے ہیں:

'آپ کہاں سے ایک ایسی ہستی لائیں گے جو بیک وقت ایک عظیم شاعر بھی ہو، ماہرِ لسانیات بھی ہو۔ ایک عظیم ترین لغت کا خالق بھی ہو، عربی وفارسی پر مکمل عبور رکھتا ہو، علوم اسلامیہ پر پوری طرح دسترس ہو، اور اردو کے نصاب میں بھی برصغیر میں اس کی لکھی ہوئی کتابیں انتہائی مستند اور مقبول ہوں۔ نسیم صاحب کو لوگ عام طریقے سے بحیثیت ایک مرثیہ نگار شاعر اور لغت کا عالم سمجھتے ہیں لیکن وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ میں نے ان کی جیسی جامعیت کے لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ مجھے ان سے بہت ہی قریبی تعلقات کا شرف ان کے قیام لکھنؤ کے زمانے سے حاصل ہے اور مجھ کو ان کے تبحّر علمی کا ذاتی علم ہے۔ میں نے ان کو فارسی کی مشکل ترین کتابیں دفتر ابوالفضل اور سہ نثر ظہوری اس طرح پڑھاتے دیکھا ہے جیسے وہ ساری زندگی انہیں کتابوں کو پڑھاتے رہے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے عنفوانِ شباب میں نوگانواں ساداتِ ضلع امروہہ کے ایک مدرسہ میں منطق وفلسفہ میں شمس بازغہ اور ملا صدرا جیسی کتابیں برسوں پڑھائی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن کے سمجھنے والے بھی شاید اب برصغیر میں مشکل ہی سے ملیں۔ عربی، فارسی اور علوم اسلامیہ پر ان کا یہ عبور تھا کہ لسانیات ولغت میں ان کو وہ قدرت حاصل ہوگئی جو بہت کم

۵۲۔ (الہ آباد، انوار احمدی پریس، سنہ اشاعت ندارد)

۵۳۔ (الہ آباد، انوار احمدی پریس، سنہ اشاعت ندارد)

۵۴۔ (الہ آباد، انوار احمدی پریس سنہ اشاعت ندارد)

۵۵۔ (امروہہ، نور المدارس امروہہ، سنہ اشاعت ندارد)

۵۶۔ (لاہور، ناشر جان محمد الٰہی بخش ۱۹۴۹ء)

حضرات کو ہو سکتی ہے۔[۵۷]

سندھی زبان کے محقق اور ماہرِ لسانیات پیر حسام الدین راشدی جنھوں نے پاکستان میں اردو کی سب سے بڑی لغت کی تیاری کے دوران نسیم صاحب کے ساتھ ایک طویل مدت تک کام کیا ہے وہ زبانوں پر ان کے عبور کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'مسودے میں جہاں فارسی کا غریب لفظ آیا انہوں نے بغیر لغت دیکھے اس کے معنی بتا دیئے جہاں کہیں عربی عبارت آئی صحت کا خیال رکھا، حدیث آئی تو بتا دی کہ کس کتاب سے لی گئی ہے۔ آیہ کریمہ آئی تو خود ہی لکھ دیا کہ فلاں سورہ میں فلاں نمبر آیت ہے، عربی کا مقالہ آیا تو بتا دیا۔ شعر یا عبارت میں کمزوری آئی تو نشاندہی کر دی۔'[۵۸]

کراچی یونیورسٹی میں سندھی شعبے کے سابق صدر ڈاکٹر نواز علی شوق بھی اس ذیل میں نسیم صاحب کے متعلق یہ رائے رکھتے ہیں:

'آج کل جدید فارسی کے ماہر بہت سے لوگ ملیں گے لیکن قدیم فارسی کے ماہر کا ملنا مشکل ہے۔ نسیم امروہوی مرحوم قدیم اور جدید دونوں کے بہت بڑے عالم تھے اور فارسی مخطوطات پڑھنے میں اپنی مثال آپ تھے، میرے محسن پیر حسام الدین راشدی مرحوم آپ کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔'[۵۹]

عہدِ حاضر کے ادبی دانشور اور عالم شخصیات کی درج بالا آرا سے ہمیں ایک اندازہ ہو جاتا ہے کہ نسیم صاحب کو فارسی زبان پر کس قدر عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی زندگی کے بڑے علمی و تحقیقی کاموں میں اقبال کی مکمل فکر سے عوام و خواص کو مطلع کرنے کے لیے یہ بیڑا اٹھایا اور اس کی ضرورت شاید وہ اس لیے بھی محسوس کرتے رہے کہ اب پاکستان میں فارسی زبان جاننے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ افراد ہی اس زبان سے ناواقف ہوتے جا رہے ہیں تو پھر دوسرے لوگوں کا ذکر ہی کیا۔ چنانچہ انہوں نے اقبال کے فارسی کلام کو بھی اردو میں آسان تر کر کے اس کی شرح و تفسیر لکھ کر اس سرزمین پر رہنے والوں تک اقبال کی فکر اور ان کے پیغام کو پہنچایا۔

فرہنگِ اقبال اردو کے ذکر میں ہم نے ان کی ایک تحریر کا وہ اقتباس دیا ہے جس میں انہوں نے یہ

۵۷۔ تعزیت نامہ نسیم، مطبوعہ کراچی، مارچ ۱۹۸۷ء ص ۱۷

۵۸۔ نسیم صاحب کو جیسا میں نے پایا، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمنِ سادات امروہہ ۱۹۷۴ء)، ص ۱۵

۵۹۔ تعزیت نامہ نسیم، مطبوعہ کراچی، مارچ ۱۹۸۷ء ص ۴۳

بات کہی ہے کہ اقبال کی اردو شاعری کے کسی ایک بھی شعر، مصرع، ترکیب یا لفظ کو انہوں نے نظر انداز نہیں کیا۔ اقبال کے فارسی شعروں سے متعلق فرہنگ کی تدوین میں بھی انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا بلکہ ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ فارسی کے وہ لفظ جو اقبال کے اردو کلام میں بھی آتے ہیں اور جن کی وضاحتیں وہ فرہنگ اقبال اردو میں کر چکے تھے انہوں نے یہ نہیں کیا کہ فرہنگ فارسی کے وقت انہیں شامل فرہنگ نہیں کیا یا وہی تفسیر لکھ دی جو وہ اردو میں لکھ چکے تھے انہوں نے فارسی کی اس فرہنگ میں اسے از سرِ نو لکھا اور اس پس منظر میں اس کی معنی لکھے جس میں وہ نظم یا شعر کہے گئے تھے۔ اس ذیل میں نسیم اپنے ایک خط میں وضاحت کرتے ہوئے یہ بات لکھتے ہیں:

> 'میں نے اس فرہنگ فارسی میں اقبال کی اردو شاعری کے دواوین سے بھی وہ تمام مصرعہ، شعر اور بند لیے ہیں جو فارسی میں ہیں۔ اس زمانے میں بہت سی کتابیں بھی مطالعہ میں آئیں۔ اقبال کے غیر مدون کلام کے دو مجموعے رختِ سفر (۱۹۵۲ء) مرتبہ انور حارث اور باقیاتِ اقبال (۱۹۵۲ء) مرتبہ سید عبدالواحد معینی، بھی دیکھے قاضی افضل حق قریشی کا مقالہ باقیات اقبال بھی نظر سے گزرا۔ حتی الوسع میری کوشش یہی رہی ہے کہ اقبال کا ہر وہ فارسی لفظ جو ان کے شعر میں آیا ہو رہ نہ جائے۔' [۷۰]

نسیم صاحب اس بات سے نہ صرف یہ کہ بخوبی واقف تھے بلکہ وہ ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ کوئی بھی لفظ محض حرفوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس کی ایک تہذیبی روح ہوتی ہے، ایک ثقافتی مزاج ہوتا ہے اور وہ اپنا ایک تاریخی پس منظر بھی رکھتا ہے۔ اردو زبان برصغیر کے جس تہذیبی پس منظر میں پروان چڑھی اس سے تو ان کی آگاہی تھی ہی لیکن فارسی زبان سے ایک گہری نسبت کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ ایرانی تہذیب اور اس کی ثقافتی روایتوں کا بھی ایک وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ چنانچہ لفظ کی حقیقی معنویت ان کے پیشِ نظر تھی۔ اقبال کے فارسی کلام کی روح کو بھی وہ اسی لیے بہتر طور پر سمجھتے ہیں کہ اس زبان کے مزاج سے وہ آگاہ تھے۔ انہوں نے اس فرہنگ کی تدوین میں اس بات کو بھی ملحوظ رکھا کہ اقبال کے اشعار میں جن شخصیتوں کے نام آئے ہیں ان کا بھی ایک جامع تعارف لکھ دیں تاکہ اقبال کے قارئین ان شخصیتوں سے متعارف ہوسکیں۔ شخصیتوں سے متعلق جو تعارفی حصے لکھے گئے ہیں ان میں بھی اس پر خصوصی توجہ دی گئی ہے کہ ان کے محض سوانحی حالات ہی نہ ہوں بلکہ ان کے نظریات کا بھی اظہار کیا جائے تاکہ یہ بھی اندازہ ہوسکے کہ

۷۰۔ بحوالہ مکتوب نسیم بنام ہلال نقوی، مشمولہ مقدمہ فرہنگِ اقبال فارسی (لاہور: اظہار سنز، اشاعتِ اول ۱۹۸۴ء)، ص ۱۶

اقبال جن شخصیتوں کا ذکر کرتے ہیں ان کی صفات کیا تھیں۔

یوں ہمیں اقبال کے اندازِ فکر کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح یہ فرہنگ محض لفظوں اور تراکیب کی تشریح نہیں ہے بلکہ بقول وارث سرہندی 'کہنے کو تو یہ فرہنگ ہے مگر فی الحقیقت یہ فرہنگ سے کہیں وسیع تر چیز ہے'۔[۶۱]

اس فرہنگ کی ترتیب و تشکیل میں نسیم صاحب کے وسیع مطالعے کا حقیقی اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ اقبال کے فکر و فلسفے سے متعلق کسی نکتے کی تشریح کرتے ہیں۔ ہم یہاں بہت سی مثالیں دے سکتے ہیں لیکن صرف ایک مثال سے ہم اپنی بات کی وضاحت کریں گے۔ مثلاً عشق کا ذکر اقبال کے یہاں بار بار آتا ہے اردو اشعار میں بھی فارسی اشعار میں بھی۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا کہ وہ فرہنگ اقبال اردو میں لکھے گئے معانی کو اس فارسی فرہنگ میں بھی دوہرا دیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا فرہنگ اقبال اردو میں لفظ عشق کی انہوں نے جو وضاحت کی فرہنگِ اقبال فارسی میں اس کو نقل نہیں کیا۔ اگرچہ دونوں زبانوں کے شعر اقبال ہی کے ہیں۔ فرق زبان کا ہے ورنہ نظریہ تو ایک ہی ذہن کی پیداوار ہے لیکن نسیم نے پورے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر فرہنگِ اقبال فارسی میں لفظ عشق کی مختلف تشریحات لکھی ہیں یعنی اقبال نے اسے جس پس منظر میں لکھا اور شعر میں جس طرح اس کے معانی ظاہر ہوئے نسیم نے مصرع درج کر کے اس کی وضاحت کی۔ ۹۲۷ صفحات پر مشتمل اس ضخیم فرہنگ سے متعدد مثالوں کے بجائے صرف لفظ عشق کی تشریح کا حصہ ملاحظہ کیجیے:

عشق (ع)

والہانہ محبت جس میں انسان اپنی جان، مال عزت آبرو کسی بات کی پروا نہیں کرتا، مراد خدا اور رسول کی محبت۔

مراد اپنے مسلک پر اصرار، اپنے مؤقف پر پختگی کہ یہ بھی ایک نوع کا عشق ہے۔

زانکہ او در عشق و خدمت اقدم است

(ج ن، ۱۳۳)

۶۱۔ فرہنگِ اقبال پر ایک نظر، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ پاکستان ۱۹۹۴ء)، ص ۱۱۱

مراد ذات خداوندی، تجلیات خداوندی۔

ابن آدم تسرے از اسرار عشق

(ج ن، ۶۸)

مراد خدا اور رسول کی محبت۔

فطرت من عشق را در بر گرفت

(پ م، ۱۷)

صوفی صافی کے دل کا عشق۔

عشق را از شغل لا آگاہ کن

(اس، ۷۶)

مراد وہ نصب العین جس کی محبت میں انسان جد و جہد کرتا ہے، اپنا محبوب اصول۔

در غلای عشق و مذہب را فراق

(زع، ۹۰)

یہ ایک قطعہ کا عنوان ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ عشق مادی دنیا کی کوئی چیز نہیں بلکہ یہ خدائے تعالیٰ کا فضل اور فیضان ہے (یہاں عشق سے خدائے تعالیٰ اور اس کے حبیب کا عشق مراد ہے)

عشق از زیر کی محکم

مراد یہ ہے کہ عاشق اگر صاحب عقل و علم بھی ہو تو اس میں معرفت حاصل کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے اور اس طرح اس کے عشق کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔

کارِ عشق از زیر کی محکم اساس

(ج ن، ۶۵)

عشق از سینۂ تُست

مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نورِ محمدی کو اپنے نور سے پیدا کیا تو اور صفات کے ساتھ

صفتِ عشق کا پرتو بھی آپ کی ذات میں آیا۔اب جس کسی میں عشق کا جذبہ ہے وہ حضور کے عشق کی بدولت ہے۔

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست

(اح،۵۴)

عشقِ ازلذت دیدارالخ

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ طالبان حق کائنات کی حقیقت پر غور کررہے ہیں تو اب خالق کائنات بھی ان کی جدوجہد کے صلے میں ان جلوؤں کو طالبانِ حق پر منکشف کردے گا جو کائنات میں پنہاں ہیں۔

عشق ازلذتِ دیدار سراپا نظر است

(پ م،۱۹۳)

عشق اندر جستجو افتاد

یہاں عشق سے وہ شوق مراد ہے جس کو خدائے تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ 'میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ مجھے اس بات کا شوق ہوا کہ مجھے کوئی پہچانے۔اس غرض سے دنیا کو پیدا کیا۔علامہ فرماتے ہیں عشق یعنی شوق معرفت کا بوجھ اٹھانے والے کی جستجو میں ہے۔

عشق اندر جستجو افتاد و آدم حاصل است

(زع،۱۰۷)

عشق...... برصحرا نہاد

دنیا کو دکھایا کہ عشق کسے کہتے ہیں۔

عشق رازے بود بر صحرا نہاد

(ج ن،۱۷۲)

عشقِ حق (ع ع) مرکب ناقص، عشق + اضافت + حق (رک)

عشق سے بطور مجاز مرسل (تسمیۂ فاعل با اسم شے) عاشقِ حق مراد ہے۔

عشقِ حق آخر سراپا حق شود

(اس، ۱۸)

عشق گرو ید ہوس پیشہ

مراد یہ کہ عشق جب دنیا میں آیا اور مادی شکل اختیار کی تو مادے نے اسے حرص و ہوس میں مبتلا کر دیا۔

عشق گروید ہوس پیشہ دہر بند گست

(پ م، ۱۹۰)

عشق محکم از اساس الخ

عشق کے سامنے 'جب، تب، کب' کا سوال آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ 'اب اور ابھی' اور جب 'کتنا' کا سوال آتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ رضائے معشوق کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اس طرح 'چوں و چند' سے عشق کی بنیاد اور زیادہ محکم اور مستحکم ہو جاتی ہے۔ لیکن جب یہی سوال عقل کے سامنے آتا ہے تو وہ مادی منفعت کے دائرے میں بھٹکتی رہتی ہے۔ اور اس چکر میں کوئی قدم آگے نہیں اٹھاتی۔

عشق محکم از اساسِ چوں و چند

عقل عریاں از لباسِ چوں و چند

(رب، ۱۰۹)

عشق مرداں

'مرداں' سے آزاد مرد مراد ہیں اور عشق سے اس محبت کی طرف اشارہ مقصود ہے جو شاہجہان کو اپنی بیگم سے تھی اور جس بنا پر بیگم کی یادگار میں اس نے یہ مقبرہ بنایا جو تاج بی بی کے روضہ کے نام سے مشہور ہے۔

عشقِ مرداں سرّ خودرا گفتہ است

(ز ع،۱۹۴)

عشق نامہ (ع ف) مرکب ناقص، عشق (= محبت، چاہ، چاہت) + نامہ (= تحریر)
عشق و عاشقی کے بیان پر مشتمل تحریر، مراد گوئٹے کی ایک کتاب منظوم۔ جس کا موضوع عشق و عاشقی ہے۔

(پ م،۹،س ۱۷)

عشق یکِ بیں
مراد ایسا عشق جو صرف ایک خدا کو دیکھتا ہے جس کی نظر خدائے وحدہ لاشریک پر ہے۔
عشق یک بیں ادر تماشائے دوئی است[۶۲]

(ج ن،۶۹)

درج بالا اقتباسات میں الفاظ اور تراکیب کے معنی کا جو ڈھنگ ہے اس میں نسیم محض کوئی لغت نویس یا صرف ایک محقق کا درجہ ہی نہیں رکھتے بلکہ ان تشریحات میں ہمیں ایک دانشورانہ طرزِ فکر کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے نسیم امروہوی کی مرتبہ فرہنگ کے حوالے سے اس رائے کا اظہار کیا ہے:
'ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی محقق دانشورانہ سطح پر اس تمام فارسی کلام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اقبال کے فکر و فن کے حوالے سے کوئی مبسوط فرہنگ تیار کر دے۔ لہٰذا فرہنگِ اقبال فارسی کے عنوان سے جو تصنیف اس وقت چھپ چکی ہے اس میں حضرت نسیم امروہوی نے اقبال کے مکمل فارسی کلام کی روشنی میں اقبال شناسی کے بعض فکر انگیز باب قائم کر دیے ہیں۔ اس طرح اس فرہنگ کی جہاں ایک طرف یہ خصوصیت ہے کہ اس کے ذریعے اقبال کے فارسی کلام کی تفہیم سہل ہو جاتی ہے، وہاں دوسری طرف اس فرہنگ

۶۲۔ نسیم امروہوی، فرہنگِ اقبال فارسی (لاہور: اظہار سنز، اشاعت اول ۱۹۸۹ء) ص ص ۵۹۱، ۵۹۲

کے توسط سے ہم اقبال کے افکار و نظریات کا منضبط اور مبسوط مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔'[۶۳]

نسیم علامہ اقبال کے افکار و نظریات کے مطالعہ کو جو اہمیت دیتے ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اقبال کو بیسویں صدی کے فکری، سماجی اور تہذیبی حالات کے پس منظر میں دیکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال کو نظر انداز کر دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے برصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی، تاریخی اور تہذیبی زندگی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک اقبالیات کے مطالعے کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ہم عالمِ انسانیت خصوصاً برصغیر کے رہنے والے مسلمانوں کی سیاسی، ثقافتی اور سماجی زندگی سے ایک حد تک متعارف ہو جاتے ہیں اور اس زندگی کو اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانے کے لیے بہتر اصولوں کو بھی ہم سمجھنے لگتے ہیں۔

۶۳۔ اقبال شناسی اور فرہنگِ اقبال، مشمولہ ماہنامہ، جدید ادب لاہور، شمارہ ۵ر دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ص ۱۱، ۱۲

ساتواں باب

نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری کا سماجی مطالعہ

- مرثیے کی بنیادی تعریف پر ایک تنقیدی نظر
- سودا کی اختلافی آواز
- انیس کا مرثیہ اور سماجی انسان
- آزاد، حالی اور شبلی نے مرثیے کو مذہبی ادب کے محدود دائرے سے باہر نکالا
- مرثیے کا انسانی اور آفاقی پہلو
- مرثیہ نسیم امروہوی کے عہد میں
- عوامی مقبولیت
- نسیم امروہوی کا پہلا مرثیہ اور سماجی محرکات
- دوسو مرثیوں میں سماجی موضوعات کا تنوع
- مرثیے کا چہرہ اور حالاتِ حاضرہ
- بحث واستدلال کی روایت
- سماج میں عقل پرستی کے رجحانات کی ترویج
- فکری بنیادیں
- سماج میں ارتقا کا پیغام
- رسومِ بد میں پھنسے، ارتقا کو بھول گئے
- سازِ حریت میں عمرانیات اور معاشیات کے اصلاحی مضامین

- ترقی پسندانہ طرزِ فکر
- یہ شاعری نہیں باتیں ہیں کام کی سُنیے
- فراتِ دہر کا پانی سب ہی کو پینے دو
- اسلامی سماج
- پاکستانی ادبیات میں نسیم کے مرثیے کے اوصاف
- سندھی سماج سے مرثیے کا عوامی رشتہ
- عورت کی مظلومیت
- انسانی رشتوں کی شاعری
- اعلیٰ انسانی اقدار کا اظہار
- نسیم کی شخصی مرثیہ نگاری......ایک سماجی دستاویز

ساتواں باب

نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری کا سماجی مطالعہ

شاعر، محقق، نقاد، ماہرِ لسانیات ولغت، فرہنگ نویس، مفسر، مترجم اور صحافی کے ساتھ ساتھ نسیم کی ادبی شخصیت کا ایک بہت اہم حوالہ ان کی مرثیہ نگاری کا حوالہ ہے۔ بیسویں صدی میں کہے جانے والے مرثیوں کی جو تاریخ لکھی جائے گی اس میں ان کے تذکرے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ دو سو سے زیادہ مرثیوں کے خالق ہیں[1] اور محض مقدار کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ معیار کے اعتبار سے بھی اُنہیں بیسویں صدی کے بڑے مرثیہ نگاروں کی صف میں جگہ دی گئی ہے۔ مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی نے انہیں نئے مرثیے کے سربراہوں میں شمار کیا ہے۔[2] ہمارے عہد کے صفِ اوّل کے اسکالرز اور نقادوں نے انہیں اپنے عہد کا اہم مرثیہ نگار شاعر تسلیم کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی،[3] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی[4] پروفیسر سید وقار عظیم،[5] ڈاکٹر عبادت بریلوی،[6] ڈاکٹر جمیل جالبی،[7] ڈاکٹر فرمان فتح پوری،[8] پروفیسر مجتبیٰ حسین[9] اور دوسرے کئی ممتاز اہلِ قلم کی تحریروں میں

۱۔ کریم بخش خالد، خیر پور کے نامور شعراء، مشمولہ روزنامہ 'حریت'، کراچی، ۷ افروری، ۱۹۹۱ء، ص ۳

۲۔ نفسِ مطمئن (لاہور: اظہار سنز، دسمبر ۱۹۷۶ء) ص ۳

۳۔ اقتباس از، شبیہ الحسن ('بجھی وہ شمع'، لاہور: اظہار سنز، جون ۱۹۸۷ء) ص ۲۵

۴۔ دیباچہ، مشمولہ نسیم امروہوی، رثاء محسن الحکیم (کراچی: کل پاکستان فروغِ مرثیہ، جولائی ۱۹۷۰ء) ص ۱۲

۵۔ عرفانِ نسیم، (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۷۴ء) ص ۵۷

۶۔ اقتباس از، شبیہ الحسن، 'بجھی وہ شمع' (لاہور: اظہار سنز، جون ۱۹۸۷ء) ص ۲۵

۷۔ اقتباس از، مکتوب، بنام ہلال نقوی، مشمولہ تعزیت نامہ، کراچی ۱۹۸۷ء، ص ۸

۸۔ دیباچہ مشمولہ صبحِ ازل (لاہور: پیسہ اخبار، ستمبر ۱۹۸۱ء) ص ۹

۹۔ لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں، مشمولہ، ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن سادات امروہہ، طبع اوّل، ۱۹۹۲ء) ص ۳۱

اس کا اعتراف کیا گیا ہے۔

نسیم امروہوی کے مرثیوں کے سماجی مطالعے میں ہم ان کے یہاں اسلامی سماج اور برصغیر کے سماج کی مختلف تصویروں کے رنگ بھی دیکھیں گے اس کے ساتھ ساتھ ان کے مرثیوں کے چہروں میں ایک اچھے معاشرے کی تشکیل، انسانی رشتوں کی سماجی اساس، خیر وشر کے امتیازات، معیارِ قیادت، حقوق وفرائض کی تقسیم، صلح وآشتی کی تعلیم اور شہادت کی معنویت کا بھی مطالعہ کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے صنفِ مرثیہ سے متعلق ان چند بنیادی پہلوؤں کو دیکھنا بھی ضروری ہے جس سے مرثیے کے اس سفر کے خدوخال واضح ہوسکیں جو نسیم امروہوی کے دور تک پہنچا۔

مرثیے کی بنیادی تعریف پر ایک تنقیدی نظر

مرثیہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس کی بنیاد 'رثا' ہے۔ اردو لغت میں رثا کے معنی یہ لکھے گئے ہیں:

'مردے کو رونا' مردے کی میت پر بین کرنا اور اس کی خوبیاں بیان کرنا' [۱۰]

لغت نویسوں نے مرثیے کے ذیل میں یہی تعریف لکھی ہے اور اسی تعارف کے سبب مرثیے کو ابتدا ہی سے ایک محدود شاعری تصور کر لیا جاتا ہے جس کا مقصد ہی رونا رلانا ہے۔ اس ذیل میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کیفی اعظمی لکھتے ہیں:

> "تخلیق کا سرچشمہ کبھی عروضیوں اور قاموسیوں کی تعریفوں کا پابند نہیں رہا۔ اہلِ فرہنگ یہ کہتے رہے کہ غزل نام ہے عورتوں سے گفتگو کا لیکن غزل اپنے آغاز سے آج تک کسی دور میں بھی صرف عورتوں سے گفتگو بن کے نہیں رہی اس نے ہر دور میں سماجی زندگی کی بھرپور ترجمانی کی، اب بھی کر رہی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی، اسی لیے وہ اب تک زندہ رہی ہے اور اسی طرح آئندہ بھی زندہ رہے گی...... اہلِ فرہنگ کا یہ ارشاد بھی بے جا ہے کہ مرثیہ رثا سے مشتق ہے اور اس کا کام رونا رلانا ہے...... انیس و دبیر کے مرثیے جن کا موضوع معرکۂ کربلا ہے میں ان کو احتجاجی شاعری کے اعلیٰ نمونے مانتا ہوں، احتجاج ظلم کے خلاف، احتجاج جارحیت کے خلاف، احتجاج حق کی طرف سے باطل کے

۱۰۔ اردو لغت، جلد دہم (اردو لغت بورڈ کراچی، جنوری ۱۹۹۰ء)، ص ۵۱۹

خلاف ہے۔[۱۱]

مرثیے کے وہ اہلِ سخن اور اہلِ نظر جن کی نظر اس صنف کی وسعتوں اور اس کے پھیلاؤ پر ہے وہ مرثیے کو اس کی محدود تعریف کے ساتھ قبول کرنے کو آمادہ نہیں۔

پروفیسر مشکور حسین یاد نے ایک پورا مضمون ہی اسی بحث پر لکھا ہے یہ اقتباس دیکھیے:

'فرہنگِ عامرہ اردو میں مرثیے کی تعریف میں یہ عبارت آئی ہے 'مردے کی تعریف میں اشعار' نور اللغات میں لفظ مرثیہ کے آگے یہ تحریر ہے 'مردے کی صفت' مردے کی تعریف وہ نظم یا اشعار جس میں کسی شخص کی وفات اور اس کی مصیبتوں کا ذکر ہو۔ ہمارے جو بڑے بڑے مرثیہ نگار دنیا کی توجہ کے بجائے غفلت اور عدم توجہی کے گوشے میں پڑے رہ گئے ہیں اس کی وجہ بھی صنفِ مرثیہ ہے۔ اسی معنی میں کہ اس کو مردے یا میت پر رونے والی بات یا رام کہانی کہا گیا ہے، رثائی ادب کو نظر انداز بھی اسی لیے کیا گیا ہے۔ لفظ مرثیہ میں وسعت نہیں ہے اگر آپ اس صنفِ ادب کو مرثیہ کے علاوہ اور کچھ نہیں کہیں گے تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ اس میں خاص لوگوں کے اپنے مردوں اور میتوں کا ذکر ہے۔ تو ہم اس مدح سرائی یا واویلا کو آخر کیوں گوش گزار کریں'۔[۱۲]

خود نسیم امروہوی جن کی زندگی کا بیشتر حصہ صنفِ مرثیہ سے وابستگی میں گزر گیا وہ بھی مرثیے کی محدود تعریف کو قبول نہیں کرتے اگر چہ وہ خود لغت نویس ہیں لیکن ان کا تخلیقی ذہن لغت کی بندشوں سے ہٹ کر اپنی ایک الگ رائے رکھتا ہے۔ ان کے ایک بند کی یہ بیت اسی بات کی نشاندہی کرتی ہے:

کون سا رخ ہے جو اس صنف میں موجود نہیں
مرثیہ رونے رلانے ہی میں محدود نہیں[۱۳]

عہدِ نسیم میں مرثیے کے متعلق یہ احساس بہت نمایاں ہو گیا کہ مرثیے کو کسی محدود نقطۂ نظر سے نہ دیکھا جائے لیکن جب ہم مرثیے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ احساس مرثیے کے اس دور میں پہلی بار ظاہر ہوا جب سودا جیسے شاعر نے مرثیے کے دقیانوسی طرزِ خیال سے اختلاف کیا۔

۱۱۔ اقتباس از، اذانِ مقتل (لندن کراچی: محمدی ٹرسٹ، فروری ۱۹۹۴ء)، ص ۱۰

۱۲۔ ہمیں مرثیے کے لفظ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے، پروفیسر مشکور حسین یاد، مشمولہ رثائی ادب (سہ ماہی) کراچی شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱، ص ۱۹

۱۳۔ نسیم امروہوی، فلسفۂ غم (جونپور: 'سنہ اشاعت ندارد')، ص ۲۱

سودا کی اختلافی آواز

مرزا محمد رفیع سودا (۱۷۱۳ء۔۱۷۸۱ء) اس اعتبار سے اردو کے پہلے شاعر ہیں کہ انہوں نے مرثیے کے اس محدود تصور سے اختلاف کیا جس کا مقصد محض گریہ وزاری ہو۔ انہوں نے اپنے دور کے ایک مرثیہ نگار میر محمد تقی کے مرثیے پر تنقید کرتے ہوئے بہت وضاحت سے یہ بات کہی کہ مرثیے کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ بس عوام الناس اسے سنیں اور رودیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ یہ راہ اختیار نہیں کر سکتے۔ وہ خود بھی مرثیے لکھتے تھے۔ لیکن ان کا نقطۂ نظر یہ تھا:

سچ ہے مجھ کو یہ مرثیے کا ڈھب
نہیں آتا وہ جس سے رو دیں سب[۱۴]

انتظار حسین نے لکھا ہے کہ فارسی کے صفِ اول کے کسی شاعر نے بھی مرثیے کی صنف پر اتنی سنجیدگی سے توجہ نہیں کی جس طرح اردو میں سودا نے کی۔[۱۵]

انیس کا مرثیہ اور سماجی انسان

سودا کے بعد اردو مرثیے کے ممتاز ترین شاعر میر انیس (۱۸۰۲ء۔۱۸۷۴ء) اور مرزا دبیر (۱۸۰۳ء۔۱۸۷۵ء) ہیں اور ان میں بھی میر انیس نے مرثیے کو جس طرح ادب و شاعری سے قریب کیا اس کی دوسری مثال ملنا مشکل ہے۔ ان کے مرثیے کی شعری صفات پر بہت لکھا گیا ہے۔ اردو کے بڑے ناقدین آج بھی ایک نئے زاویے سے ان کے مرثیوں کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ آج کی تہذیبی اور معاشرتی اقدار کے حوالے سے شعر و ادب کا جائزہ لینے والے انیس کے مرثیے کو انسانی رشتوں کی ایک لازوال شاعری قرار دے رہے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی، میر تقی میر، غالب اور اقبال کی شاعری میں جو انسان نظر آتے ہیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے سلیم احمد نے لکھا ہے کہ:

'جدید تنقید میں سماجی انسان کا بہت شور مچا ہے۔ مگر اردو میں کسی شاعر نے سماجی انسان پیش کیا ہے تو میر انیس نے۔ یہاں انسان اپنے بنیادی ماحول میں ہے۔ باپ، بیٹے، بھائی، بھابھی، چچا، بھتیجے، ماموں، بھانجے، ماں، بیٹی، ساس، بہو، نند، بھاوج، شوہر،

۱۴۔ کلیاتِ سودا، جلد دوم (لکھنؤ: نولکشور، اشاعت اول ۱۹۳۲ء)، ص ۴۲۸

۱۵۔ ملاقاتیں (لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۸۸ء)، ص ۱۸۹

بیوی، دوست، احباب، آقا اور غلام غرض انسانی رشتے کی کون سی شکل ہے جس نے میر انیس کے دل کو متاثر نہیں کیا۔'[۱۶]

آزاد، حالی اور شبلی نے مرثیے کو مذہبی ادب کے محدود دائرے سے باہر نکالا

میر انیس کی مرثیہ نگاری میں جو ایک ادبی عظمت ہے اس نے پہلی بار اردو تنقید کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ سرسید احمد خان نے 'تہذیب الاخلاق' میں اردو کی داستانوں اور روایتی غزل پر جو اعتراض کیے تھے اس سے ان کے رفقائے کار بہت متاثر تھے۔ چنانچہ انہی اثرات میں مختلف اصنافِ شعر کو پرکھنے اور جانچنے کے معیار بھی بدل رہے تھے۔

محمد حسین آزاد نے آب حیات (۱۸۸۰ء) حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) اور مولانا شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر (۱۹۰۷ء) میں انیس و دبیر کے حوالے سے اردو مرثیے کو ایک ادبی تصور کے ساتھ مطالعہ کیا۔ مولانا حالی نے تو انیس کے بارے میں یہ بھی کہا کہ:

'ان کو جس نظر سے کہ ہم دیکھتے ہیں بہت کم دیکھا گیا ہے۔'[۱۷]

یہاں حالی کی مراد ان کی شعری عظمت سے ہے۔ محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین کہتے ہیں کہ:

'ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں مرثیہ گوئی و مرثیہ نویسوں کے متعلق اظہارِ خیال کر کے اس غلط فہمی کا پردہ چاک کیا کہ ان کا تعلق صرف مذہبی ادب کے محدود دائرے سے ہے۔'[۱۸]

۱۶۔ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے، مشمولہ اردو (سہ ماہی) پاکستان انجمنِ ترقی اردو، شمارہ ۳، ۴، ۱۹۷۴ء، ص ۲۲۱

۱۷۔ مقدمہ شعر و شاعری (لاہور: مکتبۂ جدید، اکتوبر ۱۹۵۳ء)، ص ۲۶۶

۱۸۔ موازنۂ انیس و دبیر، مشمولہ 'ادیب' (علی گڑھ) شمارہ ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۲

مرثیے کا انسانی اور آفاقی پہلو

مرثیے کی ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ مذہب سے وابستہ ہونے کے باوجود مذہبی ادب کے دائرے میں محدود نہیں ہوسکا۔ دکن اور دہلی کے مرثیوں میں ایک محدود فکر یقیناً ملتی ہے لیکن جب یہ مرثیہ انیس کے دور میں پہنچا تو دکن اور دہلی کی روایات سے بالکل الگ ہوگیا۔ انیس نے جہاں اسے ادب وفن کا شاہکار بنایا وہیں اس میں زندگی کے ایسے پہلو اُجاگر کردیئے جس میں انسانی اور آفاقی خصوصیات نمایاں ہوگئیں۔ نام تو اس صنف کا مرثیہ ہی رہا لیکن اس کی روح میں زندگی کے ایک بڑے خیال نے جنم لیا بقول مشفق خواجہ:

'اس عظیم شاعر نے مرثیہ گوئی کے پردے میں انسانی زندگی کی ابدی حقیقتوں کا سراغ لگانے کی ایسی کوشش کی ہے جس کی ادبیاتِ عالم میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔'[۱۹]

انیس کے بعد جب مرثیے کی تاریخ آگے بڑھی تو اس نے انیس کی قائم کی ہوئی روایات کو بنیاد بنایا۔[۲۰] انسانی زندگی کی ابدی حقیقتوں کا سراغ لگانے کے اس سفر میں مرثیے نے ان موضوعات کو زیادہ وسعت دی جن کا تعلق پوری انسانیت سے ہے۔ خیر وشر اور نیکی و بدی کی کشمکش سے ہر تہذیب اور ہر عہد کو گزرنا ہوتا ہے۔ یہ وہ پہلو ہیں جو کہیں نہ کہیں مرثیوں میں کسی کردار یا کسی خیال کے پیچھے نظر آتے ہیں۔ شجاعت اور قربانی کو دنیا کے عظیم موضوع قرار دیتے ہوئے علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

'یہ زمانے کے اعلیٰ ترین جذبات ہیں جو آزادی اور صداقت کی زمین سے پیدا ہوتے ہیں اور کسی ایک ملک اور قوم تک محدود نہیں ہیں ان جذبات کو جس تاریخی داستان (کربلا) نے عظمت عطا کی ہے وہ بہت سادہ ہے اسی سادگی میں اس کی گہرائی ہے اور اِسی سادگی میں اس کی بلندی۔ اس داستان میں نیکی و بدی کی کشمکش ایک رزمیہ کا انداز اختیار کرلیتی ہے۔'[۲۱]

۱۹۔ اقتباس از یادگاری مجلہ، ۲۰۰۳ء، مرتبہ اقبال کاظمی، مرثیہ فاؤنڈیشن پاکستان، ص ۱۸

۲۰۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی، جدید فکر و طرزِ اظہار کا پیش رو، مشمولہ، رثائی ادب، کراچی، شمارہ ۲۷، ۲۸/۲۰۰۲ء، ص ۴۸۵

۲۱۔ انیس کی معجز بیانی، مشمولہ، انیس شناسی، مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء)، ص ۳۰

مرثیہ نسیم امروہوی کے عہد میں

مرثیے میں انسانی اور آفاقی جذبات کا اظہار اس وقت زیادہ نمایاں ہوا جب مرثیہ بیسویں صدی میں داخل ہوا۔ ہم اس صدی کو نسیم امروہوی (۱۹۰۸ء۔۱۹۸۷ء) کا دورِ حیات بھی کہہ سکتے ہیں۔ پروفیسر مسیح الزماں بیسویں صدی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'مادی زندگی کے ڈھانچے میں تبدیلی کی وجہ سے ایک ایسا سماج پیدا ہو رہا تھا جس کی علمی بصیرت، ذہنی بیداری پہلے کے تعلیم یافتہ طبقے سے الگ راستہ اختیار کر رہی تھی قومی جذبات کا احیاء ہو رہا تھا۔ ادب اور زندگی کے رشتوں پر غور کیا جا رہا تھا اور ادب سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا تھا کہ وہ وقت کی چیز ہوتے ہوئے بھی ہر وقت کی چیز ہو یعنی اس میں ایسی انسانی قدریں اُبھاری جائیں جو ہمہ گیر ہوں۔'[۲۲]

ادب و شاعری اپنے وقت کی چیز ہوتے ہوئے بھی ہر وقت کی چیز یقیناً اسی وقت بنے گی جب اس میں وہ انسانی قدریں اُبھاری جائیں جن میں ہمہ گیریت ہو۔ اور اس زاویے سے وہ ہی لکھنے والے سوچ سکتے ہیں جو ادب کا اپنے معاشرے سے رشتہ قائم کرتے ہیں۔ شبلی نے تو انیس و دبیر کی فصاحت و بلاغت کو موازنۂ انیس و دبیر کی بنیاد بنایا تھا جبکہ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں غزل، قصیدہ اور مثنوی کی گرتی ہوئی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے مرثیے کو اخلاقی نظم کہہ کر اس کا سماج سے رشتہ قائم کرنے کی بنیاد رکھی وہ مرثیے کو نئی طرز کی نظم کہتے ہوئے یہ بات لکھتے ہیں:

'حق یہ ہے کہ اس نئی طرز کی نظم سے اردو شاعری میں بہت وسعت پیدا ہوگئی ہے ہمارے نزدیک نہ صرف اردو بلکہ فارسی و عربی شاعری میں بھی ایسی نظمیں مشکل سے ملیں گی جن میں ایسے اعلیٰ درجے کے اخلاق بیان کیے گئے ہوں۔'[۲۳]

مرثیے کی اس نئی طرز کی نظم کو جسے حالی اخلاقی نقطۂ نگاہ سے بہت اہمیت دیتے ہیں اور اس کا سماج سے رشتہ جوڑتے ہیں اس کی طرف بیسویں صدی کے صفِ اول کے مرثیہ نگاروں میں زیادہ توجہ نسیم امروہوی نے کی۔ ارسطو نے اپنی بوطیقا میں[۲۴] عناصرِ المیہ سے جو بحث کی ہے اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے

۲۲۔ اردو مرثیے کے لافانی نقوش، مشمولہ عظمتِ انساں، مرتبہ وحید الحسن ہاشمی (لاہور: مکتبۂ تعمیر ادب، ۱۹۶۰ء)، ص ۳۳

۲۳۔ مقدمہ شعر و شاعری (لاہور: مکتبۂ جدید، اکتوبر ۱۹۵۳ء)، ص ۲۶۶

۲۴۔ بحوالہ ڈاکٹر اعجاز حسین، مختصر تاریخ ادب اردو (سندھ: اردو اکیڈمی، بار سوم، ۱۹۷۱ء)، ص ۲۱

اخلاق سے پیدا ہونے والی اقدار کو جس طرح انیس نے مرثیے میں سمو دیا ہے اس کا ذکر نسیم اس انداز سے کرتے ہیں:

کیا بلند بہت تو نے اے ارسطو کار
عناصرِ المیہ سے مرثیے کا وقار
سمٹ کے آ گئے اخلاق کے وہ کُل اقدار
کہ جن کا مقصد اعلیٰ بلندیٔ کردار؛ ۲۵

۱۹۷۰ء کے عشرے میں جب پاکستان میں انیس کی وفات کی ایک صدی پر ادیبوں اور نقادوں نے اپنے مضامین اور مقالوں میں انہیں خراجِ تحسین پیش کیا تو اس موقع پر نسیم امروہوی نے ۱۴۲ بندوں پر مشتمل ایک طویل مسدس میں انیس کے فن اور ادبی اثرات پر بہت تفصیل سے منظوم اظہارِ خیال کیا۔ یہ اس عہد کی پہلی طویل نظم ہے جس میں انیس کے مرثیے میں ادبی تبدیلیوں کو انہوں نے سماجی مطالعے کی روشنی میں دیکھا ہے۔ اس مسدس کے چار مصرعے ابھی نقل کیے گئے ہیں یہ چند بند بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں:

انیس ایسے زمانے میں تھا نوا پرداز — کہ بزمِ شعر و سخن تھی رہینِ غمزہ و ناز
معاشرہ وہ سراسر اسیرِ نغمہ و ساز — وہ طولِ ذوقِ تغزل، بقدرِ زلف دراز
رباب و چنگ سے زہد آشنا بھی دور نہ تھا
گلے میں نور سہی، پر سخن میں نور نہ تھا

تمام قوم تھی سرمستیٔ نشاط میں مست — دخیل بزمِ تغزل تھا جام دست بدست
عوام زار و زبوں تھے، خواص عیش پرست — مکان اونچے سے اونچے، خیال پست سے پست
تھی انتشارِ نظر، نظم بے محل ان کی
قصیدۂ لب و عارض تھی ہر غزل ان کی

۲۵۔ مشمولہ شہید، ہفت روزہ لاہور، شمارہ ۶، ۷/۲/۱۹۷۶ء، ص ۱۲

وہ نقصِ ذات وصفات بشر کا عہدِ کمال کہ جس میں فکرِ عواقب نہ عاقبت کا خیال
ہوائے دامن شاہی میں پل رہا تھا زوال سمندِ عیش کی ٹاپوں سے شعر تھا پامال
کسی کی جز در دولت کہیں نگاہ نہ تھی
عذابِ وقت سے بچنے کی کوئی راہ نہ تھی

سبو تھے ناز ونعم کے تو غفلتوں کی شراب مشاعرے تھے خرابات حالتیں تھیں خراب
نہ زندگی میں حرارت، نہ روح میں تب وتاب غزل چھڑی تو کھلی عشق پر ہوس کی کتاب
وہ شاعری تھی کہ مذکور سے حجاب آئے
یہ ہوگیا تھا ضروری کہ انقلاب آئے[۲۶]

یہ بند اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ نسیم صاحب شاعری کو سماج کے بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ اپنے مرثیے میں انیس کے پیروکار ہوتے ہوئے بھی ایک الگ راستہ بناتے ہیں جو ان کے اپنے عہد اور اپنی اقدار سے قریب ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

'ادب و زیست کے بدلتے ہوئے تصورات اور متغیر اقدار کی وجہ سے آج کے مرثیہ گو شعراء اپنے تخلیقی جوہر انیس و دبیر کی پیروی میں نہیں دکھا سکتے۔'[۲۷]

ڈاکٹر محمد حسن نے عہدِ جدید میں مرثیہ لکھنے والے شاعروں کے متعلق لکھا ہے:

'ان پر واضح طور پر معاصر واقعات اور ہم عصر احساس وادراک کی نشانیاں ملتی ہیں ان کی دردمندی کی نوعیت بھی مختلف ہے اور ان کا طرزِ احساس بھی الگ ہے اور اس اختلاف کو ادبی سماجیات کی نظر سے دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ یہی اختلاف ہے جس نے دورِ جدید میں اردو مرثیے کی تجدید کی ہے اور اسے پھر سے مقبول صنفِ سخن بنا دیا ہے۔'[۲۸]

نسیم امروہوی کے عہد کے تقاضے اور ان کا طرزِ احساس یقینی طور پر انیس کے عہد اور ان کے طرزِ احساس سے الگ ہوگا کیوں کہ نسیم کا سماجی ماحول انیس کے سماجی ماحول سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن نسیم جہاں انیس سے قریب ہوتے ہیں وہ انیس کے مرثیے اور ان کے عہد کے مرثیے کی وہ خوبی اور برتری ہے جس نے اسے زبان وادب کی تاریخ میں زندہ رکھا ہے۔ جن میں سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ انیس

۲۶۔ مشمولہ، اردو نامہ، ماہنامہ، کراچی، ترقی اردو بورڈ، شمارہ ۴۱، جنوری ۱۹۷۲ء، ص ص ۱۱، ۱۲
۲۷۔ جوش کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین (لاہور: فیروز سنز 'سنہ اشاعت ندارد')، ص ۱۱۰
۲۸۔ ڈاکٹر محمد حسن، اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۸ء)، ص ۲۳۳

نے مرثیے میں تمام اصنافِ سخن کا حسن سمیٹ لیا ہے۔ مولانا شبلی نے انیس کے ذیل میں اسی حقیقت کی طرف سب سے پہلے توجہ دلائی تھی:

'ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔'[۲۹]

اس خوبی کا احساس آج کے تنقید نگار کو بھی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سلیم اختر[۳۰] مرثیے کو ایک ایسی پرزم[۳۱] (Prism) قرار دیتے ہیں جس سے متعدد اصناف کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ متعدد اصنافِ سخن کی یہ شعاعیں جو انیس کے مرثیے سے بھی پھوٹیں وہ نسیم کے یہاں بھی جلوہ افروز ہوئیں۔ مرثیے کو جامع صنف سخن قرار دیتے ہوئے نیاز فتح پوری اس ذیل میں لکھتے ہیں:

'شمالی ہند اور اودھ نے اس کو بڑی جامع صنفِ سخن بنا دیا جس میں غزل، قصیدہ، مثنوی اور رباعی سب کچھ شامل ہو گیا۔ اس کی تصدیق انیس و دبیر کے مراثی سے بھی ہو سکتی ہے اور جناب نسیم امروہوی کے مرثیوں سے بھی۔'[۳۲]

ڈاکٹر شارب ردولوی نے بھی مرثیے کو جامع صنف لکھتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا ہے:

'یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اس صنف نے تمام اصنافِ سخن کی خصوصیات کو اپنے اندر سمو لیا۔ غزل کی رنگینی اور غنائیت، قصیدے کی بلاغت اور طمطراق، مثنوی کی ماجرا سازی، روانی اور تسلسل، رباعی کی معنویت اور علمیت، افسانے کا قصہ پن اور ڈرامے کا مکالمہ، کشمکش اور تصادم، کیا ہے جو مرثیے میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمام اصنافِ سخن میں یہی ایک صنفِ سخن ہے جس میں ہماری زندگی کی پوری تہذیب اور ثقافت، رزم اور بزم موجود ہے۔'[۳۳]

۲۹۔ موازنۂ انیس و دبیر (آگرہ: مفید عام، ۱۹۰۷ء)، ص ۲

۳۰۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ایڈیشن ۲۰۰۲ء)، ص ۵۸۵

۳۱۔ پرزم کی وضاحت یہ کی گئی ہے کہ اقلیدس میں ایک ٹھوس شکل جس کے کنارے چار سے زیادہ ہوں لیکن صورت اور سائز میں برابر ہوں۔ یہ مخروطی اور ہشت پہلو بھی ہو سکتا ہے۔ بحوالہ اردو لغت، جلد سوم (کراچی: ترقی اردو بورڈ، مطبوعہ ۱۹۸۱ء)، ص ۸۶۲

۳۲۔ مراثی نسیم جلد اول پر تبصرہ، مشمولہ، نگار، فروری ۱۹۶۳ء، ص ۶۲

۳۳۔ عزاداری کا تہذیبی تناظر، مشمولہ ارتقا، جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء کراچی، ارتقا مطبوعات، ص ۲۷۶

مرثیے کی عوامی اور سماجی مقبولیت

مرثیے کی عوامی وسماجی مقبولیت کا بڑا سبب ایک تو یہی ہے کہ اس میں تمام اصنافِ سخن کا حسن ہے دوسرے یہ کہ انسانی احساسات کی ایک وسیع تشریح کی وجہ سے اس کا دامنِ خیال بہت پھیلا ہوا ہے۔نسیم امروہوی اس بارے میں کہتے ہیں کہ:

"تخیل اور تنوع مضامین کے اعتبار سے آج کے مرثیے میں وہ سب کچھ ہے جو اردو نظم کے تمام اصنافِ سخن میں ہوتا ہے۔"[۳۴]

ڈاکٹر سید محمد عقیل لکھتے ہیں کہ: 'مرثیہ اپنے موضوع اور واقعاتِ بیانیہ کے لحاظ سے عوامی مزاج یعنی Mass Appeal کی چیز ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متاثر کر سکے۔'[۳۵] علی جواد زیدی کی رائے تو یہ ہے کہ 'اگر زبان اردو کے اس دور میں لوک ادب تلاش کرنا ہو تو ہمیں مرثیے (اور نعت) میں ملے گا جس کی حیثیت عوامی رہی ہے۔'[۳۶] فیض احمد فیض مرثیہ نویسوں کے کلام کو اس لیے قابلِ قدر قرار دیتے ہیں کہ انہوں نے امرا سے ہٹ کر عوام کی طرف رجوع کیا۔[۳۷]

محمد داؤد رہبر نے اپنے مضمون 'مشاعرے کا ارتقا اور اس کی اہمیت'[۳۸] میں مرثیے اور سلام کی مجالس کو مشاعروں ہی کی ایک شاخ کہا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری انیسویں صدی کے لکھنے والوں کے حوالے سے بھی یہ بات کہتے ہیں کہ:

'یہ مرثیہ گو فقط مذہبی جذبات یا دربار کی خوشنودی کی خاطر مراثی نہیں لکھ رہے تھے بلکہ اس کی سماجی مقبولیت اور عوامی پذیرائی کے سبب بھی اس کی طرف مائل تھے۔'[۳۹]

صنفِ مرثیہ کی سماجی مقبولیت اور عوامی پذیرائی کے جو بھی اسباب ہو سکتے ہیں ان میں سب سے بنیادی سبب تو وہ واقعہ ہی ہے جس پر مرثیے کی تمام تر فکر کا دارومدار ہے۔اپنے سماج سے، اپنے

۳۴۔ انٹرویو، مشمولہ، ہلال نقوی، جدید مرثیے کے تین معمار (کراچی: پاکستان ریڈرس گلڈ، دسمبر ۱۹۷۷ء)، ص ۳۰

۳۵۔ جوش کی مرثیہ نگاری پر کچھ باتیں، مشمولہ تناظر (سہ ماہی) حیدرآباد دکن شمارہ ۲۸، ۲۹، ص ۱۰

۳۶۔ انیس کا نظریۂ فن، مشمولہ انیس شناسی، مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء)، ص ۲۷

۳۷۔ میزان (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، جدید ایڈیشن، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۲۸

۳۸۔ مشمولہ اردو (سہ ماہی)، انجمن ترقی اردو دہلی، شمارہ ۱۹۴۵ء، ص ۱۵۲

۳۹۔ لکھنؤ کے شعرو ادب کا معاشرتی اور ثقافتی پس منظر (فیض آباد یو۔پی: نشاط آفسٹ پریس، مئی ۱۹۸۷ء)، ص ۲۵۳

ماحول سے اور اپنے گردوپیش کے حالات و واقعات سے اس تاریخی واقعے کا جو تعلق ہوسکتا ہے وہ خود اس تاریخی واقعے کی اہمیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

نسیم امروہوی لکھتے ہیں:

’اس تاریخی واقعے کے دامن میں کیا نہیں؟ قرآن اور اس کے لانے والے کی تعلیمات ہیں، معارف و حقائق ہیں، امامت کے آئینے میں شانِ رسالت کے جلوے ہیں۔ ایثار ہے۔ قربانی ہے۔ صبر و ضبط ہے۔ تحمل ہے۔ انضباط (ڈسپلن) ہے۔ ثبات و استقلال ہے۔ یقینِ محکم ہے۔ تنظیم ہے۔ وحدتِ خیال و مقال ہے۔ صداقت ہے۔ خودی ہے۔ خودداری ہے۔ خودشناسی ہے۔ خداشناسی ہے۔ فریضے کا احساس ہے۔ حق سے محبت اور باطل سے نفرت ہے۔ عزم ہے۔ امر بالمعروف ہے۔ نہی عن المنکر ہے۔ دلیری ہے۔ شجاعت ہے۔ حق و باطل کا امتیاز ہے اور وہ بھی دشمن کے ایک سردار کی نگاہ سے۔ فطرتِ انسانی کے تقاضے ہیں۔ نفسیات ہے۔ غرض کہ انسانی زندگی کے جتنے پہلو ہیں تقریباً سبھی تو اس واقعے میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک ایک چیز کو اگر براہِ راست بھی بیان کیا جائے۔ بشرطیکہ کہنے والے میں کہنے کا سلیقہ ہو......تو انسان انہیں کے ذریعے تعمیر و ترقی کے بہت سے زینے طے کرسکتا ہے۔‘[۴۰]

نسیم امروہوی کا پہلا مرثیہ اور سماجی محرکات

ہم نسیم امروہوی کے مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ مرثیے کو اس تاریخی واقعے کے توسط سے سماج میں تعمیر و ترقی کا ایک ذریعہ اس طرح بنانا چاہتے ہیں کہ مرثیے کے مضامین اور اس کے خاکے میں وہ پہلو داخل کیے جائیں جن سے یہ مقاصد حاصل ہوسکتے ہیں۔ پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مرثیے میں یہ نئے پہلو اچانک داخل نہیں ہوگئے اس کے محرکات ہیں۔ جن پر ان کی نگاہ ہے۔

اپنے ایک مکتوب[۴۱] میں وہ لکھتے ہیں:

’مرثیے میں زیرِ بحث تبدیلی، افسانہ نویسوں کے افسانوں، نقادوں کے مقالوں، ادیبوں

۴۰۔ سید آل رضا کی مرثیہ گوئی، مشمولہ ارمغان نسیم (کراچی: انجمن سادات امروہہ، فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۲۵۹

۴۱۔ بنام ہلال نقوی، مشمولہ ارمغانِ نسیم ایضاً، ص ۳۴۲

کے تبصروں، شاعروں کے شعروں، نوحہ خوانوں کے نوحوں، نوجوانوں کے ولولوں، کھیل میں اطفال کے حوصلے۔ انگریزوں اور دنیا کی سیاسی الٹ پلٹ کے اثرات سے وجود میں آئی ہے۔ سب سے زیادہ ۱۹۱۷ء کے انقلابِ روس نے ذہنوں کو کچھ اس طرح جھنجوڑا کہ خود بخود شاعر کے قدم اپنی جگہ سے سرک گئے۔ اس زمانے کی جس نظم کا اور جس مضمون کا مطالعہ کرو گے تو اس میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ملے گی جس سے میرے اس شعر کی تصدیق ہوگی جو میں نے اپنے سب سے پہلے مرثیے ۱۹۲۳ء میں کہا تھا:

تھرتھراتے ہیں قدامت کے فلک بوس محل
سنبھل اے رہرو گم گشتۂ ایام سنبھل

نسیم امروہوی نے ۱۹۲۳ء میں 'گلِ خوش رنگ' کے عنوان سے جو پہلا مرثیہ کہا یہ اسی کے دو مصرعے ہیں جنہیں خود انہوں نے نقل کیا ہے اور جس میں وہ اپنے سماج کے افراد سے بہت زور دے کر یہ بات کہتے ہیں کہ 'قدامت کے فلک بوس محل اب تھرتھرا رہے ہیں۔ یہ وقت خود کو سنبھالنے کا ہے ورنہ قدامت کی فلک بوس بلندیاں جب زمین پر آ جائیں گی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ پوری تہذیب اور پورا ماحول ہی اس میں دب کر رہ جائے۔ نسیم نے یہ مرثیہ اپنے سابقہ وطن امروہہ میں لکھا تھا۔ اس مرثیے کا ذکر کرتے ہوئے نسیم کے ایک ہم عصر اور ہم وطن سید تصویر حسین نقوی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"نسیم امروہوی کا پہلا مرثیہ ملک کی اس فضا کا پتہ دیتا ہے جس سے اس دور کے اکثر ترقی پسند تعلیم یافتہ نوجوان متاثر ہو رہے تھے اسی فضا میں ان کی ذہنیت اور کردار نے نشو ونما پائی اور ان کے نظریات کی داغ بیل پڑی اس فضا کے ساتھ ہی نسیم کے گرد و پیش امروہہ کا علمی و ثقافتی ماحول ان کی شخصیت کی تعمیر اور نظریات کی تشکیل میں کارفرما رہا اور اسی نے ان کے ذہن میں وہ مخصوص فکری رجحانات پیدا کیے جنہوں نے ان کے نظریات کو نکھارا ان میں عمومیت کی جگہ خصوصیت پیدا کر دی اور وہ ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے اس انفرادیت کے حامل ہو کر دنیا کے سامنے آئے جو ان کے مخصوص ماحول نے عطا کی تھی۔"[۴۲]

۴۲۔ نسیم امروہوی کے بنیادی نظریات، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمن سادات امروہہ، ۱۹۷۴ء)، ص ۳۳

نسیم کے اس پہلے مرثیے کے ابتدائی چار بندوں سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ مرثیے کو سماجی مسائل سے کس طرح جوڑ رہے تھے:

تجھ میں اے باغ وطن اب گُلِ خوش رنگ نہیں　　کس روش پر گل و بلبل میں یہاں جنگ نہیں
تن پہ کس غنچے کے ہستی کی قبا تنگ نہیں　　طنطنے ہیں وہی ماضی کے وہ اورنگ نہیں
آنکھ باوصف تکدر جدھر اٹھ جاتی ہے
فقر کی شاہی بے ملک نظر آتی ہے

ہائے کیسی یہ ہوا میرے گلستاں میں چلی　　کوئی بے داغ شگوفہ ہے نہ گل ہے نہ کلی
ہر طرف بے عملی بے عملی　　دھوپ بھی سرد مزاجی کے ہے سانچے میں ڈھلی
تھا جو سرمایۂ اسلاف وہ سب کام آیا
آفتاب آج ریاست کا لبِ بام آیا

میں ہوں یا اور جوانانِ فہیم و عاقل　　علم و فن کے ہیں نہ طالب نہ ہنر پر مائل
سب کے سب کسبِ معیشت کی طرف سے غافل　　ہیں فقط ایک فنِ بے ہنری میں کامل
جورِ گردوں کے ستائے ہوئے فریاد میں ہیں
یہ وہ مظلوم ہیں جو عدل[۴۳] کی اولاد میں ہیں[۴۴]

'اس دور کے سماج میں جس جاگیردارانہ ذہنیت نے اپنا قبضہ کر لیا تھا اس کے زیرِ سایہ' لوگ یہ سوچنا بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ دست کاری یا تجارت میں حصہ لیں گے اس لیے کہ وہ ایسے کاموں کو گھٹیا کام تصور کرتے تھے اور ایسے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جو اس رزق حلال میں آگے بڑھنا چاہتے تھے یہ بند ملاحظہ کیجیے:

پختہ کاروں کے سنے کوئی خیالات یہ خام　　دستکاری کو تجارت کو سمجھتے ہیں حرام
کوئی پوچھے جو سبب کہتے ہیں یہ برسرِ عام　　شانِ سادات کے شایاں نہیں یہ ادنیٰ کام
جیتے جی اب تو یہ آثار ہیں سب مرنے کے
فاقے کرلیں گے، مگر کام نہیں کرنے کے

۴۳۔　نسیم امروہوی نے اس مرثیے کے ایک حاشیے میں 'عدل' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ میر عدل ہیں جو اکبرِ اعظم کے دور میں سندھ کے قاضی تھے اور خود نسیم کے مورث بھی تھے۔ بحوالہ مراثیِ نسیم، جلد دوم (کراچی: پاکستان رائٹرس گلڈ، ۱۹۷۶ء)، ص ۲۳۳

۴۴۔　مراثیِ نسیم، جلد دوم، حاشیہ ایضاً

اگر چہ انہوں نے اپنی برادری کی سوچ کو ظاہر کیا ہے لیکن یہ صورتِ حال صرف کسی ایک برادری یا کمیونٹی تک محدود نہیں یہ تو صرف اس فیوڈل ماحول میں رہنے والے تمام مسلمانوں کی حالت کا اظہار ہے مرثیے کے ان ابتدائی بندوں کے بعد جو بند ہیں ان کے بارے میں پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں:

'اگلے بندوں کی کیفیت یہ ہے کہ سب سے پہلے بندوں میں موجودہ دور کے مسلمانوں کی زبوں حالی پر رنج و غم کا اظہار کیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں نہ طلب حق کی خواہش ہے نہ آرزوئے ہنر، وہ کسبِ معیشت کی طرف سے غافل ہیں ہر طرف بے عملی کا دور دورہ ہے اور مسلمانوں کو فاقہ مستی کام سے زیادہ عزیز ہے اور انہوں نے یہ بات قطعاً فراموش کر دی ہے کہ کام ہی مسلمانوں کی میراث ہے اور یہ میراث حضرت ابراہیمؑ، نوحؑ دوادؑ اور کلیمؑ جیسے پیغمبروں سے گزر کر احمد مختارؐ کے گھرانے کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہے۔'[۴۵]

کریم بخش خالد نے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں یہ بات لکھی ہے کہ اردو مرثیے کی تاریخ میں پہلی بار مرثیے کے قدیم تخیل سے ہٹ کر جو مرثیہ ۱۹۲۳ء میں منظر عام پر آیا اس کے مصنف نسیم امروہوی ہیں۔[۴۶] جوش ملیح آبادی کے شعری مجموعے، شعلہ و شبنم، میں 'اسلامیات' کے ذیل میں جو نظمیں ہیں ان میں ایک انقلابی لہر بہت نمایاں ہے یہ مجموعہ ۱۹۳۶ء میں پہلی بار شائع ہوا[۴۷] سید عاشور کاظمی کہتے ہیں کہ نسیم امروہوی نے جوش کی شعلہ و شبنم کی اشاعت سے پہلے ۱۹۲۳ء میں یہ مرثیہ کہا[۴۸] ایک نمایاں فرق جو ہمیں جوش اور نسیم میں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ جوش کا انداز سیاسی زیادہ ہے جبکہ نسیم کے مرثیے میں سماجی پہلو زیادہ اُجاگر ہوتے ہیں۔ نسیم کے اس پہلے مرثیے کے حوالے سے ڈاکٹر محمد رضا کاظمی نے وضاحت کی ہے کہ اس میں سماجی مندرجات، سیاسی مندرجات سے زیادہ اہم ہیں۔[۴۹]

نسیم نے اپنے اس پہلے مرثیے میں گذشتہ نسل اور نئی نسل کے عہد کے فرق سے بحث کرتے ہوئے خلاصے کے طور پر ایک بند میں یہ بات کہی ہے:

۴۵۔ نسیم امروہوی کی مرثیہ گوئی، مشمولہ روزنامہ جنگ کراچی، ۱۹۷۴ء، ص ۸

۴۶۔ سب سے پہلا جدید مرثیہ کس نے کہا، مشمولہ ماہنامہ اظہار کراچی، شمارہ اکتوبر ۱۹۸۲ء، ص ۷

۴۷۔ شعلہ و شبنم (نئی دہلی: کتب خانہ رشیدیہ، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۳۹ء) ص ۲۱۴

۴۸۔ مقدمہ، مشمولہ آغا سکندر مہدی، مرثیہ نظم کی اصناف میں (دہلی: عضیف پرنٹر، ۱۹۹۶ء) ص ۶۳

۴۹۔ جدید اردو مرثیہ (کراچی: مکتبۂ تعمیر ادب، ۱۹۸۱ء) ص ۲۴۶

ان کے وقتوں میں توفق تھا زمینداری سے　　آج عزت ہے جوانمردی و پرکاری سے
عصرِ نو آتا ہے کس دھوم کی تیاری سے　　دن تو دن رات بھی غافل نہیں بیداری سے
فکر ماضی کی، سوئے ملکِ عدم جاتی ہے
لے کے پیغامِ خزاں تازہ بہار آتی ہے

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص۲۳۴)

۸۹ بندوں پر مشتمل اس مرثیے کے ابتدائی ۲۳ بندوں میں نسیم نے ان عناصر کو نمایاں کیا ہے جس سے اس وقت کا سماج دوچار تھا:

عالمِ نزع میں ہے ماضی و حاضر کا نظام
زیرِ شمشیر تڑپتی ہوئی دنیا کو سلام

جس وقت نسیم نے اس مرثیے کا چہرہ لکھا اس وقت ان کی عمر پندرہ برس تھی اس کم عمری میں ان حالات و واقعات پر ان کی نظر اس بدلتی ہوئی سیاسی و تہذیبی فضا کے سبب تھی جو بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ہمیں نظر آتی ہے اور جسے اس وقت کی نئی نسل سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نسیم کے اپنے خاندان میں مرثیے کی ایک مضبوط ادبی روایت موجود تھی جس کا ذکر ان کی سوانح سے متعلق باب میں ہم کر چکے ہیں نسیم نے اپنی خاندانی ادبی روایت سے مرثیے کا فن تو لیا لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید تحریک کے زیرِ اثر جو ایک فکری اور ذہنی تغیر آچکا تھا وہ نسیم کے اپنے اطراف کے ماحول اور ان کے زمانے نے انہیں دیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے وابستہ شعبۂ اردو کے پروفیسر منظر عباس نے علیگڑھ تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

'ابھی تک مرثیے کی صنف میں ادب کے اس اہم رجحان کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی جس کی داغ بیل علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر مولانا حالی نے ڈالی اور جسے بعد میں اقبال نے پروان چڑھایا۔ میری مراد ہے اس ادبی رجحان سے جس نے ادب اور سماج کے رشتوں کو استوار کیا اور یہ بتایا کہ شاعری برائے شاعری نہیں بلکہ اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ قوم کی حیاتِ اجتماعی کو سنوارے اور اس کے اندر بلند اخلاقی اقدار پیدا کرے۔ سچ پوچھیے تو یہ محض ایک ادبی رجحان نہ تھا بلکہ بیسویں صدی شروع ہونے سے پہلے ہی زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ ادب ہو، شاعری ہو، مذہب ہو یہ بات عام طور پر محسوس کی جانے لگی تھی کہ ان سب کا مقصد انسان کی رہنمائی ہونا چاہیے۔ اردو ادب میں اس رجحان کا

اظہار اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب سر سید اور ان کے رفقاء نے اصلاحی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ اس سلسلے میں حالی کا مقدمۂ شاعری اردو شعریات کی دنیا میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیسے ممکن تھا کہ شاعری کی یہ عظیم صنف جسے ہم مرثیہ کہتے ہیں اس رجحان سے متاثر نہ ہوتی۔ چنانچہ سب سے پہلے جس نوجوان شاعر نے قومی مسائل کو مرثیے کا موضوع بنایا وہ نسیم امروہوی مرحوم تھے جنہیں اردو مرثیے کی تاریخ میں ایک رجحان ساز کی حیثیت سے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔[۵۰]

نسیم کے دوسو مرثیوں میں سماجی موضوعات کا تنوع

نسیم نے ۱۹۲۳ء میں پہلا مرثیہ کہا اور ۱۹۸۵ء یعنی ان کی وفات سے دو سال قبل ان کا آخری مکمل مرثیہ منظر عام پر آیا۔[۵۱] ان مرثیوں کی تعداد دوسو سے زیادہ ہے۔ جو محقق خالصتاً ان کی مرثیہ نگاری پر کام کرے گا یقیناً وہ ہی اس کا بہت تفصیلی جائزہ لے سکے گا۔ ہم نسیم کی دیگر عام ادبی خدمات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس باب میں خصوصی طور پر ان کی مرثیہ نگاری کو زیرِ بحث لا رہے ہیں اور ان کی مرثیہ نگاری کے پورے سفر کو سامنے رکھتے ہوئے مجموعی طور پر اس بحث کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں کہ ان کے مرثیوں میں کس طرح اور کن حوالوں سے سماج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ نسیم کی شاعری کے اس پورے دور میں موضوعاتی مرثیے کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ انہوں نے اکثر و بیشتر مرثیوں میں کسی بھی ایک خاص موضوع کو اپنایا ان موضوعات میں سے زیادہ کا تعلق سماجی حالات سے ہے اور پھر اس کا رشتہ وہ مرثیے کی اصل فکر سے ملاتے ہیں۔ مشفق خواجہ نے لکھا ہے کہ:

> 'جدید مرثیے کو موضوعاتی مرثیہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں شاعر کسی خاص موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مرثیے کے اصل موضوع کی طرف توجہ کرتا ہے اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ مرثیہ حیات و کائنات کے گوناگوں مظاہر و مسائل کو بھی سمجھنے کا ایک وسیلہ بن گیا ہے۔'[۵۲]

۵۰۔ جدید مرثیے کا بانی، نسیم امروہوی، مشمولہ نسیم امروہوی ایک تعارف (امروہہ: 'بزم حیات' جنوری ۱۹۹۱ء)، ص ص ۶۹، ۷۰

۵۱۔ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۹۹

۵۲۔ ابتدائیہ، مشمولہ، صبا اکبر آبادی، دوام (کراچی: فرید پبلیشر، اردو بازار، مارچ ۲۰۰۲ء)، ص ۹

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا تجزیہ یہ ہے کہ نسیم نے روایتی مرثیے کو موضوع سے ہم رشتہ کیا۔[۵۳] ہماری نگاہ میں انہوں نے روایتی مرثیے میں جدید موضوعات کی آمیزش سے اپنا ایک علیحدہ میدان قائم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں قدیم و جدید کا ایک ایسا ملاپ ہے جس کا آہنگ ان کی مرثیہ گوئی کے ساٹھ سال کے سفر میں برابر سنائی دیتا ہے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین نے نسیم امروہوی کو قدیم و جدید مرثیہ گوئی کے درمیان ایک پُل قرار دیا ہے۔[۵۴] ڈاکٹر صفدر حسین نے اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار نسیم صاحب پر لکھتے ہوئے اِن لفظوں میں کیا ہے:

'نسیم ایک مشرقی مزاج شاعر ہیں جنہیں اپنے ماضی کی اقدار سے محبت ہے لیکن وہ دورِ حاضر کے تقاضوں اور مستقبل کے اشاروں کی طرف بے خبر نہیں۔ انہوں نے قدیم و جدید دونوں فضاؤں سے اثر قبول کیا ہے۔'[۵۵]

نسیم مرثیے کی ایک خاندانی روایت کے شاعر ہیں وہ اپنے ہم عصر شعراء میں انیس کی طرح واحد مرثیہ نگار ہیں جو اپنے مرثیہ نگار آباؤ اجداد کا تعارف بھی اپنے شعری پس منظر میں رکھتے ہیں۔ لیکن نئے رجحانات، فکری تبدیلیوں اور سماجی شعور کے تعلق سے وہ آج کے دور اور اس کے تقاضوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل لکھتے ہیں:

'نسیم جیسے روایتی مرثیہ نگار نے بھی مرثیے میں سماجی تبدیلیوں سے مفاہمت کر کے اور صورتِ حال کے مطابق اپنے کو ڈھال لینے کی ضرورت پر جو زور دیا ہے پہلے اسے مرثیے کا موضوع کہاں سمجھا جاتا تھا۔'[۵۶]

رئیس امروہوی نے ان کے مرثیوں پر مقدمہ لکھتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا ہے:

'نسیم صاحب کے مرثیے میں عجیب قسم کی پہلودار جاذبیت اور بے پناہ قبولِ عام کی دورخی اور ہمہ گیر کیفیت ہے۔ چنانچہ جو طبقہ انیس و دبیر کے مرثیے کا قائل ہے وہ بھی نسیم کے مرثیے کا لوہا مانتا ہے اور جو عصرِ جدید کے ترقی پسندانہ ادب کا فریفتہ ہے وہ بھی نسیم

۵۳۔ اظہارِ رائے، مشمولہ امید فاضلی، سرنینوا (کراچی: سیپ پبلی کیشنز، فروری ۱۹۸۲ء)، ص ۱۵۰

۵۴۔ اردو مرثیہ نگاری میں جدید رجحانات، مشمولہ پاکستانی ادب، پانچویں جلد (راولپنڈی: فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، جنوری ۱۹۸۲ء)، ص ۸۷۸

۵۵۔ مقدمۂ مراثی نسیم، جلد اول (کراچی: ایجوکیشنل پریس، ۱۹۶۲ء)، ص ۳۱

۵۶۔ مرثیے کی سماجیات (دہلی: خواجہ پریس، جامع مسجد، ۱۹۹۳ء)، ص ۷۹

صاحب کا معترف ہے۔[57]

نسیم کے مرثیوں میں سماجی موضوعات اور دیگر موضوعات کا جو پھیلاؤ ہے اس کا اظہار ان کے مرثیوں کے چہروں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

مرثیے کا چہرہ اور حالاتِ حاضرہ

عہدِ انیس سے عہدِ نسیم تک اس صنف کا جو ایک طویل زمانہ ہمارے پیشِ نظر ہے اس میں مرثیے کے چہرے کی اپنی ایک علیحدہ اہمیت ہے۔ اس میں شاعر کو اختیار ہے کہ وہ جو موضوع چاہے اختیار کرے۔ البتہ ایک اچھے فنکار کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ چہرے میں شامل موضوع کو باقی مرثیے سے اس طرح ربط دے کہ ایک مکمل خیال کی اکائی کا احساس ہو۔ مرثیے کا چہرہ ہی شاعر کے طرزِ فکر کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ انیس و دبیر کے ادراک کا تضاد دیکھنا ہو تو ان کے مرثیوں کے چہروں کو دیکھیے۔[58] مرثیے کے چہرے سے ایک تو شاعر کی فکر کے راستوں اور خطوط کا صحیح اندازہ ہوتا ہے دوسرے ان چہروں میں ایک ایسا ادبی سرمایہ بھی موجود ہے جو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عظیم امروہوی:

> 'اردو مرثیے کو صرف مذہبی نظم کہنے والے اگر صرف مراثی کے چہروں پر غور کریں تو اسے ایک ایسا اعلیٰ اخلاقی، علمی اور ادبی سرمایہ قرار دیں جس نے اردو شاعری کو مالا مال کیا ہے۔'[59]

مرثیے کے چہرے میں کیا کیا موضوعات اختیار کیے جا سکتے ہیں اس کا تعلق شاعر کی اپنی ذہنی رسائی اور تصورِ حیات سے ہے اس میں کسی طرح کی قید و بند نہیں لیکن جیسا کہ ابھی کہا بھی گیا کہ لکھنے والے کی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے موضوع سے اسے اس طرح جوڑ دے کہ مرثیہ بے ربط نہ ہونے پائے انیس کے مرثیے میں مناظرِ صبح یا گرمی کی شدت کا بیان، جوش ملیح آبادی کے مرثیے میں سیاسی پہلوؤں کا تذکرہ اور نسیم کے مرثیے میں سماجی حالات کا اظہار یہ تمام موضوعات ان فنکاروں نے جس خوبی سے مرثیے کے آغاز میں نظم کیے اسی خوبی سے انہوں نے اسے اصل واقعہ اور اس واقعے کے کرداروں سے اس طرح ملا دیا کہ پورا مرثیہ ایک ہی سلسلۂ خیال کی مختلف تصویروں میں ڈھل گیا۔ پروفیسر امیر امام حُر نے لکھا ہے کہ:

۵۷۔ مراثی نسیم، جلد دوم، (کراچی: پاکستان ایڈرس گلڈ، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۲

۵۸۔ ادب کلچر اور مسائل، مرتبہ خاور جمیل (کراچی: پاکستان نیشنل اکیڈمی ۱۹۸۶ء)، ص ۱۰۷

۵۹۔ شمیم امروہوی کی مرثیہ نگاری، مشمولہ ایوانِ اردو دہلی (ماہنامہ)، شمارہ فروری ۲۰۰۵ء، ص ۱۹

’مرثیے کے چہرے میں جو وسعتِ موضوع کے امکانات ہیں وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اس کے موضوع کی نوعیت پر کسی طرح کی قید یا پابندی نہیں بجز یہ کہ اس کا ارتباط خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ سلیقے اور حسن کے ساتھ اصل موضوع سے قائم کیا جائے۔‘[۶۰]

عہدِ حاضر کے مرثیہ نگاروں میں نسیم میں یہ فنکارانہ کمال بہت ہے کہ انہوں نے اپنے چہرے کے کسی بھی موضوع کو بہت خوبی سے اصل موضوع سے ہم کنار کیا ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین کا نسیم امروہوی پر یہ اعتراض درست نہیں کہ نسیم نے مرثیے کو قومی نظم بنا دیا۔[۶۱] نسیم کو یہ مہارت حاصل ہے کہ وہ اپنے طرزِ اظہار، اسلوب اور لہجے سے مرثیت کو کہیں نہیں جانے دیتے یعنی اس صنف کے تقاضوں کو بھی باقی رکھتے ہیں اور عہدِ حاضر کے مسائل و معاملات کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں وہ روایتی مرثیے کے ہم نوا ہونے کے باوجود کسی ادبی جمود کے قطعی قائل نہیں ہیں۔ انہوں نے جب عہدِ شباب میں لکھنؤ میں مرثیے کے ارتقائی سفر میں حصہ لیا تو سب سے پہلے تو بے بنیاد واقعات اور ضعیف روایتوں سے گریز کیا۔ یہ مصرع اسی زمانے کی یادگار ہے:

ہم کیوں لکھیں ضعیف روایت، شباب میں

انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اسی لکھنوی دور کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ:

’اس وقت لکھنؤ میں کئی پرانے مرثیہ گو زندہ تھے جو مرثیے کو جمے ہوئے پنیر کی طرح اپنی جگہ سے سرکنے نہیں دیتے تھے۔‘[۶۲]

نسیم نے مرثیے میں کسی جمود کو تسلیم نہیں کیا اپنے سماج کی روایتوں، ضرورتوں اور مسائل کو نگاہ میں رکھا اور ایک توازن و اعتدال کے ساتھ مرثیے کی صنف میں حالاتِ حاضرہ کی شمولیت کے باوجود اسے مرثیہ ہی رکھا۔ اردو مرثیے کے نقادوں میں اس نکتے پر بھی بحث کی جاتی رہی ہے کہ مرثیے میں یہ توازن کس طرح قائم کیا جائے۔ سید عابد علی عابد اور ڈاکٹر اسد اریب کی تحریروں سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

’مرثیے کی غایت کو ایک حد تک یوں موڑا جائے کہ مُبکی ہونا تو برقرار رہے لیکن امتدادِ زمانہ نے ہماری اخلاقی اقدار کو جس بھٹی میں ڈالا ہے اس کے تقاضے بھی ملحوظ رکھے

۶۰۔ اردو مرثیہ سرائی کی چند امتیازی خصوصیات، مشمولہ طلوعِ افکار کراچی، شمارہ جنوری، ۱۹۷۰ء، ص ۴۴

۶۱۔ مرثیہ بعدِ انیس (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۱ء)، ص ۱۹۴

۶۲۔ سید آلِ رضا کی مرثیہ گوئی، مشمولہ، ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۲۳۸

جائیں۔[۶۳]

'ہمیں اپنی حدِ تمیز کو قائم رکھنا ہوگا۔ نئے مرثیے میں زندگی کے سماجی عمل اور انسانی تاریخ وتمدن کا تذکرہ ضرور ہو مگر حسنِ بیان اور زورِ کلام کے اعتبار سے واقعاتِ شہادت سے آگے نہ بڑھ جائے۔'[۶۴]

درج بالا دونوں نقادوں کے ان بیانات میں جس احتیاط کا ذکر کیا گیا ہے نسیم کے مرثیے میں وہ توازن کے ساتھ نظر آتی ہے۔ مراثی نسیم کے مقدمہ میں نسیم کے مرثیوں کے چہروں پر لکھتے ہوئے رئیس امروہوی نے اس رائے کا اظہار کیا ہے:

'نسیم صاحب عہدِ حاضر کے ذہنی رویے، نسلِ تازہ کے اندازِ نظر اور جدید معاشرتی اور سیاسی رجحانات کی عالمانہ پرکھ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے متعدد مرثیوں کے چہرے میں مسائلِ حیات کے بعض الجھے ہوئے عقدوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور ایسی قادرالکلامی بلکہ نادرالکلامی کے ساتھ کہ مرثیے کی شاعرانہ لطافت کو ذرا بھی گزند نہیں پہنچتی بلکہ حسنِ سخن دو بالا اور تاثیرِ شعر دو چند ہوگئی۔ اس سلسلے میں ان کے پسندیدہ موضوعات ومضامین یہ ہیں: حریت، انقلاب، جہدِ حیات، بقائے اصلح، اجتہادِ فکر ونظر، جذبۂ عزم وعمل، موازنۂ عقل وعشق، طہارت، علم ودانش، اتحادِ ملت، اسلام عالمگیر، اور ہمہ گیر انسانیت وغیرہ، انہوں نے تقلیدی انداز نہیں، اجتہادی اسلوب اختیار کرکے ان مسائل کو نظم کیا ہے جس سے نظم کی عظمت، اور مرثیے کی روایت میں بے مثال اضافے ہوئے ہیں۔[۶۵]

چہرے میں بحث واستدلال کی روایت

نسیم کے مرثیوں کے چہرے میں اگرچہ خالص سماجی وقومی مسائل بھی لکھے گئے ہیں لیکن نسیم نے اسے محض قومی نظم نہیں بننے دیا بلکہ موضوع سے متعلق جو گہری باتیں تھیں، جو فلسفیانہ نکات تھے یا جو کوئی فکری اظہار تھا اسے انہوں نے استدلال کے ذریعے آگے بڑھایا اور یوں بات سلجھتی چلی گئی اور جو بات وہ اپنے قاری تک پہنچانا

۶۳۔ تمہیدی کلمات، مشمولہ، آئینِ وفا، ڈاکٹر صفدر حسین (لاہور: مکتبۂ دانش افروز، ۱۹۶۵ء)، ص ۷

۶۴۔ مقدمہ، مسافتِ شب، کوثر الہ آبادی (کراچی: انجمن سفینۂ ادب، اشاعت اول جولائی، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۶

۶۵۔ جلد دوم (کراچی: پاکستان ریڈرس گلڈ، ۱۹۷۶ء)، ص ۹

چاہتے تھے وہ اس تک پہنچ گئی انیس و دبیر اور نسیم امروہوی کے مرثیوں کے چہرے میں جو موضوعات شامل ہیں ان پر لکھتے ہوئے ڈاکٹر آغا سہیل اپنی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں:

'نسیم امروہوی کے مرثیوں کے چہرے دبیر اور انیس دونوں سے مختلف ہیں، کیونکہ انیس اور دبیر دونوں فطرت نگاری اور منظر نگاری سے چہرے مزّین کرتے ہیں مگر اس فرق کے ساتھ کہ دبیر معّرب اور مفرّس ذخیرۂ الفاظ سے کام لیتے ہیں انیس مفرس اور مہنّد، نیز دونوں کی امیجری میں اگرچہ منظر نگاری اور فطرت نگاری موجود ہے لیکن تشبیہات، استعاروں، علامتوں اور تمثالوں میں فرق ہے۔ دونوں کا مآخذ بھی مختلف ہے، انیس کا مشاہدہ تیز ہے۔ دبیر کا کتابی مطالعے پر دارومدار ہے اور فکر پر مابعد الطبیعاتی اثرات کا غلبہ ہے لیکن نسیم کے مرثیوں کے چہروں میں دونوں سے مختلف خط و خال ابھرتے ہیں جو زمانے کے تقاضے کے مطابق ہیں یعنی چہرے کے بیانیہ حصے میں قدرتی مناظر یا مناظرِ فطرت سے جو متحرک تصویریں حواسِ خمسہ کے حوالے سے بنتی ہیں وہاں نسیم کے چہرے حالاتِ حاضرہ کے کسی موضوع کو بحث و تمحیص اور استدلال سے آراستہ کرتے ہیں۔'[۶۶]

قدرت نقوی نے بھی اپنے ایک مضمون میں یہ نکتہ نمایاں کیا ہے کہ نسیم کے مرثیے فلسفیانہ ہیں اور ان میں حالاتِ حاضرہ نمایاں ہیں[۶۷] ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

'وہ مرثیوں میں آج کے حالات و کوائف، جدید انسان کے مسائل اور اقدار کی شکست و ریخت پر بھی قدری محاکمے دیتے تھے۔'[۶۸]

نسیم اپنے مرثیے کا سماج سے ایک ایسا رشتہ رکھتے ہیں جو سطحی یا سرسری نہیں وہ سماج کے معاملات و مسائل کو سلجھانے کے لیے اور کسی نتیجے تک پہنچے کے لیے ایک پوری ذہنی بیداری کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ وہ وقتی عنوانات پر بھی اظہارِ خیال کر رہے ہوتے ہیں تو اس کے کسی نہ کسی روشن پہلو پر ان کی نظر ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں چہرے میں شامل سیاسی و سماجی موضوع کے پس منظر میں وہ ذہن اُبھر رہا ہوتا ہے جو منطقی استدلال کے بغیر آگے قدم نہیں بڑھاتا۔

'اردو مرثیہ اور پاکستان میں اس کی روایت' کے مصنف نے منطقی استدلال کو نسیم کے مرثیوں کی سب

۶۶۔ نسیم امروہوی اور بیرویٔ انیس، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۶۰

۶۷۔ مقالاتِ قدرت نقوی، مرتب، سید علی اکبر رضوی (کراچی: ادارۂ ترویج علوم اسلامیہ، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۱۷

۶۸۔ اقتباس از بجھی وہ شمع، مرتب شبیہہ الحسن (لاہور: اظہار سنز، جون ۱۹۸۷ء)، ص ۲۶

سے اہم خصوصیت قرار دیا ہے۔'[۶۹] اسی طرح 'نسیم امروہوی اور اصلاح معاشرت' مضمون نگار نے لکھا ہے کہ سماج و معاشرے کے مختلف مسائل کو سمجھنے اور سُلجھانے کے لیے وہ جذبات سے کم اور حقائق سے زیادہ کام لیتے ہیں۔'[۷۰] اور حقائق کے لیے وہ جو طرز اختیار کرتے ہیں اس میں منطقی استدلال کو اولیت حاصل ہے۔

سماج میں عقل پرستی کے رجحانات کی ترویج

نسیم کا مخاطب عصرِ حاضر کا تعقل پسند دماغ ہے خواہ وہ کسی فرقے، کسی مذہب، کسی ملّت اور کسی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا ہو۔[۷۱] لیکن جہاں ان کے مخاطب تعقل پسند دماغ ہیں وہاں وہ سماج کے ان تمام لوگوں سے بھی مخاطب ہیں جو عقل و فکر کی روشنی سے ابھی بہت دور ہیں۔ اوھام اور بے جا رسومات کے جال میں جکڑے ہوئے ان لوگوں کو بھی وہ عقل و شعور کی روشنی میں لانا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے نسیم کو ہم عصر مرثیہ نگاروں کے درمیان ایک عقل پرست مرثیہ نگار قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> 'نسیم امروہوی مرثیہ نگاروں کے درمیان ایک عقل پرست (Rationalist) ہیں۔ یعنی انہوں نے مرثیہ اور علم الکلام کے مابین ایک ایسا تعلق خاطر تلاش کیا جو بڑے اساتذہ کے یہاں اس بنا پر نظر نہیں آتا کہ مرثیے کو وہ محبین اہلبیتؑ کے لیے توشۂ آخرت سمجھتے ہیں جبکہ نسیم امروہوی مرثیے سے علم الکلام کا کام لیتے ہیں۔'[۷۲]

بیسویں صدی میں مرثیے کی نئی ترقی کے حوالے سے ڈاکٹر فہیم اعظمی نے یہ بات لکھی ہے کہ:

> 'خالص مذہبیت اور عقیدت کی جگہ حسنِ اخلاق، عظمتِ انسان اور انقلاب کی باتیں ہونے لگیں اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مرثیے کے نشانیاتی کوڈ میں تبدیلی رونما ہوئی اور اس کی انفرادی اور عقیدتی قدر کی جگہ معاشرتی اور مادی اصولوں پر اس کی ساخت

۶۹۔ پروفیسر ایس، جی عباس (کراچی: اسلامک ریسرچ سینٹر، ۱۹۹۱ء)، ص ۵۹

۷۰۔ ڈاکٹر امام مرتضیٰ، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ سادات امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۰۷

۷۱۔ ڈاکٹر سید طاہر حسین، اردو مرثیہ میر انیس کے بعد (نئی دہلی: ایرانین آرٹ پرنٹر، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۴۵

۷۲۔ نسیم امروہوی تعقل پسند مرثیہ گو، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ سادات امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۸۲

مرتب ہونے لگی۔[۷۳]

نسیم کی فکری بنیادیں

بحیثیت مرثیہ نگار نسیم کی فکری بنیادیں رسولِ آخرؐ، ان کے خاندان اور ان کے اصحاب کی سیرتوں اور ان کے کردار کی عملی صورت پر کھڑی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ پیشِ نظر رہے کہ نسیم کے مرثیے میں جن شخصیات کا ذکر ہے وہ شخصیتیں صرف مذہبی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ تمدنی اور سماجی حیثیت سے بھی تاریخ میں اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہیں۔ انہوں نے اپنے مرثیوں کے اکثر چہروں میں دینِ اسلام کا تعارف اس رخ سے کرایا ہے کہ وہ صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایک مشعلِ راہ ہے:

آزادی و اخوت و انصاف و عقل و دیں اسلام کے اصول یہ ہیں صاف و دلنشیں
روحِ ملوکیت ہے نہ رہبانیت کہیں مافوقِ عقل کوئی عقیدہ یہاں نہیں
شاہی کا تخت ہے نہ حکومت کا تاج ہے
سکّہ خلوص کا تو فقیری کا راج ہے[۷۴]

وہ اپنے معاشرے کے لیے جب بھی زندگی، آگہی اور روشنی کی کوئی مثال تلاش کرتے ہیں تو اسلام کی صالح اقدار اور انبیاء، اولیا اور اصحاب و آل کی سیرت سے فکر کا کوئی نہ کوئی چراغ روشن کر لیتے ہیں اور پھر اس کی روشنی میں اپنے پیغام کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس سفر میں قرآن، تلاشِ حق کا ایک منارہ بن کر ان کے روبرو ہوتا ہے:

تلاشِ حق کی جو اے چشمِ شوق تجھکو ہے دھُن
تو ڈوب قلزمِ قرآں میں اور موتی چُن[۷۵]

ان کے مرثیے میں جو نکتہ بہت مرکزی اہمیت کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ ایک پوری روشن خیالی اور انسان نوازی کے ساتھ دین و مذہب کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ وہ اس دین کے قائل نہیں ہیں جو ایک مصنوعی معاشرے میں رواج پا چکا ہے:

۷۳۔ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ اور اذانِ مقتل پر تبصرہ، مشمولہ صریر، ماہنامہ کراچی، شمارہ مئی، ۱۹۹۶ء، ص ۷۷

۷۴۔ روحِ انقلاب (لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۳۸ء)، ص ۹

۷۵۔ مراثی نسیم، جلد دوم (کراچی: پاکستان رائٹرس گلڈ، ۱۹۷۶ء)، مطبوعہ ۱۹۷۶ء، ص ۹۸

ہوئی ہے فرقہ پرستی کی عام بیماری　　خدا کے نام پہ ملت میں جنگ ہے جاری
جواب دے ہمیں دنیائے زندگی ساری　　پیامِ امن ہے مذہب کہ حکمِ خونخواری
خدا کی خلق کو کیوں آدمی تمام کرے
وہ دین ہی نہیں ہرگز جو قتل عام کرے
وہی ہے چشم بصیرت میں دینِ ربانی　　جو بغض و فتنہ و شر کا ہو دشمن جانی
کرے بحدِ تمدن، صلاحِ انسانی　　تعصبات کے چشموں پہ پھیر دے پانی
بتائے اس کو نظر سے جو امر مشکل ہے
سکھائے صرف عمل سے، یہ حق وہ باطل ہے
وہی ہے دین حقیقت میں انقلاب انگیز　　جسے ہو عدل سے رغبت تو ظلم سے پرہیز
ہمیشہ خلق کا پہلو، مجادلے سے گریز　　ہر ایک لفظ ہو زخشِ خیال کو مہمیز
یہ کیا کہ رخ پہ فقط رنگ اضطراب آئے
مزہ تو جب ہے کہ روحوں میں انقلاب آئے

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص ۳۱۸)

جس مقدس اور معزز گھرانے کو وہ سماج کے لیے ایک مثال بناتے ہیں اس کی سیرت کے ان پہلوؤں کو وہ زیادہ اُجاگر کرتے ہیں جن سے محنت، ریاضت اور رزقِ حلال کی تعلیم ملتی ہے۔ مختلف مرثیوں سے ہم چند اقتباس نقل کر رہے ہیں:

وہ دیکھو چشم تصور ذرا جھکائے ہوئے　　کھڑے ہیں کون پسینے میں یہ نہائے ہوئے
وہ ہیں بغل میں نبیؐ بیلچہ دبائے ہوئے　　وہ بوتراب ہیں مٹی کا بوجھ اٹھائے ہوئے
کما رہے ہیں وہ محنت سے شام کی روزی
کہ جن کے ہاتھ میں ہے خاص و عام کی روزی

(مراثی نسیم، جلد اول، ص ۱۲۰)

ہاتھ خالی ہے مگر علم سے معمور بھی ہیں
حق کے معمار بھی ہیں، باغ میں مزدور بھی ہیں

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص ۳۱۸)

بغیر نظم معیشت محال تھا جینا   تو اک دعا میں یہ کہہ کر دکھایا آئینہ
الٰہی مجھ کو عطا کر وہ دیدۂ بینا   کہ دخل و خرچ کا پہلے بناؤں تخمینہ

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص۲۲)

حیات قوی کے ضامن تھے جو امورِ عظیم   دعا میں ان کی بھی ڈنکے کی چوٹ دی تعلیم
کفیلِ قوت و طاقت جو زر کی ہے تقسیم   یہ چاہتی ہے معاشی و عسکری تنظیم

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص۲۲)

جس پسینے کی تری خاک کا دل کردے شق   خون سے بھی ہے گراں قدر وہ دہقاں کا عرق
اس کی ہر بوند میں رقصاں ہے وہ نعمت کا طبق   جس کو ہم کہتے ہیں روزی جو ہے انسان کا حق

کام اس کام سے بڑھ کر کوئی لاریب نہیں
کسب روزینۂ روزانہ تو کچھ عیب نہیں

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص۹۸)

یہ اتحاد، یہ تنظیم یہ یقین جو آج   زمانے بھر میں ہے قائم فقط بطور رواج
نہ شاعروں کی ہے جدت نہ قائدوں کا مزاج   ہے اس کی فکر جو تھا ابن صاحبِ معراج

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص۱۰۱)

نسیم کی فکری بنیادوں میں کربلا کے شہیدوں کے کردار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں وہ عالمِ انسانیت کے لیے ایک صبحِ بیدار قرار دیتے ہیں:

دل میں تھا ہر شمع کے قلب بشر کا سوز و ساز   اور نسیم نینوا میں کیفِ خوشبوئے حجاز
رفتہ رفتہ آ گئی وہ اک شب تاریخ ساز   جس کے سینے میں بہتر تھے دل انساں نواز

کفر سوز و حق فروز مطلع انوار تھی
عالمِ انسانیت کا طالع بیدار تھی

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص۶۸)

جہاں میں تیری شہادت سے حق ہے وابستہ　　ریاض دیں کا ہے تو اک جمیل گلدستہ
ہوا تھا قافلۂ کائنات دل خستہ　　دکھا دیا ترے مقتل نے عزم کا رستہ
حیاتِ نو کو پیام عمل دیا تو نے
نظامِ فکر و نظر کو بدل دیا تو نے
(مراثی نسیم، جلد اول، ص ۱۰۱)

سماج میں ارتقا کا پیغام

جن شخصیات اور جن کرداروں کا ذکر کیا گیا انہیں نسیم اپنے سماج کے لیے ایک ایسی مشعلِ راہ قرار دیتے ہیں جن کی رہنمائی کسی نہ کسی مشکل کا کوئی حل تلاش کر لیتی ہے۔

وہ اپنے عہد میں پیشوائی کرنے والی شخصیات سے مایوس ہیں:

عقلا جو ہیں وہ رکھتے نہیں علمِ معقول　　حکما کا نظریہ ہے حکومت کا حصول
فضلا سمجھے ہیں تحصیلِ فضیلت کو فضول　　رہ گئے اب علما چپ ہیں بحسب معمول
(مراثی نسیم، جلد دوم، ص ۱۱۵)

نسیم کے مرثیوں سے ہمیں یہ احساس نمایاں طور پر ہوتا ہے کہ وہ مسلم معاشرے کی تباہ حالی سے بہت دل گرفتہ ہیں۔ ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ جب عقلا، حکما، فضلا اور علما ہی 'صراطِ حق' سے ہٹ چکے ہیں تو پھر عوام الناس کی رہنمائی کون کرے؟ اور جب یہ رہنمائی حاصل نہیں ہو سکے گی تو پورا معاشرہ بکھرتا چلا جائے گا۔ اس کی اقتصادیات، فلاح و بہبود اور سماجی حیثیت تمام کی تمام اس تباہ حالی کی لپیٹ میں آ جائے گی۔ انہوں نے اپنے مرثیوں میں مسلمان کے اس ذہن کو بہت جھنجھوڑا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ عبادات ظاہر ہی اسے جنت میں لے جائے گی وہ قولِ رسولؐ سے اس بات کی طرف دلوں کو مائل کرتے ہیں کہ معاشرتی ترقی اور فلاح انسانیت کے لیے پہلے حقوق العباد ہیں پھر عبادت حق ہے:

نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ و خمس و جہاد　　تمہیں جو رہ گئے لے دے کے چھ فریضے یاد
غضب کی جا ہے کہ بھولے نبی کا یہ ارشاد　　کہ ہے عبادت حق بعد، پہلے حق عباد
ہر اک اطاعت خالق کی ہے قضا ممکن
یہ فرض ہو جو قضا پھر ادا ہے ناممکن
(مراثی نسیم، جلد اول، ص ۱۰۵)

۱۹۴۲ء میں نسیم نے کشمکش کے عنوان سے ایک مرثیہ لکھا جس کے بندوں کی تعداد ۱۲۱ تھی۔ اس مرثیے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ شاعر کو اس بات پر بہت تکبر ہے کہ وہ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے اور اس صلے میں یقینی طور پر جنت اس کی میراث ہے نسیم نے اس مرثیے میں خود کو ایک کردار بنا کر پیش کیا ہے اور اس آئینے میں اپنا احتساب کیا ہے۔ مرثیے کا بنیادی پلاٹ یہ ہے کہ شاعر ایک خواب دیکھتا ہے کہ وہ جنت کے دروازے پر پہنچ چکا ہے اور اپنی عبادتِ ظاہر کے نشے میں قدم اٹھاتا ہوا بے دھڑک جنت میں داخل ہونا چاہتا ہے کہ ایسے میں رضوانِ جنت کی آواز اسے روک لیتی ہے۔ اس طویل مرثیے کے صرف ۸ بند ہم یہاں پیش کر رہے ہیں:

گو کہ اس عالم حیرت میں نہ تھے ہوش بہم　　تھا مگر دل میں تپاں ولولۂ سیرِ ارم
در کے اندر ابھی رکھنے بھی نہ پایا تھا قدم　　ناگہاں آئی اک آواز کہاں جاتا ہے تھم
کھینچ لائی ہے تصور کی جسارت تجھ کو
داخلے کی نہیں جنت میں اجازت تجھ کو

بولا میں، کون ہے یہ مانع ایوان ارم　　آئی آواز کہ یہ میں ہوں نگہبانِ ارم
مسکرا کر یہ کہا میں نے کہ رضوانِ ارم　　مجھ پہ ممنوع ہے کیوں سیر گلستانِ ارم
اہل جنت کو ہے ماضی کا تصور باقی
کیا ابھی ہے بنی آدم سے تنفر باقی

میری اس طنز پہ رضواں نے صدا دی یہ وہیں　　اہل جنت کی کوئی تجھ میں علامت ہی نہیں
عرض کی میں نے کہ یہ شکل تقدس آگیں　　یہ مرا خرقۂ اسلام یہ پیرا ہنِ دیں
داغ سجدہ ہے عیاں جبہہ نورانی پر
نقش ہے زہد و ورع کا مری پیشانی پر

میرے چہرے پہ نظر ڈال کے رضواں نے کہا　　بارک اللہ یہ پُر مکر لباسِ تقویٰ
سجدۂ زہد ریائی کا جبیں پر دھبا　　ظاہری شکل و شباہت کی کشش، کیا کہنا
روح بھی پاک ہے کیا جامۂ تقویٰ کی طرح
دل بھی پُر نور ہے ریش رُخِ زیبا کی طرح

سن کے یہ طعنۂ جانکاہ ہوا دل جو کباب　　میں نے دامن کو جھٹک کر کہا، سنیے تو جناب
اللہ اللہ سخن نرم کا یہ سخت جواب　　کیا نہیں علم میں بندے کی نمازوں کا حساب
نہ کوئی عابد شب خیز و مصلی ہوں میں
گھر کی مسجد ہے کہ جس کا متولی ہوں میں
میں یہ سمجھا تھا عبادت کا تو کچھ ہوگا اثر　　مگر اللہ رے اس نیک فرشتے کی نظر
مجھ سے بولا، یہ دلیلیں ہیں فروعی یکسر　　اصل پر زعم تقدس میں لگا دی ٹھوکر
حق جو بندوں کے ہیں واجب وہ چکائے تم نے
یا فقط ڈھونگ ہی تقویٰ کے رچائے تم نے
ناقدانہ کبھی طاعت پہ نظر بھی ڈالی　　ایک سجدہ بھی نہ تھا مکر وریا سے خالی
یہ تو عالم ہے نمازوں کا جنابِ عالی　　رہ گیا صوم، وہ اسلاف کی تھی نقالی
پاؤں کب جادۂ تسلیم و رضا پر رکھا
روزے رکھے بھی تو احسان خدا پر رکھا
مقصد صوم کا اک دن بھی ہوا کچھ احساس　　بھوک کا فاقہ کشوں کی بھی کیا ہے کبھی پاس
کب ہوئے سوختہ جانوں کے تصور سے اُداس　　تم کہاں اور کہاں گردو غبار افلاس
وقت افطار گدا کا کبھی عقدہ کھولا
پھر مزہ یہ ہے کہ لذات پہ روزہ کھولا[۷۶]

رسوم بد میں پھنسے، ارتقا کو بھول گئے

سماج میں ارتقا کی راہوں میں جو بنیادی رکاوٹیں ہیں نسیم اس کے ازالے کے لیے جن تدابیر پر اصرار کرتے ہیں ان میں سب سے پہلے ان رسومات واوہام سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہے جس نے معاشرے کی بنیادیں کمزور کر دی ہیں اور اس کے لیے ہر شخص کو اپنا فریضہ ادا کرنا چاہیے ان کے نزدیک معاشرے میں رہنے والے کسی بھی اچھے فرد کی پہچان یہ ہے کہ وہ افراد کی بہبود کے لیے اٹھ کھڑا ہو چاہے اس کو اس راہ میں کتنی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے:

۷۶۔　کشمکش (لکھنؤ: سرفراز قومی پریس، ۱۹۴۲ء)، ص ص ۷، ۸

شوکت و حشمت و جاہ و حشم و دولت و مال
بہرِ بہبودِ بشر اس کا ہو سب کچھ پامال
(مراثی نسیم، جلد دوم، ص ۵۰)

نسیم کے نزدیک مرثیہ محض ایک رسم یا ایک روایتی فریضہ نہیں بلکہ یہ ان کی ذات اور ان کے ذہن کا حصہ ہے۔ وہ جن شخصیات کے ذکر سے اپنے مرثیے کو آراستہ کرتے ہیں اگر ان کو ماننے والے اور ان کا مرثیہ سننے والے ان شخصیات کی تعلیمات سے اپنے معاشرے میں فلاح و بہبود کے دروازے نہ کھول سکیں تو پھر ان کی نظر میں یہ مرثیہ نگاری ایک فضول کام ہے:

ہم ان کے شیوۂ صبر و رضا کو بھول گئے
رسومِ بد میں پھنسے، ارتقا کو بھول گئے

ان کے مرثیوں کے بعض بندوں میں رسوم بد کی تفصیلات موجود ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے:

بوقت رخصت دختر ہے بخت کا رونا — وہ قرض لے کے مہیا جہیز کا ہونا
وہ ایک گھر کے بسانے کو ایک گھر کھونا — حرام وہ زر و زیور کی فکر میں سونا
یہ خودکشی ہے سراسر، ادائے فرض نہیں
متاعِ زیست کو گھن لگ گیا ہے قرض نہیں
(مراثی نسیم، جلد دوم، ص ۳۲۴)

معاشرے میں پست زندگی گزارنے والوں سے لاتعلقی کو وہ عقل کا افلاس قرار دیتے ہیں:

ہمیں غریبوں کی حالت کا کچھ نہیں احساس
یہ بے حسی ہے حقیقت میں عقل کا افلاس

سازِ حریت میں عمرانیات اور معاشیات کے اصلاحی مضامین

۱۹۸۱ء میں سکھر سے نسیم کا ایک نایاب و یادگار مرثیہ از سرِ نو شائع ہوا۔ سازِ حریت کے عنوان سے اس مرثیے کی پہلی اشاعت ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ سے ہوئی تھی۔ پاکستان میں اس کی دوبارہ اشاعت کا ایک سبب اس کے ناشر نے یہ بھی قرار دیا ہے کہ کیوں کہ اس مرثیے میں تقاضائے وقت اور جدید رجحانات کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور

مرثیے کی صنف میں کیوں کے پہلی بار یہ باتیں سامنے آئی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ اسے ہم اپنے لوگوں اور اپنے معاشرے تک بھی پہنچائیں۔ ۷۷ حالی نے مقدمۂ شعروشاعری میں انیس کے مرثیے کو پوری اردو شاعری میں نئی طرز کی نظم کہہ کر یاد کیا تھا ۷۸ جعفرعلی خاں اثرنسیم صاحب کے اس مرثیے کو نئی طرز کا مرثیہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ 'یہ نئے طرز کی کامیاب مرثیہ گوئی ہے جس کا خیرمقدم ہر شخص کا فرض ہے۔' ۷۹

آخر یہ نیا طرز کیا ہے جس کے خیرمقدم کے لیے جعفرعلی خاں اثر نے کہا ہے۔اس مرثیے کے آغاز میں سینٹ جانس کالج آگرہ کے اُس وقت کے پروفیسر مولانا حامد حسن قادری کا جوتبصرہ شامل ہے اس کا یہ اقتباس اس نئی طرز پر روشنی ڈالتا ہے:

'یہ نظم 'سازِ حریت بلاشبہ نہایت معرکہ آرا ہے اور میرے نزدیک کوئی وجہ نہیں کہ اس کو معرکتہ الآرا نہ کہا جائے بلکہ بالاتفاق اختراع بدیع اور اجتہاد جدید ماننے کے قابل ہے۔ یہ میں نے اس لیے لکھا کہ مرثیے کی قدیم وضع وساخت کے خوگرد شائق حضرات 'سازِ حریت' کے موضوع سے زرا چونکیں گے لیکن میری رائے میں نسیم صاحب نے مرثیہ د مجلس، شعروادب، قوم و ملک سب کی بالکل صحیح نبض شناسی کی ہے بلکہ بعض بعض کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے۔' ۸۰

جعفرعلی خاں اثر اس مرثیے کے بیشتر حصے کے ذیل میں لکھتے ہیں:

'مرثیہ کا بیشتر حصہ ان رسوم ذمیمہ وافعال قبیحہ کو بڑی خوش اسلوبی سے مردود قرار دیتا ہے، جو بدقسمتی سے اسلام کا جزو سمجھے جانے لگے ہیں، حالانکہ اصل مذہب سے انہیں دور کی بھی نسبت نہیں۔ مثلاً اسلام کے مختلف فرقوں کی باہمی آویزش، دوسرے مذہب والوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر مجادلہ و مناقشہ، شادی بیاہ کے موقع پر بیجا مصارف وغیرہ وغیرہ۔' ۸۱

۷۷۔ اختر دہلوی، ابتدائیہ سازِ حریت (سکھر: اختر پریس، ۱۹۸۱ء عکسی ایڈیشن)، ص۲

۷۸۔ مقدمہ مع دیوانِ حالی (کانپور: نامی پریس، ۱۸۹۳ء)، ص۱۸

۷۹۔ دیباچہ مشمولہ سازِ حریت (لکھنو: ادارۂ اردو خیالی گنج، ۱۹۴۲ء)، ص(ہ)

۸۰۔ سازِ حریت ایضاً، ص(ب)

۸۱۔ سازِ حریت ایضاً، ص(ح)

رشید احمد صدیقی نے نسیم امروہوی کے نام ایک خط (مورخہ ۱۳؍دسمبر ۱۹۴۲ء علی گڑھ) میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

'سازِ حریت میں نے شروع سے آخر تک مطالعہ کیا اور اس کے بارے میں مختلف بلند پایہ ادیبوں نے جو کچھ اظہار خیال کیا ہے اسے بھی پڑھ گیا مجھے سب سے زیادہ اچھا بیان اثر صاحب کا معلوم ہوا۔ اثر صاحب نے ابتدائی تین سطروں میں جو کچھ کہا ہے وہی سب کچھ ہے۔'[۸۲]

رشید احمد صدیقی نے اثر صاحب کی جن تین ابتدائی سطروں کو سب کچھ قرار دیا ہے وہ تین ابتدائی سطریں اثر صاحب کے اس پیراگراف میں موجود ہیں۔ ان سطروں سے مرثیے کے ذیل میں رشید احمد صدیقی کے نقطۂ نگاہ کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے:

'مرثیہ کو اگر زندہ رکھنا ہے تو زمانے کے ساتھ اس کا بھی رنگ بدلنا ہوگا اور بجائے واقعات کے فلسفۂ واقعات بیان کرنے کی ضرورت روز بروز زیادہ شدت سے محسوس ہوگی کربلا کے عظیم الشان کارناموں کا مرکز ثقل بدل جائے گا۔ حسین کی مظلومی اور بیکسی کا افسانہ سنا کر رونے اور رُلانے کا مقصود پیش پیش نہ رہے گا، بلکہ اس امر پر زور دینا ہوگا کہ اس دلبند رسول نے حق کی حمایت میں سب کچھ قربان کر دیا اور اس طرح صرف اسلام کو نہیں بلکہ انسانیت کو فنا ہونے سے بچا لیا۔ اس خیال میں بھی انقلاب پیدا کرنا ہوگا کہ یہ جو کچھ ہوا 'امت گناہگار' کی بخشش کے لیے نہیں ہوا بلکہ باطل کا سر کچل دیا گیا، انسانیت کو لا فانی سبق ملا، ہر طبقہ اور ہر عمر اور ہر ملّت کے افراد کے لیے ایک بے مثلی دستور العمل مرتب ہوا۔ کربلا کا ہر واقعہ، ہر ایثار مکمل انسانوں کا ایسا دلکش مرقع ہے جس کے نقش و نگار ابدالآباد تک اُجاگر رہیں گے مجھے خوشی ہوئی کہ حضرت نسیم امروہوی نے صحیح اصول کے ماتحت مرثیہ نگاری شروع کی ہے ان کی زیر نظر تصنیف 'سازِ حریت' اس کی روشن مثال ہے۔'[۸۳]

۸۲۔ بحوالہ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، ڈاکٹر ہلال نقوی (کراچی/لندن: محمدی ٹرسٹ، فروری ۱۹۹۴ء)، ص ۵۱۰

۸۳۔ سازِ حریت (لکھنؤ: اردو خیابانی گنج، ۱۹۴۲ء)، ص (ج)

مرثیے میں ترقی پسندانہ طرزِ فکر

پروفیسر ممتاز احمد جو سازِ حریت کے مقدمہ نگار ہیں انہوں نے بہت تفصیل سے اس مرثیے کی صفات پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں بہت اہمیت کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ جو کام دس ہزار واعظ اور دس لاکھ خطیب انجام نہیں دے سکتے وہ ایک ترقی پسند مرثیہ گو انجام دے سکتا ہے یہ اقتباس دیکھیے :

> ہم ڈنکے کی چوٹ یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ اگر چہ یہ صنف علم واخلاق کا بہترین اوراعلیٰ ترین مجموعہ ہے مگر عمرانیات اور معاشیات کے اصلاحی مضامین سے اس کا خزانہ ابھی تک خالی تھا درحقیقت ہمارے مرثیہ گویوں نے اب تک اس فن شریف سے وہ کام ہی نہیں لیا جس کی تکمیل کے لیے یہ قدرتی اور فطری تحریک سے عالم ظہور میں آیا تھا۔
>
> ہم فقط جسمانی حیثیت سے ہی نہیں، ذہنی اور دماغی اعتبار سے بھی غلام بن چکے ہیں۔ مغرب کی مادی اور مشینی تہذیب، جو اقبال کے لفظوں میں اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کر رہی ہے، ہم پر چھا چکی ہے۔ ہم اپنی روح کو گنوا چکے ہیں۔ اپنی قومی سیرت کو ضائع کر چکے ہیں۔ ہمارے تاریخی خصائص، ہماری دیرینہ روایات، ہمارا نہ مٹنے والا عزم، ہمارا نہ فنا ہونے والا جذبہ، غرض وہ سب کچھ جو ہماری کامیابی کی ضمانت تھا، آج ہمارے پاس سے نکل چکا ہے۔ کیا ہمارے مرثیہ گویوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ حسینی سیاست کے اسرار دنیا کو سکھائیں اور معاشی ترقی کے گُر اور معاشرت کے راز عالم پر منکشف کریں جن تباہ کن رسوم کا ہم شکار ہیں ان پر سرزنش کریں، اسلامی اُخوت اور عالمگیر رواداری کا جو نمونہ رسول و اولادِ رسولؐ واصحاب رسولؐ نے پیش کیا تھا اس سے ہم کو باخبر و آگاہ کر کے اس پر گامزن ہونے کی اسی موثر لہجے میں تلقین کریں جو قومی تعمیر کا ضامن یعنی شاعر کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔
>
> بیشک دس ہزار واعظ اور دس لاکھ خطیب وہ کام انجام نہیں دے سکتے، جو ایک ترقی پسند مرثیہ گو انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس شعر کا جادو ہے اور نظم کی کرامت ہے۔ شاعر بشرطیکہ وہ متشاعر نہ ہو، ہمیشہ انقلاب پسند اور رجعت دشمن ہوتا ہے۔[۸۴]

۸۴۔ سازِ حریت (لکھنو: ادارۂ اردو خیالی گنج، ۱۹۴۲ء) ص۲

پروفیسر ممتاز احمد نے ۱۹۳۸ء میں یہ مقدمہ تحریر کیا تھا یعنی ترقی پسند تحریک کے آغاز (۱۹۳۶ء) کے انتہائی قریبی زمانے میں انہوں نے یہ خیالات اس تبصرے میں لکھے آخر میں اس بات کو نمایاں طور پر جگہ دی کہ معاشرے پر اثر انداز ہونے اور اس کے مسائل و معاملات کو بہتر طور پر پیش کرنے کے اعتبار سے جو کام ایک ترقی پسند مرثیہ گو (مقدمہ نگار کے نزدیک نسیم امروہوی) انجام دے سکتا ہے وہ بڑے بڑے خطیبوں اور واعظوں کی ایک بڑی تعداد بھی انجام نہیں دے سکتی۔ شعر و ادب کی تاریخ میں ۱۹۳۶ء کے بعد ہم جس طرح غزل، نظم، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور تنقید میں ترقی پسندی کے رجحانات تلاش کرتے ہیں اسی طرح مرثیے میں بھی اس رجحان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے مرثیے میں ترقی پسند فکر کے حوالے سے جوش ملیح آبادی کا نام یقیناً سب سے پہلے لیا جاتا ہے لیکن جوش کی ترقی پسندی سیاسی حوالوں سے زیادہ منظر عام پر آئی ہے جبکہ سماج میں فلاح و بہبود، معاشی انقلاب اور اسلامی رسوم و روایات کی قید و بند سے آزادی کے اعتبار سے نسیم کا مرثیہ ایک ایسی انفرادیت رکھتا ہے جس کی ترقی پسندی کا مزاج سب سے الگ ہے ہم جس مرثیے کے پس منظر میں یہ بات کر رہے ہیں وہ ۱۹۳۸ء کی تصنیف ہے یعنی ترقی پسند تحریک کے دو سال بعد کی تصنیف۔ جبکہ رئیس امروہوی ان کے پہلے مرثیے یعنی ۱۹۲۳ء کے لکھے ہوئے مرثیے کی بنیاد پر ہی نسیم کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں:

> 'جہاں تک مرثیے میں ترقی پسند مکتبۂ فکر کا تعلق ہے تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نسیم صاحب دنیائے مرثیہ میں اس دبستان سخن کے بانیوں میں ہیں جیسا کہ ۱۹۲۳ء کے کہے ہوئے مرثیے سے ظاہر ہے یعنی اردو ادب میں باضابطہ ترقی پسند تحریک شروع ہونے سے تیرہ سال پہلے نسیم نے اردو مرثیے کو اس انداز نظر سے آشنا کیا تھا۔'[۸۵]

یہ شاعری نہیں باتیں ہیں کام کی سنیے

نسیم اپنے ادبی پس منظر اور اپنی شعری ریاضت و تربیت کے اعتبار سے ایک ایسے مرثیہ نگار شاعر کہے جاتے ہیں جن کے یہاں زبان و بیان کی لطافتوں، صنعتوں اور رعایتِ لفظی کی خوبیوں، ندرتِ خیال اور شاعری کے حسن و کشش پر بھی زور دیا جاتا ہے لیکن بیسویں صدی کی بدلتی ہوئی اقدار نے ان کے ادبی نظریات کو سماجی حالات سے مشروط کر دیا۔ وہ کربلا کے الم انگیز واقعے پر تو مرثیہ لکھ ہی رہے ہیں لیکن سماج جس انتشار کا شکار ہے اور افراد جن اسباب کی وجہ سے سماج میں رہتے ہوئے بھی سماج کے بکھر جانے کا سبب بن رہے ہیں اسے

۸۵۔ مقدمہ مراثی نسیم، جلد دوم (کراچی: ریڈرس گلڈ، ۱۹۷۶ء)، ص ص ۱۱، ۱۲

بھی وہ داستانِ الم قرار دیتے ہیں:

یہ داستانِ الم خاص و عام کی سنیے
نظر سے دیکھی ہوئی صبح و شام کی سنیے
نہ داد دیجے چاہے کلام کی سنیے
یہ شاعری نہیں باتیں ہیں کام کی سنیے

(سازِ حریت)

ڈاکٹر سید محمد عقیل لکھتے ہیں:

'جو لوگ ادب کو جہادِ زندگی میں محض لطف لینے اور محفل آرائی کی چیز سمجھتے ہیں اور ادب کو تبدیلی کا آلۂ کار، وقت کا مقیاس اور زندگی کی پیش کش کا ہتھیار نہیں سمجھتے انہیں اس بات پر حیرت ہو سکتی ہے کہ مرثیہ جیسی صنف جوان کے خیال میں محض واقعاتِ غم کے اظہار کے لیے ہے اور جو بطورِ خاص واقعاتِ کربلا اور غم و مصائب اہلبیتِ اطہار تک (ان کے خیال میں) محدود ہو اسے کسی فکری، سیاسی، تہذیبی و سماجی تبدیلی سے کیا رابطہ ہو سکتا ہے۔'[۸۶]

نسیم امروہوی اپنے مرثیے میں ان تبدیلیوں سے باخبر رہے ہیں بقول عاشور کاظمی:

'نسیم امروہوی نے عصری تقاضوں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا ہے اور ایک باشعور کی طرح اپنے عہد کا ادراک کرتے ہوئے شعر کہے ہیں۔'[۸۷]

فراتِ دہر کا پانی سب ہی کو پینے دو

نسیم کا اپنے پہلے مرثیے گل خوش رنگ ۱۹۲۳ء سے سازِ حریت ۱۹۳۸ء تک کا سفر پندرہ سالوں پر محیط ہے۔ وہ اس دور کے تمام مرثیوں میں سماج اور انسانیت کے اجتماعی مفادات کو بہت اُجاگر کرتے رہے ہیں۔ اردو مرثیے کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ مرثیہ اگر چہ کسی کی موت پر لکھا جاتا ہے لیکن وہ مرثیے جو واقعاتِ کربلا سے متعلق ہیں وہ کسی ایک فرد کی موت پر ہوتے ہوئے بھی ایک اجتماعی نقصان کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ایک خاندان کے گزر جانے کا اظہار ہوتا ہے۔ یوں بھی مرثیہ کیوں کے داخلی نہیں خارجی شاعری سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں شاعر اپنی ذات کی نفی کر دیتا ہے اور دوسرے افراد کو بلکہ پورے معاشرے اور پوری انسانیت کو

۸۶۔ جوش کی مرثیہ نگاری پر کچھ باتیں، تناظر، سہ ماہی، دکن، شمارہ ۲۸/۲۹، ص ۳۴

۸۷۔ اردو مرثیے کا سفر (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء)، ص ۴۹۹

اپنی بحث اور اپنی شاعری کا حصہ بناتا ہے اس لیے انفرادی سے زیادہ اجتماعی مفادات اس کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ سید محمد رشید درد نے اپنے ایک مضمون میں یہ بات لکھی ہے کہ مرثیہ گوئی کا آنے والا زمانہ اس لیے درخشاں ہوگا کہ یہ وقت کے تقاضوں اور حیاتِ اجتماعیہ کو موضوعِ سخن بنائے گا۔ برطانوی دور اور بیسویں صدی کی بعض سیاسی تبدیلیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

'اب دنیا اشتراکیت اور سوشلزم کے دور میں قدم رکھ چکی ہے۔ انفرادی رنج وغم اور تباہی و بربادی کا ماتم لایق اعتنا نہیں ہے، حیاتِ اجتماعیہ پر مٹنے اور برباد ہونے والے کا اب دنیا ماتم کرے گی، ماضی کے شہیدوں کو اسی حد تک یاد کیا جائے گا۔ جس حد تک کہ وقت کو ضرورت ہوگی ماضی کی روشنی میں، حال کے نقوش دنیا کو دکھائے جائیں گے، ماضی کو تمہید اور حال کو مدعا ٹھہرایا جائے گا۔ اس حیثیت سے ذکرِ حسینؑ اور مصائب کربلا کا اظہار رسمی ہوتے ہوئے بھی غیر مفید نہیں ہوگا۔ نمونے کے طور پر امام حسینؓ اور شہدائے کربلا کا تذکرہ، حال کے شہدائے وطن اور ظالمیت کے خلاف مجاہدین کی موت کے ذکر میں شدت تاثیر کا سبب بن سکتا ہے۔ رسمی عزاخانے میں اگر اس نہج پر مرثیہ خوانی ہو تو جماعت اور سماج کو کافی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بہر حال وقت کے تقاضوں کو پسِ پشت نہیں ڈالا جا سکتا ہے۔ اردو ادب عام رجحانات کا ترجمان بن چکا ہے۔ اس لیے اردو ادب کا مستقبل شاندار اور مرثیہ گوئی کا آنے والا زمانہ درخشاں ہے۔'[۸۸]

نسیم کی فکری بنیادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم نے گذشتہ صفحات میں لکھا ہے کہ نسیم قرآن و اسلام کے ان احکامات کو مرثیے میں ہمیشہ اُجاگر کرتے ہیں جن کا مقصد حیاتِ اجتماعی کی تشکیل و ترقی ہے۔ اشتراکیت و سوشلزم ان کے پیشِ نظر ہو یا نہ ہو لیکن اصلاحِ رسوم، حقوق العباد، شخصی و اجتماعی اخلاق اور تمام انسانیت کی فلاح کے لیے وہ اسلامی اقدار کو اولیت دیتے ہیں۔ معاشرے کے تمام افراد کو وہ اس بات پر مائل کرتے ہیں کہ وہ فکر و نظر سے کام لے اور قرآن سے یہ روشنی اخذ کرے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ بات کہی ہے کہ:

'قرآن میں جا بجا خلق عالم میں تدبر و تفکر کا حکم آیا ہے مرثیہ میں جہاں جہاں موقع ملے اس حکم کی تعمیل کی جائے۔'[۸۹]

۸۸۔ مرثیہ گوئی اور اس کی تدریجی ترقی، مشمولہ نگار، شمارہ اگست ۱۹۵۲ء، ص ۲۰

۸۹۔ مشمولہ، ہلال نقوی، جدید مرثیے کے تین معمار (کراچی: پاکستان رائٹرز گلڈ، دسمبر ۱۹۷۶ء)، ص ۳۵

قرآن اور اسلام کے وہ تمام احکامات جس سے خلقِ خدا کے لیے مادی فوائد اور روحانی اطمینان کی راہیں کھلتی ہیں اس کا وہ مرثیے میں بار بار ذکر کرتے ہیں اور پھر عصرِ حاضر میں نئے انقلابات نے جو زندگی کا ایک بالکل نیا تصور پیش کیا ہے اسے وہ فراموش نہیں کرتے:

وہ انقلاب نے رنگ جہاں بدل ڈالا — مدار گردش ہفت آسماں بدل ڈالا
ہوا نے ذوق بہار و خزاں بدل ڈالا — گلوں نے قاعدۂ گلستاں بدل ڈالا
سکھائے طرز وہ بلبل کو نغمہ خوانی کے
کہ جن سے پھول کھلیں باغ زندگانی کے

(مراثی نسیم، جلد، دوم، ص ۳۲۶)

اس بند میں انہوں نے شعری لباس میں معنی خیز باتیں کہی ہیں۔ وہ اس حقیقت کا خیر مقدم کر رہے ہیں کہ انقلابِ وقت نے وہ طرز سکھائے ہیں جس سے باغ زندگی میں پھول کھلتے ہیں۔ یہ انقلاب وقت ان کے نزدیک سائنسی ارتقا' اقتصادی ترقی' فلسفۂ حیات اور اخلاقِ اجتماعی سے عبارت ہے۔ جنہوں نے سماج میں اپنی نفرتوں سے زہر گھول دیا ہے وہ ان کے خلاف سخت ترین لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بقا کا راز اسی نکتے میں پوشیدہ ہے کہ ہر شخص کو جینے کا حق دیا جائے:

فراتِ دہر کا پانی سبھی کو پینے دو
یہی ہے راز بقا دوسروں کو جینے دو

(سازِ حریت)

دہر ہے آبِ رواں جو بھی پیئے پینے دو
خود بھی دنیا میں جیو، غیر کو بھی جینے دو

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص ۴۹)

ہر ایک دوسرے کا زنگ فکر دھوتا ہے
یونہی چراغ سے روشن چراغ ہوتا ہے

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص ۱۵۳)

کسی بھی تفریق اور رنگ و نسل کے کسی بھی اختلاف کے بغیر سب کے ساتھ یکساں سلوک اور معاشرے کے تمام افراد کے ساتھ مساوات قائم رکھنا ان کی رثائی فکر کا پہلا قدم ہے۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے پانی کے موضوع پر ایک مرثیہ لکھا جسے ان کے معرکتہ الآرا مرثیوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ اس میں پانی

کے رویئے کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بند میں انہوں نے اس کے طرزِ مساوات کو اس انداز سے لکھا ہے:

کوئی ہوں، کیسے بھی ہوں، بے شعور، اہل شعور غنی، غریب، قوی، ناتواں، شکور، کفور
لہو غریبوں کا پی پی کے فربہ و مغرور تباہ کردۂ رسم معاشرہ، مزدور
یہ سب جہاں ہیں مساوی وہ موڑ ہے پانی
ربوبیت کے عمل کا نچوڑ ہے پانی

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص ۳۸)

اتنے عظیم مساواتی سلوک کو وہ ربوبیت کا عمل قرار دیتے ہیں۔ ایک مرثیے میں ربِ دو جہاں کی حمد لکھتے ہوئے اسی سلوک کا اظہار انہوں نے ایک بند میں کیا ہے:

ارض و فلک و دشت و درد کوہ و بیاباں نخل و حجر و برگ و گل و خار و گلستاں
جن و ملک و اہرمن و وحشی و انساں موسائی و عیسائی و ہندو و مسلماں
رحمت تری مخصوص کسی ایک سے کب ہے
اتنا ہے روا دار کہ مشرک کا بھی رب ہے

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص ۲۵۰)

مرثیے کے حمد یہ بندوں میں جہاں انہوں نے یہ طرز اختیار کیا ہے وہاں نعتیہ حصوں میں بھی صرف اظہارِ عقیدت نہیں بلکہ ایسے پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے جس سے سماج میں یہ تعلیمات عام ہوسکیں کہ ہم جن کے پیرو ہیں ان کا انسانوں سے کیا برتاؤ رہا ہے:

بالکل طریق جادہ و منزل بدل دیئے
اوہام باطلہ کے مراحل بدل دیئے
کنبوں کی زندگی کے مسائل بدل دیئے
وہ بے بدل مزاج دیا، دل بدل دیئے[۹۰]

اسلامی سماج

نسیم ایک مورخ یا ایک عالم دین کی طرح اسلامی سماج کا کوئی تصور مرثیے میں پیش نہیں کرتے ان کا اس بارے میں شاعرانہ ڈھنگ یہ ہے کہ وہ کرداروں کے تعارف، ان کی سیرت، حفظِ مراتب، نشست و

۹۰۔ مسدس نسیم (کراچی: فیڈرل بی ایریا، ۱۹۷۸ء)، ص ۳۰

برخاست اور ایثار و صداقت کے ذریعے اسلامی سماج کی تصویریں ہمیں دکھاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل نے مرثیے کے اس موضوع پر لکھتے ہوئے بہت بہتر انداز میں یہ وضاحت کی ہے:

'مرثیے کا مطالعہ کرتے وقت ناقدین نے یہ باتیں تو بار بار کہی ہیں کہ مرثیوں میں شادی بیاہ، مرنے جینے، نشست و برخاست، گفتگو کے طور طریقے، حفظِ مراتب سب کا بہت اچھا بیان ملتا ہے مگر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ان صورتوں کے پیچھے کن لوگوں کے طور طریقے، حفظِ مراتب اور نشست و برخاست شامل ہیں اور یہ لوگ کن تہذیبی اور معاشی زندگیوں کے ادب و آداب لے کر تاریخ کے ایک خاص موڑ پر سماجی زندگی کے تانے بانے بن رہے تھے۔'[۹۱]

نقادوں نے اردو مرثیے پر جو اعتراضات کیے ہیں ان میں یہ اعتراض بہت نمایاں رہا ہے کہ مرثیہ نگاروں نے مرثیوں میں عربی ماحول پیدا نہیں کیا جب واقعہ عرب کی سرزمین پر ہوا اور کردار بھی سب اہلِ عرب تھے تو پھر فضا بھی عربی ہونی چاہیے تھی۔ یہ اعتراض مذہبی طبقوں کی طرف سے زیادہ کیے گئے اور ہر دور میں کیے گئے اور معترضوں نے اس بارے میں علما سے رجوع بھی کیا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کے دریافت کردہ 'رسالۂ دبیر' کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

'رسالے میں ایسے اشارے موجود ہیں جن سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ معترضین نے اس وقت کے علمائے دین سے مرثیے میں واقعاتِ کربلا، عربی واقعات اور کردار کے عین مطابق پیش نہ کیے جانے کی شکایت کی تھی۔'[۹۲]

مرثیے پر اعتراض کرنے والے عموماً شاعری کی اثر انگیزی سے بے خبر ہوتے ہیں کہ وہی شاعری دلوں میں اترتی ہے جو اپنے گرد و پیش کے ماحول میں رہ کر احساسات کی تصویر کشی کر رہی ہو۔ اگر ہماری اپنی علامتیں، اپنی تشبیہات، اپنے رسم و رواج اور اپنا ثقافتی احساس اس میں شامل نہ ہوا تو اس کی تمام تاثیر ماند پڑ جائے گی۔ اپنے اطراف کے ماحول سے مرثیے کے مضامین کو نسبت دینے میں نسیم کے سامنے بھی یہی طرزِ فکر تھا کہ مرثیے کا اپنے سماج سے رشتہ برقرار رکھا جائے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں:

'اسی لیے ہمارے مرثیہ نگاروں کے لیے ضروری ہوا کہ جو رسمیں یا جو چیزیں ہماری

۹۱۔ مرثیے کی سماجیات (دہلی: خواجہ پریس جامع مسجد، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۴

۹۲۔ مجتہد نظم مرزا دبیر (لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۳۹

معاشرت اور ماحول کا جزو بن کر ہمارے لیے ایک خاص اہمیت اختیار کر گئی ہیں ان کا
بیان کیا جائے مثلاً سہرا، زیور، چوڑیاں جن کا رواج عرب میں نہیں تھا'[۹۳]

نسیم نے اپنے ایک مرثیے میں بنت رسولؐ کی شادی کے اہتمام میں مہندی، غازہ، افشاں، سرمہ اور عطر کے لوازمات کا اظہار اپنے مقامی رنگ اور اپنے سماجی طریقے سے کیا ہے البتہ اس میں جن تشبیہات سے کام لیا ہے وہ اتنی بلند اور باوقار ہیں کہ خاندانِ رسول کی اس شادی کا بیان مقامی احساس سے مل کر سننے والوں یا پڑھنے والوں کے لیے بہت اثر انگیز بن گیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ کیجیے:

شادی کے اہتمام میں ساری خدائی ہے — مہندی پئے عروس، شفق لے کے آئی ہے
خورشید کے طبق میں سحر غازہ لائی ہے — والنجم نے ستاروں کی افشاں لگائی ہے
سرمہ حیا ہے چشم حقیقت شناس کا
خلق نبیؐ ہے عطر بنی کے لباس کا[۹۴]

شان الحق حقی نے نسیم کے اس مرثیے کو ان کے استادانہ کمال کا مظہر قرار دیا ہے۔[۹۵]

یہ ایک بڑی ادبی حقیقت ہے کہ ادب جس ماحول سے اور جن لوگوں کے درمیان اپنے خدوخال بنا کر ہم تک پہنچتا ہے اگر وہ اس ماحول اور ان لوگوں کے رہن سہن، حالات، گفتگو اور ان کی تہذیبی زندگی سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہ رکھے اور ان کے گردوپیش سے بالکل لاتعلق ہو تو اس کا وجود ہی بے معنی ہو جائے گا۔ ڈاکٹر سید علی حیدر اس تعلق کو جذباتی ہم آہنگی کا نام دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

'عرب کی سرزمین کے واقعے کو جو ہزار برس پہلے وجود میں آیا تھا اس کو کس طرح بیان کیا جاتا تاکہ لوگوں کے دل ودماغ پر اس کا اثر ہوتا ان واقعات کو حقیقی انداز بخشنے کے لیے جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنا ضروری تھا اور وہ جذباتی ہم آہنگی مقامی رنگ و آہنگ کے ساتھ آ سکتی تھی۔'[۹۶]

ثقافتی اور تہذیبی اظہار سے وہ جہاں جذباتی ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں وہاں کرداروں کے بیان میں ان کی زندگی کے مختلف واقعات کو لکھتے ہوئے وہ ان اقدار کو نمایاں کرتے رہتے ہیں جن سے

۹۳۔ اردو مرثیے کا ارتقا (لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۶۸ء)، ص ۹۷۴

۹۴۔ قرآن السعدین (آگرہ: انجمن پنجتنی، سنہ اشاعت ندارد)، ص ۸

۹۵۔ منقولہ از مکتوب بنام ہلال نقوی، مشمولہ تعزیت نامہ، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶

۹۶۔ مرثیہ شناسی (الٰہ آباد: اردو رائٹرس گلڈ، طبع دوم، ۱۹۸۷ء)، ص ۳۱

اسلامی سماج کے نقوش ابھرتے ہیں۔ نواسۂ رسول حضرت امام حسینؑ نسل عرب سے تھے ان کی شادی شہر بانو نامی خاتون سے ہوئی تھی جو ایران سے تعلق رکھتی تھیں۔[۹۷] یعنی نسل عجم سے تھیں۔ اب نسیم اس موضوع پر لکھتے ہوئے ان پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں جن سے اسلامی سماج کے خدوخال ظاہر ہوتے ہیں:

نسلِ عرب کا نسلِ عجم سے یہ اتصال
پہلی صدی کے دور میں اک مقتضائے حال
رنگ و وطن کے فرق کا اٹھے نہ اب سوال
خرے کی سرزمیں میں ہوئی سیوتی نہال

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص ۲۰۰)

پاکستانی ادبیات میں نسیم کے مرثیے کا وصف

نسیم نے اسلامی سماج کے اظہار میں مقامی رنگ کو شعری پیرائے میں بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ مقامی تہذیب اور پاکستانی ادبیات کے درمیان ان کا مرثیہ ایک نئے سماجی احساس کے ساتھ اپنی انفرادیت قائم کرتا ہے۔ سماج میں خیر وشر کی تعبیر کے لیے کربلا نہ صرف مرثیے میں بلکہ تمام اصنافِ ادب میں ہمیں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی بحث سے ایک اقتباس دیکھیے:

'قیام پاکستان کے بعد تقریباً ہر غزل گو اور نظم گو نے سلام کی صنف کو بھی آگے بڑھایا سانحۂ کربلا کے اثرات نے نہ صرف خیر وشر کے حوالے سے شاعری کی مختلف اصناف میں نمایاں کردار ادا کیا ہے بلکہ نثری ادب پر اس کے گہرے اثرات ہوئے۔ خاص طور پر مزاحمتی ادب میں کربلا کے استعاروں اور تشبیہوں نے معانی اجاگر کیے آج کے پاکستانی ادب کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے۔'[۹۸]

اس بحث کے دوران ڈاکٹر سلیم اختر نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

'شعرا نے جب کبھی اپنی سماجی زندگی کی ابتری، سیاسی خلفشار، حق کی مجبوری اور کذب و منافقت پر اظہارِ خیال کیا تو علامات، تشبیہات، استعارات اور تلمیحاتِ کربلا، حضرت

۹۷۔ سیرتِ امام زین العابدین، ترجمہ احمد علی 'عابدی' مجلس مصنفین 'قم ایران' (پاکستان: دارالثقافۃ الاسلامیہ، ۲۰۰۰)، ص ۷

۹۸۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص ۵۸۷

امام حسینؑ اور مرثیے سے حاصل کیں۔"[99]

پاکستان میں نسیم کے مرثیے کا زیادہ جھکاؤ سماجی مسائل کی طرف رہا۔ ان سماجی مسائل کو وہ براہِ راست کسی واعظ و مبلغ کی طرح بیان نہیں کرتے بلکہ فکر ونظر کا ایک پورا سلسلہ ان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ ان تمام اسباب کی طرف اشارے کرتا ہے جس کے نتیجے میں سماج مسائل کا شکار رہا۔ گذشتہ نصف صدی کے شعری سفر میں نسیم کے طرزِ اظہار میں بھی ایک تبدیلی آئی لکھنؤ میں رہ کر رعایتِ لفظی اور صنعت گری سے ان کا جو تعلق رہا وہ پاکستان کی فضا میں انتہائی مدھم ہو گیا۔ لکھنؤ میں ان کے مخاطب خواص اور علما تھے:

نہ فقط چند ھُما اور شُما سنتے ہیں
ہے درِ علم کی مدحت علما سنتے ہیں

(۱۹۳۰ء لکھنؤ)

مبتلائے عشق ہے اے دوستو، ہر خاص و عام
گاؤں میں یہ مرثیہ سننے کو آئے ہیں عوام

(۱۹۵۷ء کوٹ ڈیجی)

اس سوال پر کہ کیا آپ اپنے مرثیے سے معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی لانے میں خود کو کامیاب پاتے ہیں یا نہیں؟ انہوں نے اپنے انٹرویو میں جواب دیا تھا:

'معاشرے میں صالح تبدیلی لانے کی خدمت مرثیے نے بڑی حد تک انجام دی ہے۔ آپ سماج کے ان رجحانات پر نظر ڈالیں جو ۱۹۳۶ء میں تھے پھر ان تبدیلیوں کو دیکھیں جو ۱۹۷۶ء تک ظہور میں آئی ہیں۔"[100]

نسیم نے ایک نو تعمیر ملک اور ایک پس ماندہ اور مسائل میں مبتلا سماج میں افسردگی اور مایوسی کے بجائے زندگی کی نئی امنگوں کو موضوعِ فکر بنایا، ماضی کی محرومیوں کا ماتم کرتے رہنے کو رد کیا اور مستقبل کے استقبال کی طرف لوگوں کو مائل کیا:

۹۹۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص ۵۸۵

۱۰۰۔ ہلال نقوی، مشمولہ، جدید مرثیے کے تین معمار (کراچی: ریڈرس گلڈ، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۸

عہدِ رفتہ کی طرح گو منتشر اب ہم نہیں　　پھر بھی رفتارِ عمل مربوط و مستحکم نہیں
خیر، جو کچھ کھو چکے، کھو ہی چکے، کچھ غم نہیں　　ہو گیا تنظیم کا سودا، یہ قیمت کم نہیں
ذکرِ ماضی بر طرف فی الحال کرنا چاہیے
بڑھ کے مستقبل کا استقبال کرنا چاہیے

ایسے عالم میں کہ سب ہیں کامیاب زندگی　　وقت نے بڑھ کر الٹ دی ہے نقابِ زندگی
کھولتا ہوں موت کی منزل میں بابِ زندگی　　خون کی سرخی ہے عنوان کتابِ زندگی
دفن کر کے عصرِ کہنہ کی پرانی لاش کو
سوزنِ ہمت سے سیتا ہوں دلِ صد پاش کو

منزلِ جہد و طلب میں تھا جو کچھ کچھ مضمحل　　اب دھڑکتا ہے نئے احساسِ قوت سے وہ دل
منجمد سمجھی تھی جس کو کائناتِ آب و گل　　بجلیاں سی دوڑتی ہیں اس لہو میں متصل
کون کہتا ہے ہمیں بیدار ہونا چاہیے
ہاں یہ سچ ہے اختتامِ کار ہونا چاہیے

دے رہی ہے اک صلائے عام تنظیمِ حیات　　ہاں کدھر ہیں اہلِ ہمت، فاتحانِ کائنات
ہو رہا ہے امتحان جرأت و عزم و ثبات　　مل رہی ہے تا بحدِ جستجو غم سے نجات
لیلیٰ مقصد اسی نسبت سے ہم آغوش ہے
جس قدر بازو میں طاقت دل میں جتنا جوش ہے

کروٹیں لیتی ہے ذہنوں میں ترقی کی امنگ　　منزل تقدیر میں تدبیر کا جمتا ہے رنگ
کیا حیات آموز ہے صہبائے جرأت کی ترنگ　　ضرب سے نبضِ عمل کی بج رہا ہے طبل جنگ
زور و زر اس عزم کو مغلوب کر سکتے نہیں
قوم کے جذبات دب سکتے ہیں مر سکتے نہیں

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص ۶۱)

نسیم کے مرثیے کی یہ شاعری حوصلوں اور امنگوں کی شاعری ہے۔ اقتصادی برتری کی دوڑ دھوپ اور سماج میں اپنی شناخت کی گرم بازاری میں ان کا شعری اظہار لوگوں کے ذہن کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ ایسے موقع پر مرثیے میں ان کے لہجے نے یہ شکل اختیار کی:

سناؤ شعر اب ایسے کہ روح ہو بیدار خبر ہے کچھ کہ زمانہ ہے برسرِ پیکار
رہ بقا میں تقابل کا گرم ہے بازار وہ طبلِ جنگ بجا، ہاں سپاہیو ہشیار
ہوئے تند کا جھونکا بصد شتاب آیا
اٹھو اٹھو کہ لبِ بام آفتاب آیا

(مراثی نسیم، جلد اول، ص ۱۱۱)

پاکستانی ادبیات میں نسیم کے مرثیے کا ایک خصوصی وصف یہ ہے کہ اس نے عوام سے اپنا رشتہ مضبوط کیا ہے۔ یوں بھی پاکستان میں نئی سماجی تشکیل کے لیے مرثیے کے موضوعات عوامی احساس سے زیادہ قریب ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے ایک نقاد دار الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عقیل رضوی کی مختصر آراء سے یہ دو اقتباسات اسی بات کا اظہار ہیں:

'مرثیے کی شاعری کو عوام میں وہ مقبولیت ہندوستان میں نہ ملی جو پاکستان میں ملی۔'[۱۰۱]

'میرا خیال ہے کہ مرثیہ پاکستان میں ایک کراس کرنٹ ہے جس کی سرپرستی عوامی ادبی ذوق کر رہا ہے۔'[۱۰۲]

سندھی سماج سے مرثیے کا عوامی رشتہ

نسیم ہندوستان سے ہجرت کر کے جب پاکستان آئے تو ان کا مستقل قیام خیر پور میں ہوا۔ خیر پور سے نزدیک واقع ایک گاؤں کوٹ ڈیجی میں ان کا رہنا سہنا رہا۔ رامپور اور لکھنؤ کے بعد جب وہ کوٹ ڈیجی اور خیر پور میں آباد ہوئے تو انہیں شہروں کی نسبت مضافاتی بستیوں اور گاؤں میں زندگی کے نشیب و فراز قریب سے دیکھنے کا تجربہ ہوا۔ ان کی سوانح سے متعلق باب میں اس دور کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں۔ ہم اس سے پہلے بھی یہ لکھ چکے ہیں کہ مرثیہ نگار جس واقعہ کو لکھ رہا ہے اس واقعے کا تعلق کسی بھی سرزمین (عراق) سے ہو لیکن جس ماحول میں رہ کر شاعر اسے لکھ رہا ہے اگر ان کے احساسات اور جذبات اور ان کی سماجی اقدار سے واقعے کی نسبت قائم نہیں کی جا رہی تو پھر اس موضوع کا اپنے عہد کے لوگوں سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ ادب کے سماجی مطالعے کی سب سے بنیادی کڑی ہی یہ ہے کہ جس سماج میں رہ کر وہ لکھا جا رہا ہے اس کے رسم و رواج، توہمات،

۱۰۱۔ مرثیے کی سماجیات (دہلی: خواجہ پریس جامع مسجد، ۱۹۹۳ء)، ص ۷

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۱۲۰

اعتقادات، معاشرت اور تہذیب وتمدن کے باہمی تعلق سے جو ایک فضا بنی ہے اس کا تذکرہ وتجزیہ کیا جائے۔
لکھنؤ کے مقابلے میں سندھ میں رہ کر نسیم کے مرثیے کی زبان بھی مقامی احساسات کی نمائندگی کرتی ہے:

یاں سخی کا تھا یہ عالم ادھر آتی تھی صدا میں ہوں بھوکا مجھے کھانا کوئی دو بہر خدا
کچھ کسی نے نہ دیا جب تو گدا کہہ کے چلا سائیں اب جاتے ہیں، مولا مرے کر سب کا بھلا
کچھ نہ مسجد سے بجز نقدِ رضا لے کے چلے
بھیک لینے کو ہم آئے تھے دعا دے کے چلے

(مراثی نسیم، جلد دوم، ص ۲۲۱)

سندھ میں وڈیروں کے جو اثرات رہے اور آج بھی ہیں وہ یہاں کی سماجی اور سیاسی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش حصہ ہیں۔ وڈیرہ شاہی نے زندگی کے مختلف شعبوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ مقامی لوگوں کی تعلیم سے دوری اور کھیتی باڑی سے سیاست تک کے تمام معاملات میں وڈیرہ شاہی کے معاملات کو نسیم نے بہت قریب سے دیکھا ہے 'تاریخ خیر پور' کے مولف ہونے کی نسبت وہ سندھ کے مورخ بھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہاں مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں لیکن وہ انہیں کسی امتیاز اور تفریق کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کے نزدیک طبقے صرف دو ہیں ایک ظالموں کا طبقہ اور دوسرا مظلوموں کا۔

جو بھی ہیں فرزندِ آدم بد ہیں یا وہ نیک ہیں
جب صفِ مظلومیت میں آ گئے سب ایک ہیں [۱۰۳]

ڈاکٹر محمد سیادت لکھتے ہیں:

'نسیم وہ پہلا فنکار ہے جس نے اپنے مراثی کے ذریعے مجروح وستم رسیدہ انسانیت کو وقتی فتح و شکست کے صحیح مفہوم سے آشنا کرتے ہوئے اس میں ہر ظلم و بربریت کے خلاف جرأت مندانہ آواز بلند کرنے کی ہمت پیدا کی۔' [۱۰۴]

کیفی اعظمی نے لکھا ہے کہ مرثیہ ظلم کے خلاف ایک پروٹسٹ لٹریچر (Protest Literature) ہے۔ [۱۰۵]

سندھ کے سماج میں جو نسلی امتیازات ہیں اور بعض جاگیرداروں اور دولت مندوں کی جوتیاں جو

۱۰۳۔ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۲۹۴
۱۰۴۔ نسیم امروہوی ایک تعارف (دہلی: کلر پرنٹنگ پریس، جنوری، ۱۹۹۱ء)، ص ۹
۱۰۵۔ کیفی اعظمی سے ایک گفتگو، مشمولہ، اندازِ گفتگو، حسن رضوی (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۵۶

غریبوں کے سروں پر ہیں نسیم کے مرثیے میں اس کے خلاف احتجاج کی ایک لہر ہمیں اکثر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ کرداروں کے حالات و واقعات سے وہ اپنی بات ہم تک پہنچاتے ہیں۔ سندھی زبان کے بڑے شاعروں نے بھی اس واقعے کو ایک علامت بنایا عشقیہ داستانوں تک میں یہ مثالیں بنیاد بنائی گئیں۔ شیخ ایاز نے لکھا ہے کہ:

'سسی پنوں کی عشقیہ داستان نظم کرتے ہوئے راہِ طلب میں سسی کے صبر و استقلال کے ذکر میں شاہ عبداللطیف بھٹائی واقعۂ کربلا میں امام حسینؑ اور ان کے اقربا کو علامت بناتے ہیں۔'[۱۰۶]

سندھ کی لوک کہانیوں اور عشقیہ داستانوں میں عورت کی مظلومیت جس طرح نمایاں ہوئی ہے اسی طرح مقامی مرثیوں میں بھی عورت کی مظلومیت زیادہ موضوع بنی ہے لیکن نسیم نے تو عورت کی مظلومیت اور اس کے تذکرے کو اس تفصیل سے لکھا ہے کہ مرثیے علمی و فلسفیانہ رنگ کے ساتھ ساتھ ایک سماجی دستاویز بھی معلوم ہوتے ہیں۔

عورت کی مظلومیت

سندھ میں وڈیرہ شاہی کے حاکمانہ انداز کے سبب جو ظالمانہ روایتیں رواج پا گئیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اپنی زمینوں اور جائیداد کو تقسیم نہ کرنے کی نیت کے سبب گھر کی بیٹی کا قرآن سے نکاح پڑھوا دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس بے رحمانہ طرزِ زندگی میں کمی آئی ہے لیکن جہاں دولت کی خاطر رشتے ناتے سب ختم کر دیئے جاتے ہیں وہاں اب بھی عورت سے یہ سلوک باقی ہے۔ نسیم کے پیشِ نظر رسولؐ اور خاندان رسولؐ کی روایتیں رہی ہیں وہ مرثیے میں عورت کی زندگی پر لکھتے ہوئے سندھ کے فیوڈل نظام کے جابرانہ طریقوں کو نظر میں رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں انہوں نے خواتینِ اسلام پر بہت مرثیے لکھے۔ ڈاکٹر عقیل رضوی نے لکھا ہے کہ:

'رسولؐ نے مسلمانوں میں خواتین کے تمام حقوق کو تسلیم کیا تھا مگر اس سے فیوڈل کلاس کو دھچکا پہنچا تھا خصوصاً تقسیمِ جائیداد کے سلسلے میں۔'[۱۰۷]

اسی بحث میں وہ لکھتے ہیں:

۱۰۶۔ رسالہ شاہ لطیف (سندھ یونیورسٹی: انسٹیٹوٹ آف سندھالوجی اشاعت دوم اکتوبر، ۱۹۷۷ء)، ص۴۷

۱۰۷۔ مرثیے کی سماجیات (دہلی: خواجہ پریس جامع مسجد، ۱۹۹۳ء)، ص۴۷

'نسیم امروہوی نے سب سے زیادہ مرثیے خواتینِ اسلام کی شان میں رقم کیے ہیں جن میں حسبِ ذیل مرثیے اہم ہیں مسند نشیں بزم طہارت ہے فاطمہ، سجدہ گاہ ملک وحور ہے بابِ زہرا، کلثوم نامدار ہیں بیٹی بتول کی... یہ واضح رہے کہ بیسویں صدی کے یہ مرثیے خواتین کے جملہ صفات کونظر میں رکھ کر پیش کیے گئے ہیں صرف ان کے مصائب کا بیان نہیں ہے۔'[108]

خواتینِ اسلام کوموضوع بنا کرنسیم نے جو مرثیے لکھے ان میں ایک طرف تو علمی طرز ہے:

یہ خاک آدم وحوا کی جس میں ہے شرکت ہے دو طرح کی بحد نزاکت و قوت
قوی ہو گر تو رجل ہے نحیف تو عورت جلال اس کا ہے شیوہ جمال اس کی صفت
یہ اور شے ہے تشدد سے مرد حاوی ہیں
مگر فضائلِ انسانیت مساوی ہیں

(مراثی نسیم، جلد اول، ص ۱۴۸)

اور پھر دوسری طرف ان کے مرثیے میں ایک ایسی فکر بھی ہے جو خواتین کے حقوق و فرائض سے شروع ہوکر معاشرے میں ان کے مقام، جدوجہد، اولاد کی کردار سازی میں ان کے کردار اور خاندان میں صالح اقدار کی پرورش جیسے عنوانات تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ عنوانات محض امورِ خانہ داری تک محدود نہیں۔ آج سماجی زندگی کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے اور مقامی و عالمی سطح پر معاشرے میں عورت کی حیثیت اور اس کے حقوق پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے۔ یہ چیز نسیم کے مرثیے میں نمایاں ہے انیس کے ہاں ان حقوق کا ذکر تو نہیں ہے جو نسیم کے مرثیے میں نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انیس و نسیم کے عہد کے تقاضے جدا جدا ہیں لیکن (جنابِ زینب کی شکل میں) عورت کو انیس بھی اہمیت دیتے ہیں۔ ظ۔ انصاری نے یہ لکھا ہے کہ:

'زینب کا رول اکثر مرثیوں میں ہیرو کا رول ہے۔'[109]

نسیم نے بھی جنابِ زینب پر جو مرثیے لکھے ہیں ان میں تقریباً یہی صورت ہے۔ انیس کے مقابلے میں جو تبدیلی ہے وہ ان کے عہد کے سیاسی وسماجی اثرات کے سبب ہے۔ انیس بھی جنابِ زینب

۱۰۸۔ مرثیے کی سماجیات (دہلی: خواجہ پریس جامع مسجد، ۱۹۹۳ء)، ص ۸۲

۱۰۹۔ مراثی انیس کے ماحول میں پلنے والا شعور، مشمولہ انیس شناسی، مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی: گلوب آفسٹ پریس، ۱۹۸۱ء)، ص ۲۵۰

کی اسیری وقید و بند کا ذکر کرتے ہیں اور نسیم بھی لیکن طرزِ فکر بالکل الگ ہے:

پردیس میں رسی سے بندھیں ہاتھ بہن کے
ماں جائے کو رہنے دیں مگر ساتھ بہن کے[۱۱۰]

(انیس)

صداقتیں ہیں رواں بنتِ قلعہ گیر کے ساتھ
یہ قید کچھ نہیں آزادیٔ ضمیر کے ساتھ[۱۱۱]

(نسیم)

اردو مرثیے میں مردوں کی شان وشوکت اور ان کی رزم آرائی کا اظہار کثرت سے ملتا ہے اور اسی کثرت کی وجہ سے ان سپاہیوں اور بہادروں کے گھوڑوں کی تعریف میں بھی بہت لکھا گیا ہے لیکن نسیم نے ایک جدا طرز اختیار کیا کہ جہاں حضرت زینبؑ کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے وہیں ان کی سواری کا بیان بھی منفرد انداز سے کیا گیا۔ عظیم امروہوی نے اس ذیل میں لکھا ہے کہ:

'اردو مرثیوں میں گھوڑوں کی تعریف بہت ملتی ہے۔ نسیم نے مرثیے میں جنابِ زینب کے ناقے کا تفصیلی اظہار کیا ہے۔'[۱۱۲]

عرب کے وحشیانہ اور تاریک دور میں جہاں عورت کو پیدا ہوتے ہی بیدردی سے قتل کر دیا جاتا تھا وہاں رسولِ آخرؐ نے بیٹی کو عزت و احترام سے ایک بلند مقام عطا کیا۔ نسیم اور دوسرے مرثیہ نگاروں نے اس صدی میں جس تقدس اور حُرمت کے ساتھ مرثیے میں عورت کی عظمت کو نمایاں کیا ہے اس کی مثال پوری اردو شاعری میں نایاب ہے۔

انسانی رشتوں کی شاعری

دوسری اصنافِ سخن کے مقابلے میں مرثیے میں معاشرتی قدریں اور ایثار وصداقت کے پہلو اس لیے زیادہ نظر آتے ہیں کہ مرثیے کا تعلق ہی ایک ایسے خاندان کے حالات سے ہے جو خاندانِ رسولؐ ہے اور جس کا ہر عمل تہذیبی و سماجی زندگی میں ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری میں انسان اپنے

۱۱۰۔ مراثی انیس، جلد اول (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز: اشاعت دوم، ۱۹۶۷ء)، ص ۳۵۸

۱۱۱۔ مراثی نسیم، جلد اول (کراچی: ایجوکیشنل پریس، ۱۹۶۲ء)، ص ۱۵۳

۱۱۲۔ عظیم امروہوی، دیباچہ، مشمولہ لالہ زارِ صبح، ناشر نقوی (دہلی: بزم تجدید مرثیہ، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۲۱

رشتوں کے درمیان اس طرح نظر نہیں آتا جس طرح اردو مرثیوں میں نظر آتا ہے۔ میر انیس کے مرثیوں کے حوالے سے سلیم احمد کی یہ رائے اسی باب کی ابتدائی بحث میں ہم نے نقل کی ہے کہ انسان اس مرثیے میں اپنے بنیادی ماحول میں ہے۔ باپ، بیٹے، بھائی، بھابھی، چچا، بھتیجے، ماموں، بھانجے، ماں، بیٹی، ساس، بہو، نند، بھاوج، شوہر، بیوی، دوست، احباب، آقا اور غلام۔ غرض کہ انسانی رشتے کی کون سی شکل ہے۔ جس نے میر انیس کے دل کو متاثر نہیں کیا۔[۱۱۳] دنیا کے کسی بھی معاشرے میں معاشرتی زندگی اور تہذیبی ارتقا کے لیے رشتوں کا پاس پہلی شرط قرار دی جائے گی جس معاشرے میں رشتوں کا احترام مٹ جائے وہاں معاشرہ اندر سے کھوکھلا ہونے لگتا ہے۔ ہماری مخصوص ثقافت اور طرزِ زندگی میں خاندانی رشتوں اور انسانی تعلقات کی جو اہمیت ہے اسے نسیم نے مرثیے میں بہت نمایاں کیا ہے۔ تعلقات کی ایک ایسی ہم آہنگی ان کے مرثیے میں دیکھی جاسکتی ہے جس میں کسی ایک اعلیٰ مقصد کے لیے سب کے دکھ اور سکھ ایک ہی زنجیر میں جڑے ہوتے ہیں:

چہروں پہ انبساط بھی، ماتم کی گرد بھی ہونٹوں پہ حرف شکر بھی اور آہ سرد بھی
دل میں وغا کا جوش بھی، امت کا درد بھی مقصد کا اہتمام بھی، عزمِ نبرد، بھی
آنکھوں میں سوزِ حق کے شرارے لیے ہوئے
ابرو میں لافتا کے اشارے لیے ہوئے

مثلِ عروس حور شہادت سے اختلاط مانند عید، موت کی شادی سے انبساط
زخموں کے پھول، دل کے لیے باعث نشاط پانی کے ذکر سے بھی زبانوں کو احتیاط
نصرت کی آرزو میں، شہادت کی آس میں
خالق سے آبرو کے طلبگار پیاس میں[۱۱۴]

اسلام نے اخوت اور بھائی چارگی کی جو تعلیم دی ہے وہ کسی معاشرے کی تنظیم اور کسی سچے مقصد کی لگن میں کس طرح کام آتی ہے نسیم نے مرثیے میں اپنے کرداروں کے ذریعے اس کو اکثر جگہ نظم کیا ہے اور پھر ان میں انسانی تعلقات کا جو ایک تسلسل ہے اس کی وجہ سے اس کی سماجی قدر بھی بہت ہے اگرچہ واقعات تمام کے تمام ماضی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اپنے سماج سے ہم رشتہ کر کے اس ماضی کو حال بنا دیا گیا ہے۔

۱۱۳۔ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے، مشمولہ اردو (سہ ماہی) شمارہ ۳، ۴، ۱۹۷۴ء، ص ۲۲۱

۱۱۴۔ نسیم امروہوی (مرثیہ) کیا باوفا رفیق، شہہ ذی وقار تھے (کراچی: ناشر وزیر حیدر جعفری، ۱۹۷۳ء) ص ۱۱

بقول ڈاکٹر سید محمد عقیل:

'رثائی ادب کا تمام تر حصہ امرِ واقعہ کے لحاظ سے سب کچھ ماضی ہے مگر ہر دور کے فنکار نے اسے اپنی تہذیبی صورتوں، اپنی تاریخ، اپنے سماج اور اپنی تعبیروں سے اپنے حال میں اس طرح ضم کرلیا ہے کہ اس کے یہ رثائی تاریخی واقعات، اس کی اپنی تہذیب اور اس کا اپنا حال بن گئے ہیں۔'[۱۱۵]

اعلیٰ انسانی اقدار کا اظہار

نسیم رثائی تاریخی واقعات اور کرداروں کی سیرت سے اسلامی اور انسانی اقدار کا اظہار مرثیے کے ذریعے اس طرح کرتے ہیں کہ ماضی کی یہ تصویریں ہمارے ماحول کو زندگی کی نئی تعبیریں دینے لگتی ہیں۔ بعض قدریں ایسی ہوتی ہیں جوامر ہوتی ہیں اور کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ معاشرتی خلفشار میں ایسا لگتا ہے کہ وہ مٹ گئی ہیں لیکن عملاً ایسا ہوتا نہیں ہے انسان کسی نہ کسی وقت انہیں پھر تلاش کر لیتا ہے صبر وشکر، وفاداری، ایثار وقربانی، درگزر، انسان دوستی، شرافت و دیانت اور پھر شہادت جوان قدروں کی بلندی ہے یہ وہ قدریں ہیں جو نسیم کے مرثیے میں نمایاں ہیں اور ان کا مقصد یہی ہے کہ سماج کو یہ تعلیم دی جائے کہ بہتر زندگی کن لوازمات کے ساتھ گزاری جاسکتی ہے۔ مرثیے کے موضوع میں خود بخود وہ اقدار ظاہر ہونے لگتی ہیں جن سے زندگی کی حقیقت کا عرفان حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر جعفر رضا:

'مراثی میں فطری طور پر وہ عناصر مل جاتے ہیں جو سماج کی اعلیٰ قدروں کا نمونہ بن سکیں۔'[۱۱۶]

اردو کے تمام ہی مرثیہ نگار جب اس واقعہ شہادت کے مختلف کرداروں کا ذکر کرتے ہیں تو بغیر کسی شعوری کوشش کے یہ قدریں ان کے بیان کا حصہ بننے لگتی ہیں لیکن جب کوئی بڑا فنکار ان کو لکھتا ہے تو پھر وہ اس میں ایسی تاثیر پیدا کر دیتا ہے کہ پورا معاشرہ انہیں اپنے لیے مشعلِ راہ بنانے لگتا ہے۔

انیس اشفاق لکھتے ہیں:

'موجودہ عہد کی لعنتوں اور بدبختیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہم جن اعلیٰ انسانی

۱۱۵۔ مرثیے کی سماجیات (دہلی: خواجہ پریس جامع مسجد، ۱۹۹۳ء) ص ۱۱

۱۱۶۔ دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی (الٰہ آباد: دبستان شاہ گنج، مارچ ۱۹۹۴ء، تیسرا ایڈیشن) ص ۱۸۱

اقدار کا مطالعہ کر رہے ہیں وہ اس واقعے کے عظیم اور مثالی کردار میں موجود ہیں روشن ضمیری صبر و قناعت، ایثار و وفاداری، جرأت و جوانمردی، حق گوئی و حق پرستی، استقامت، اعلیٰ حوصلگی اور صفائے باطن وغیرہ ان میں سے ایک ایک قدر کو واقعۂ کربلا کے کرداروں نے مجسم کر دیا آج انسان کے اخلاقی اور روحانی زوال کا سبب انھی اقدار کا فقدان ہے۔' [۱۱۷]

ثاقب مظفر پوری کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ہم عصر مرثیہ نگاروں میں اسلامی اقدار کو جنھوں نے سب سے زیادہ نمایاں کیا ان میں سرفہرست نسیم امروہوی کا نام ہے۔ [۱۱۸] نسیم جہاں مرثیے میں مصائب کا بیان کرتے ہیں وہاں بھی وہ ان اقدار کو اُبھارتے ہیں۔

اردو کا کوئی مرثیہ نگار جس میں جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض بھی شامل ہیں، ایسا نہیں ہے جس کے مرثیے کے کسی بھی ایک مصرع، شعر یا بند سے سننے یا پڑھنے والے میں رقت یا رقت کا احساس بیدار نہ ہوا ہو۔ اگر چہ یہ ان کا مقصد نہیں تھا لیکن جن مرثیہ نگاروں کا یہ مقصد بھی رہا وہ بھی مرثیہ محض رونے رلانے کے لیے نہیں لکھ رہے تھے۔ نسیم کے یہاں بھی روزے کا بیان ہے لیکن یہ ان کا مقصد کبھی نہیں رہا۔ رونے رلانے کو انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری کا اہم ترین مقصد تسلیم کرنے کے باوجود پروفیسر احتشام حسین یہ بھی لکھتے ہیں:

'گو یہ ان کا اہم ترین مقصد تھا لیکن وہ امام حسینؓ کے کردار اور عمل کے مرقع پیش کر کے بعض انسانی مسائل کی طرف متوجہ کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔' [۱۱۹]

کسی کے حق کو تسلیم نہ کرنا، غیر انسانی برتاؤ، بچوں کو بھی اپنے انتقامی جذبوں کی زد پر رکھنا، جبر و تشدد، وعدہ شکنی، جھوٹ کی تائید نہ کرنے والوں کو اپنی طاقت کے بل پر محصور کر دینا، انتہائی بنیادی انسانی حق یعنی پانی تک سے انسان کو محروم کر دینا، جو ہم کہیں وہ تسلیم کرو ورنہ قتل و غارت گری کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ ایک ایسی کشمکش اور ایک ایسی روداد ہے جس میں ہر دور کی تصویر نظر آتی ہے۔ نسیم اپنے کرداروں کے توسط سے ہمیں ان تمام حقیقتوں تک لے جاتے ہیں۔ میر انیس کے حوالے سے ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

'یہ کشمکش اس دور کی ہوتے ہوئے بھی محض اس دور تک محدود نہیں تھی اس کا تعلق انسانی

۱۱۷۔ ادب کی باتیں (لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۹۶ء)، ص ۲۷۳

۱۱۸۔ جدید مرثیہ اردو نظم کے پس منظر میں، مشمولہ ارشاد (پندرہ روزہ) کراچی، محرم نمبر، ۱۴۰۹ھ، ص ۲۸

۱۱۹۔ تعارف، مشمولہ، ذوالفقار، مرثیہ، شمیم کرہانی (لکھنؤ: احباب پبلیشر، سنہ اشاعت ندارد)، ص ۵

وجود کے ایسے مسائل سے ہے جن سے ابتداء سے آج تک انسانی سماج دوچار ہے۔'[۱۲۰]

نسیم کی شخصی مرثیہ نگاری......ایک سماجی دستاویز

نسیم بیسویں صدی کے شاید واحد مرثیہ نگار ہیں جنھوں نے واقعہ کربلا پر مرثیوں کے ساتھ شخصی مرثیے میں بھی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے اپنے عہد کے علما، دانشور اور شعرا کی وفات پر مرثیے لکھ کر اپنے زمانے کی علمی و تہذیبی تاریخ سے بھی اپنے سماج کو آگاہ کیا ان کے یہ مرثیے اپنی قوم کے بھی مرثیے ہیں جن میں اہلِ علم کی ناقدری کا ماتم ہے۔ آل احمد سرور نے مسدسِ حالی کے بارے میں لکھا تھا کہ:

'مسدسِ حالی ایک مرثیہ بھی ہے اور ایک سماجی دستاویز بھی'۔[۱۲۱]

نسیم کے شخصی مرثیوں کو بھی ہم اس کسوٹی پر پرکھ سکتے ہیں۔ یہ مرثیے ایک طرف مرحوم کی سیرت و شخصیت کا اظہار ہیں۔ دوسری طرف ان کے عہد کی علمی و ادبی روش کو بھی پیش کرتے ہیں تیسرے یہ کہ ان شخصیات نے علم و عمل کو جو اہمیت دی اس سے معاشرے کی ترقی کی جو راہیں کھلتی ہیں ان کا بیان بھی بہت دلنشین ہے۔ سید وقار عظیم ان مرثیوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'اکابرِ قوم اور خصوصاً علمائے ملّت کے مرثیے لکھنے کا رجحان اردو کے جدید مرثیے کا بڑا اہم رجحان ہے اور اس رجحان کا آغاز کرنے اور مستقل مزاجی کے ساتھ اس رجحان پر قائم رہنے کا سہرا نسیم امروہوی کے سر ہے۔ قوم کی تنظیم عام اور حیاتِ نو کا اہتمام نسیم کے مرثیوں کا وہ موضوع ہے جس نے شاعر کو عمل کے فلسفے کا مفسّر اور ایک مخصوص صنفِ ادب کے ذریعے اس کی معاشرتی اور قومی افادیت کا مبلغ بنایا ہے'۔[۱۲۲]

نسیم روایتی مرثیے میں بھی اپنے پہلے مرثیے (۱۹۲۳ء) ہی سے سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے رہے ہیں اور شخصی مرثیے کو تو انھوں نے معاشرتی اور قومی افادیت کے لیے ایک ادبی وسیلہ بنا دیا۔ ۱۹۴۰ء میں جب نسیم نے پہلا شخصی مرثیہ لکھا تو اس طبقے کی طرف سے ان کی بہت مخالفت کی گئی جو مرثیے کو واقعۂ کربلا سے ہٹ کر کوئی اور پہچان دینے کو آمادہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں:

'انھوں نے ناصر الملّت مرحوم کی وفات پر ایک مرثیہ کہا جس پر اس نوعیت کے الزام بھی

۱۲۰۔ مراثی انیس میں آویزش کی نوعیت، مشمولہ آجکل (نئی دہلی)، میر انیس نمبر، جون، ۱۹۷۵ء، ص ۲۴

۱۲۱۔ فکرِ روشن (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۵

۱۲۲۔ نسیم امروہوی کی مرثیہ گوئی، مشمولہ عرفانِ نسیم (کراچی: انجمن سادات امروہہ، ۱۹۷۴ء)، ص ۹۶، ۹۸

لکھنؤ میں اٹھے کہ مرثیہ صرف شہدائے کربلا یا معصومین سے مختص ہوتا ہے اس لیے نسیم صاحب کا یہ فعل گناہ کے مترادف ہے لیکن چونکہ چیز اچھی تھی اور ایک مقدس ذات کے متعلق کہی گئی تھی اس لیے یہ اعتراض کچھ زیادہ نہ چل سکا۔[۱۲۳]

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کا بیان ہے کہ:

'حضرت ناصر الملت پر نسیم امروہوی صاحب نے جب مرثیہ لکھا تو بعض حلقوں خصوصاً خاندانِ اجتہاد[۱۲۴] کے لیے یہ اشتعال کا باعث بنا فضل لکھنوی صاحب نے اپنے رسالے 'نظارہ' میں اس مرثیہ پر اور نسیم امروہوی پر کئی طنز کیے اور فریقین میں لگ گئی۔'[۱۲۵]

اردو مرثیے کے ایک معروف محقق اور ماہر انیسیات مسعود حسن رضوی ادیب نے ایک مضمون میں وضاحت کی ہے کہ:

'مرثیے کا اطلاق ان تمام نظموں پر ہوتا ہے جو عزیزوں، دوستوں، بزرگوں، ممتاز ہستیوں، مذہبی پیشواؤں اور قومی رہنماؤں کی موت پر کہی گئی ہیں مگر جب مرثیہ ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو اس کے دائرے میں صرف وہ نظمیں آتی ہیں جس میں کربلا کے شہیدوں یعنی امام حسینؑ اور ان کے ساتھ کربلا میں جہاد کر کے شہید ہونے والوں کے اوصاف و کارنامے بیان کر کے ان کی موت پر افسوس کیا جاتا ہے۔'[۱۲۶]

مفتی سید طیب آغا الجزائری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ:

۱۲۳۔ مقدمۂ مراثیٔ نسیم، جلد اول (کراچی: ایجوکیشنل پریس، ۱۹۶۲ء)، ص ۱۷

۱۲۴۔ علمائے لکھنؤ کے دو خاندان بڑی شہرت کے حامل ہیں ایک خاندانِ ناصر الملت اور دوسرا خاندانِ اجتہاد۔ ان دونوں علمی گھرانوں کے علما میں شرعی اور دینی مسائل پر فقہی اختلافات رہے ہیں۔ نسیم امروہوی کی ہمدردیاں خاندانِ ناصر الملت کے ساتھ تھیں یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے اس خاندان کے علمی سربراہ سید ناصر حسین جنہیں ناصر الملت کہا جاتا تھا ان کے انتقال پر شخصی مرثیہ لکھا تو خاندانِ اجتہاد کے لوگوں نے ان کی مخالفت کی (م۔ن۔ع)

۱۲۵۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے مجھے بتایا کہ ۱۳ر جولائی ۱۹۸۰ء کو (مغل پورہ لاہور میں) مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات بتائی تھی (م۔ن۔ع)

۱۲۶۔ مراثیٔ ریختہ شمالی ہند کی قدیم ترین اردو نظمیں، مشمولہ تحریر (دہلی) شمارہ اپریل تا جون ۱۹۷۱ء، ص ۴

'یہ فن امام حسینؑ کے لیے ایسا مخصوص ہوگیا ہے کہ اب اگر کسی اور کا مرثیہ کہا جائے تو ذہن کو ایک دھچکا سا لگتا ہے۔'[۱۲۷]

دنیا کے مختلف زبانوں کے ادب کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شخصی مرثیے کی تاریخ واقعۂ کربلا سے ہزاروں سال پہلے کی تاریخ ہے۔ اپنے بیٹے ہابیل کے قتل پر حضرت آدمؑ کا مرثیہ اور طالوت کی موت پر حضرت داؤد کا مرثیہ ادبی تاریخوں میں آج بھی محفوظ ہے۔[۱۲۸] عربی اور فارسی میں بھی شخصی مرثیوں کی روایت موجود رہی ہے مولانا شبلی نے بعض مرثیوں کا تذکرہ کیا ہے۔[۱۲۹]

اردو میں شخصی مرثیے کی روایت بھی کچھ نئی نہیں ہے۔ اور اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ جہاں زندگی ہے وہاں موت بھی ہے اگر زندگی کا سفر ازل سے ہے تو موت بھی اس سفر میں ازل ہی سے ساتھ چلی آرہی ہے۔ چنانچہ ہر جگہ۔ ہر تہذیب میں اور ہر سماج میں اس کا تذکرہ ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ شخصی مرثیے کی صورت ہی میں اس کا اظہار موجود ہو۔ اردو کے نامور عظیم غزل گو شاعر میر تقی میر نے اپنی جواں سال لڑکی کی شادی کے کچھ دنوں بعد موت واقع ہو جانے پر جب غزل لکھی تو اس کا پہلا شعر یہ تھا:

کھلا ہم پر یہ اے آرامِ جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تجھے بھولے تھے ہم سامانِ شادی میں

فضل احمد کریم فضلی نے لکھا ہے کہ:

'یہ اکیلا شعر پورے پورے مرثیوں پر بھاری ہے۔'[۱۳۰]

اردو میں شخصی مرثیوں کی بھی اپنی ایک علیحدہ تاریخ ہے اور اگر اس صنف کو اختیار کرنے والوں کے مرثیے یکجا کیے جائیں تو یہ خود ایک ضخیم تحقیقی مقالے کی صورت ہوگی۔ لیکن جن بڑے شعرا کے مرثیے ایک یادگار حیثیت رکھتے ہیں ان میں غالب کا مرثیۂ عارف پہلا ادبی فن پارہ کہا جاسکتا ہے جس کا یہ شعر آج بھی زبانوں پر ہے:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

۱۲۷۔ پیش لفظ مرثیہ اتحادِ ملت، قسیم ابن نسیم (کراچی: پیر ابراہیم ٹرسٹ، ۱۹۷۶ء)، ص ۵

۱۲۸۔ بحوالہ ڈاکٹر محمد چراغ علی، اردو مرثیے کا ارتقا بیجاپور اور گولکنڈہ میں (دکن: مدینہ پریس، ۱۹۷۳ء)، ص ۵

۱۲۹۔ موازنۂ انیس و دبیر (آگرہ: مفید عام، ۱۹۰۷ء)، ص ۱۱، ۱۲

۱۳۰۔ ہائے کیا شے ہے غزل کیا کہیے، مشمولہ نیا دور، کراچی، شمارہ ۶۳، ۶۴

ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی نے اس مرثیے کو اردو زبان کا جامع اور پُر تاثیر مرثیہ کہا ہے۔۱۳۱

عظیم امروہوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ شخصی مرثیے میں پہلا نام جعفر زٹلی اور دوسرا نام ممنون کا لیا جاسکتا ہے۔لیکن شخصی مرثیے کے واضح اور نمایاں آثار ڈیڑھ سو سال قبل سے ملتے ہیں اور اس سلسلے کی پہلی اہم کڑی وہ مرثیہ ہے جو غالب نے عارف کی موت پر کہا۔۱۳۲ دیگر شخصی مرثیہ نگاروں سے قطع نظر صرف بہت بنیادی نام لیے جائیں تو اس ضمن میں حالی اور اقبال کے نام اور ان کے شخصی مرثیے نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔

پروفیسر سید وقار عظیم ان دونوں کے شخصی مرثیوں کو جو اہمیت دیتے ہیں اس کا اندازہ ان کی اس رائے سے کیا جاسکتا ہے:

> 'شخصی مرثیہ نگاری میں جن لوگوں نے اپنے لیے ایک جگہ بنائی اور انیس کا حریف ہونے کا مرتبہ حاصل کیا ان میں دو نام نمایاں اور امتیازی ہیں ایک حالی اور دوسرا اقبال کہ قوم کے ان دونوں سپوتوں نے جب بھی مرثیہ لکھا ہے اسے اپنے دردِ دل کی آواز بنایا اور پڑھنے والوں کو رلایا ہے اور ان دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگاری کی تاریخ میں ایسے نقوش کا اضافہ کیا ہے جو فنا کی تفسیر کرتے ہوئے بھی اپنا رشتہ بقا کے دامن سے جوڑتے ہیں۔'۱۳۳

اقبال اور حالی کے مرثیوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اقبال کا مرثیہ اگر چہ بہت پُر زور اور پُر تاثیر ہے لیکن وہ انہوں نے اپنی ماں کے گزر جانے پر لکھا جبکہ حالی کے مرثیے قوم کی برگزیدہ ہستیوں کے بارے میں ہیں مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

> 'حالی نے قوم کی بعض برگزیدہ ہستیوں کے لیے مرثیے لکھے ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں پہلے نہ تھی۔'۱۳۴

حالی نے جن شخصیات پر مرثیے لکھے ہیں ان میں غالب، محسن الملک، حکیم محمود خان دہلوی، ملکہ وکٹوریہ اور سر سید احمد خان کی وفات پر لکھے جانے والے مرثیے بہت اہم ہیں۔سر سید پر لکھے جانے والے مرثیوں کے ذیل میں حالی کا یہ قول ہے کہ:

۱۳۱۔ شہنشاہِ سخن (کراچی: مدینہ پبلشنگ کمیٹی، اشاعت اول، ۱۹۷۰ء)، ص ۱۳

۱۳۲۔ حالی کی شخصی مرثیہ نگاری، مشمولہ جمنا ئنٹ، سہ ماہی، ہریانہ اردو اکیڈمی، شمارہ جنوری ۱۹۸۷ء، ص ۸۱

۱۳۳۔ اردو میں مرثیے کا ارتقا، مشمولہ نگار، (پاکستان)، شمارہ مئی جون، ۱۹۶۷ء، ص ۳۷

۱۳۴۔ اردو زبان و ادب، مشمولہ قومی زبان کراچی، شمارہ اگست، ۱۹۷۹ء، ص ۲۲

'جس قدر مرثیے اردو، فارسی اور انگریزی میں اس حادثے پر لکھے گئے ہیں ظاہراً واقعۂ کربلا کے بعد کسی شخص کی موت پر لکھے گئے ہوں گے۔'[۱۳۵]

حالی نے سب سے پہلے شخصی مرثیوں کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر زور دیا وہ کہتے تھے کہ مرثیے کو صرف واقعہ کربلا تک محدود نہیں ہونا چاہیے ان کے الفاظ یہ ہیں:

'مرثیے کو صرف واقعۂ کربلا کے ساتھ مخصوص کرنا اور تمام عمر اسی ایک مضمون کو دُھراتے رہنا اگر محض بہ نیت ثواب ہو تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن شاعری کے فرائض اس سے زیادہ وسیع ہونے چاہئیں۔'[۱۳۶]

حالی کی یہ رائے یا ان کی یہ صلاح کہ مرثیے کو کربلا تک محدود نہ کیا جائے اس بارے میں ڈاکٹر احسن فاروقی کہتے ہیں کہ: 'یہ صلاح نہایت معقول ہے۔'[۱۳۷]

حالی کا نظریہ یہ ہے کہ کربلا پر لکھے جانے والے مرثیوں کی بہ نسبت جو مرثیے اپنے عہد کی شخصیات یا قوم کے محسنوں کے متعلق لکھے جاتے ہیں اس سے عوام الناس میں پیروی کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'یہ اعتقاد کہ جو کچھ صبر و استقلال و شجاعت و ہمدردی و وفاداری و غیرت و حمیت و عزم بالجزم دیگر اخلاق فاضلہ خود امام ہمام اور ان کے عزیزوں اور دوستوں سے کربلا میں ظاہر ہوئے وہ مافوق طاقت بشری اور خوارق عادات سے تھے۔ کبھی ان کی پیروی اور اقتداء کرنے کا تصور دل میں آنے نہیں دیتا۔'[۱۳۸]

حالی اس ذیل میں شخصی مرثیے کی اہمیت کے حوالے سے بنیادی بات جو کہتے ہیں وہ یہ ہے:

'اس زمانے میں کہ مسلمانوں کی قومی بندش ڈھیلی ہوگئی ہے اور تمام جماعتوں میں تفرقے پڑے ہوئے ہیں ان میں ہمدردی کا بیج بونے اور قومیت کی روح پھونکنے کی از بس ضرورت ہے۔ جہاں اس کی اور بہت سی تدبیریں ہیں ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ قوم میں سے جب قوم کا کوئی محسن اور خدمت گار گزر جائے تو اس کی زندگی کے حالات قلم بند کیے

۱۳۵۔ حیاتِ جاوید (دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۹ء)، ص ۴۷۵

۱۳۶۔ مقدمہ مع دیوانِ حالی (کانپور: نامی پریس، ۱۸۹۳ء)، ص ۱۹

۱۳۷۔ اردو میں تنقید (لکھنؤ: ادارۂ فروغِ اردو، سنہ اشاعت ندارد)، ص ۶۶

۱۳۸۔ مقدمہ مع دیوانِ حالی (کانپور: نامی پریس، ۱۸۹۳ء)، ص ۲۱

جائیں اور شعرا جو قوم کی زبان ہیں تمام قوم کی طرف سے ان کے مرثیے لکھیں تاکہ معلوم ہو کہ قوم اپنے محسنوں کی قدر کرتی ہے۔'[۱۳۹]

اس بحث میں ایک اہم پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے وہ یہ بھی نکتہ بتاتے ہیں:

'سچ تو یہ ہے کہ کسی شخص کی نیکی، بزرگی اور مقبولیت کا ثبوت جیسا کہ مرثیے کے ذریعے سے ہوسکتا ہے اور کسی ذریعے سے نہیں ہوسکتا جو تعریف کسی کے مرنے کے بعد کی جاتی ہے اس میں بناوٹ یا تصنع کا گمان ہرگز نہیں ہوسکتا۔'[۱۴۰]

نسیم امروہوی کے سماجی تصورات کا جائزہ لیتے ہوئے مقالے کے دوسرے باب میں ہم نے اس پہلو پر تحقیقی حوالے سے لکھا ہے کہ نسیم ادب و سماج کے باہمی رشتوں کے معاملے میں سرسید اسکول سے نزدیکی رکھتے ہیں اسی وجہ سے وہ حالی کے اکثر و بیشتر افکار کے ہم خیال ہیں۔ شخصی مرثیے لکھنے پر اگرچہ ان کی مخالفت کی گئی لیکن وہ اسی فکر کو آگے لے کر چلتے رہے کہ مرثیے کو اپنے عہد کی تصویر اس طرح بنایا جائے کہ ان شخصیات کے بھی مرثیے لکھے جائیں جن کی تعلیمات سماج کے لیے مشعلِ راہ ہوں۔ ڈاکٹر سید محمد سیادت اس حوالے سے لکھتے ہیں:

'نسیم نے شخصی مرثیوں کے سلسلے میں یہ تلازم برتا ہے کہ انھوں نے صرف انہیں افراد کے سلسلے میں قلم اٹھایا ہے جو اپنے عہد کے نامور اور سربرآوردہ اشخاص میں ممتاز حیثیت کے حامل رہے ہیں جن کا وجود سماج کی عظمت کا ضامن اور جن کا کردار معاشرے کے لیے ایک علامت تصور کیا جاسکتا ہے۔ ان مخصوص افراد میں یا تو ایسے علمائے کرام ہیں جن کا وجود سماج کے لیے باعث رحمت اور سبب ارتقا رہا ہے یا ایسے عظیم افراد سے متعلق ہیں جن کی شخصیت اپنے عہد کے دانشور طبقے میں اپنی فکر و بصیرت کے لحاظ سے مسلمہ حیثیت کی حامل رہی ہے۔

سماجی اصلاح کے پیشِ نظر یہ بھی ممکن تھا کہ صرف ان ہی علما کا کردار پیش کیا جائے جو علمائے سلف میں عظیم مقام کے حامل رہے ہیں لیکن اس طرح وہ مقصدیت پوری حاصل نہیں ہوسکتی تھی جو موجودہ دور کے علما کا کردار پیش کرنے میں حاصل ہوسکتی

۱۳۹۔ مقالاتِ حالی، بحوالہ رئیس احمد جعفری، بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت سوم، اکتوبر ۱۹۶۹ء)، ص ۳۸۲

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۳۸۲

ہے اس لیے کہ سماج میں جو شخصیت عوام کے سامنے زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوتی ہے اس کے کردار سے عوام زیادہ متاثر ہوتی ہے بہ نسبت اس کردار کے جو عوام کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہو۔ چنانچہ اسی پہلو کی اہمیت و افادیت کو سامنے رکھتے ہوئے نسیم نے ان ہی شخصیات کے مراثی لکھے ہیں جو دورِ حاضر میں بہ لحاظ علم و دانش اور بہ لحاظ عظمت کردار منفرد حیثیت کے مالک تھے۔[۱۴۱]

نسیم کی شخصی مرثیہ نگاری کا آغاز لکھنؤ کی ایک بڑی علمی شخصیت سید ناصر حسین المعروف ناصر الملت کی وفات ۱۹۴۰ء پر لکھے جانے والے مرثیے سے ہوتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی خودنوشت میں انہیں لکھنؤ کا سب سے بڑا 'مجتہد' لکھا ہے۔[۱۴۲] اس طویل مرثیے میں علم کی عظمت، علم پر ایک فلسفیانہ نظر، عالم کی قدر و منزلت اور علم و عرفان سے فیضان حاصل کرنے والے معاشرے کے عالم انسانیت میں مقام کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔

اس بحث میں وہ علم نباتات، منطق و فلسفہ، جغرافیہ، طب، ریاضی، فنِ سرود اور علمِ برقیات کا ذکر کرتے ہیں اور نتیجے پر یہ بات کہتے ہیں کہ فکر و نظر اور ذوقِ بصیرت سے جو آدمی بے نیاز ہے وہ آدمی کہلانے کا مستحق نہیں ہے:

یہ عالم جبال یہ دنیائے بحر و بر — جغرافیے کے موجد و بانی ہیں سر بسر
یہ ابر و باد و ژالۂ شبنم یہ خشک و تر — طبعی علوم کا ہیں خزانہ پئے بشر
پنہاں جو خط و خال ہیں نقشِ شہود میں
آیا اسی سے علم مساحت وجود میں

ہوتے ہیں روز و شب جو زمانے میں واقعات — مل جل کے لکھ رہے ہیں یہ تاریخ کائنات
علمِ حیات کی ہے بنا خود یہی حیات — ہر چیز ہر وجود ہر اک شے ہر ایک بات
ہر فلسفے کی عقل بشر رازدار ہے
منطق ہمارے نطق کا اک شاہکار ہے

۱۴۱۔ نسیم امروہوی ایک تعارف (دہلی: کلر پرنٹنگ پریس، جنوری، ۱۹۹۱ء)، ص ص ۱۱، ۲۳

۱۴۲۔ یادوں کی بارات (لاہور: اردو ڈائجسٹ پرنٹرز، مئی، ۱۹۷۵ء)، ص ۲۶۲

برق تپاں سے حکمت برقی ہے ضوفشاں　　فطرت کے قاعدے ہیں ریاضی کے رازداں
طب کا وجود، جسم بشر میں ہے خود نہاں　　فنِ سرود، نغمۂ بلبل سے ہے عیاں
تمہید ساز۔ بربطِ بادِ بہار ہے
استادِ رقص۔ گردش لیل و نہار ہے

ڈالے جو خلقت بشری پر کوئی نگاہ　　پائے گا اس کو عالم اکبر کی جلوہ گاہ
مخفی مجاز میں ہے حقیقت۔ خدا گواہ　　حق تو یہ ہے کہ دہم 'انا الحق' نہیں گناہ
خود نفس کا بغور بشر امتحان لے
پہچان لے خدا کو جو اپنے کو جان لے

حاصل بدون علم نہیں دین کا کمال　　سجدہ ملائکہ کا بشر کو، ہے اس پہ دال
کیا کیا بیاں ہو علم کے فضل و شرف کا حال　　دنیا اگر ہے مال تو ہے علم راس مال
حد ہوگئی کہ فضل خدائے مجید سے
عالم کا مرتبہ ہے زیادہ شہید سے

آفاق میں فریضۂ سمع و بصر ہے علم　　ایماں ہے استوار بشر کا۔ اگر ہے علم
اس سمت حق کی جلوہ گری ہے، جدھر ہے علم　　خالق ہے جس کی حدِ نظر۔ وہ نظر ہے علم
بے علم شان حق کو کبھی جانتا نہیں
جو جانتا نہیں ہے وہ پہچانتا نہیں

وہ آنکھ جو ہے ذوقِ بصیرت سے بے نیاز　　وہ کان جو کہ سن نہ سکے نغمہ ہائے راز
وہ عقل جس کو فکر و نظر سے ہوا احتراز　　وہ دل کہ جس میں سوزِ طلب سے نہیں گداز
جس کا یہ رنگ ڈھنگ یہ شیوہ یہ طور ہے
واللہ آدمی وہ نہیں ہے کچھ اور ہے[۱۴۳]

اگر چہ یہ بند بہت علمی اور فلسفیانہ ہیں اور ان میں بڑے گہرے نکات موجود ہیں لیکن علمی شخصیات پر لکھتے ہوئے شاید اسی طرزِ فکر کی ضرورت ہے۔ یہ مباحث اور یہ باریکیاں سننے والے پر علم کی عظمت کے ساتھ عالم کی عظمت کا احساس بھی پیدا کرتی ہے۔ رسول، امام اور اصحاب کی پیروی اور ان کے

۱۴۳۔　وانا صرد (لکھنؤ: ادبی پریس لاٹوش روڈ، ۱۹۴۳ء)، ص ص ۲۸، ۲۹

پیغام سے مکمل استفادہ اٹھانے سے آدمی کو اپنی محرومی اور کم علمی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اپنے ہی ماحول کی اکابر شخصیات سے علم کے موتی لینا اور ان جیسا علم دوست بننا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے اگر چہ یہ اتنا آسان بھی نہیں ہوتا لیکن پھر بھی دل کی امنگیں اس راستے پر آدمی کو لیے چلتی ہیں۔

نسیم کے شخصی مرثیوں کا یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ وہ صرف اپنے اطراف اور اپنے ماحول ہی کی شخصیات کو موضوع نہیں بناتے بلکہ وہ علمی شخصیات جو اسلامی سماج اور اسلامی تہذیب و تمدن کے سلسلے کی ایک بنیادی کڑی کہی جاسکتی ہیں وہ ان کی موت سے بھی اپنے معاشرے کے لیے تعلیم، تربیت، سماجی اصلاح اور علم و عمل کی ترغیب کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال کر اپنے مقصدِ شعر گوئی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ عراق کے ایک بزرگ عالم محسن الحکیم کی وفات (۱۹۷۰ء) پر لکھے جانے والے مرثیے کا پیش لفظ لکھتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ:

> "نسیم نے اس مرثیے میں ایک ہزار سال کے مسلمان اکابر علما کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس تذکرے سے وہ ان اکابر کی یادیں ہمارے دلوں میں تازہ کر دیتے ہیں"۔[۱۴۴]

یعنی ایک طرح نسیم ہمیں ہماری علمی تاریخ اور ہمارے ماضی سے متعارف کراتے ہیں اور ان کے یادگار علمی زمانے کی تصویروں کو اس طرح سامنے لاتے ہیں کہ نئی نسلوں کو اپنے حال اور مستقبل کو سنوارنے کا حوصلہ ملتا رہے۔

نسیم کے شخصی مرثیوں کے مضامین میں جو باتیں نمایاں کی گئی ہیں اس میں زندگی کے کسی نہ کسی روشن پہلو کی ترجمانی کی گئی ہے:

دل رحم سے لبریز، خدا دوست، خود آگاہ
اس کے بھی مددگار جو مضطر ہو سرِ راہ
ہر اپنے پرائے کے دل و جاں سے بہی خواہ
نظروں میں مساوات تو سب بندۂ اللہ[۱۴۵]

(مرثیۂ تصویر)

۱۴۴۔ دیباچہ مشمولہ رثائے محسن الحکیم (کراچی: کل پاکستان فروغِ مرثیہ، ۱۹۷۰ء)، ص ۷

۱۴۵۔ تصویر حسین کی یاد میں، مشمولہ، ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۲۵

ہمت کی طرح فکر، سرافراز و سر بلند
سیرت کی طرح نطق، توانا وارجمند
فن کے مجاہدے میں ظفر یاب و فتح مند
دل انقلاب پیشہ، نظر ارتقا پسند[۱۴۶]

(مرثیۂ جوش)

گرم ہے مکر وریا کا جو یہاں پر بازار　　لائق پیروی دقت ہو کس کس کردار
علم، عالم سے ہے عالم بھی ہیں اکثر بیکار　　جہل کے سر پر خوشامد نے رکھی ہے دستار
کیا فضائل لکھے یہ خامہ ہزاروں اے دوست
بے پڑھے لکھے ہیں علامہ ہزاروں اے دوست

تھی یہ کوشش کہ بدل دیں یہ رسومات ورواج　　ذوقِ تعلیم سے دیں اپنے زمانے کو خراج
جادۂ علم پہ آجائے ترقی کا مزاج　　روح مستقبل انساں ہو سراپا یہ سماج
ہو اندھیروں کی گھٹن دور نور گھر روشن ہو
امتیازات مٹادیں تو نظر روشن ہو[۱۴۷]

(مرثیۂ مولانا احمد)

نسیم کے ان شخصی مرثیوں کا محرک اگر چہ کسی کی موت کا سانحہ ہے لیکن ان مرثیوں میں غم کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے کہ اس کو سننے یا پڑھنے کے بعد اداسی وافسردگی دل کو نہیں گھیرتی بلکہ ان شخصیات کے کردار کی بلندی، ان کے پیغامِ تعلیمات اور جن مشکلات میں انہوں نے زندگی گزاری یہ سب پہلو ذہن میں ایک روشنی پیدا کر دیتے ہیں اور دل میں یہ امنگ پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم مرنے والے کی ان کوششوں اور ان تمناؤں کو مرنے نہیں دیں گے جن میں معاشرے کی ترقی اور بقا کی روشنی موجود ہے۔ علی سردار جعفری نے جاں نثار اختر کے لکھے ہوئے شخصی مرثیوں پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ بات لکھی تھی کہ:

'ان نظموں میں زندگی کا مثبت تصور ہے جو غم کو غم تو سمجھتا ہے لیکن دنیا کے مسائل سے چشم

۱۴۶۔ مرثیۂ جوش (کراچی: لشکرِ ادب، ۱۹۸۲ء)، ص ۲۱

۱۴۷۔ مرثیہ غیر مطبوعہ مملوکہ عدنان حیدر کلیم، فرزند تسیم ابن نسیم امروہوی

پوشی نہیں سکھاتا۔'۱۴۸

علی سردار جعفری کی اس رائے کا لفظ بہ لفظ اطلاق ہم نسیم کے شخصی مرثیوں پر بھی کر سکتے ہیں۔

اسی طرح نسیم نے اپنے ہم عصر پاکستانی خطیبوں، دانشوروں اور شاعروں کی وفات پر جو مرثیے لکھے ان میں جوش ملیح آبادی، سید آل رضا، ڈاکٹر یاور عباس، علامہ رشید ترابی اور سید تصویر حسین سے متعلق لکھے جانے والے مرثیے اس عہد کی علمی و ادبی تاریخ کے بعض بنیادی پہلوؤں کی عکاسی بھی کرتے ہیں اور معاشرے کے لیے علم و ادب کی پیروی کا راستہ بھی دکھاتے ہیں۔ واقعاتِ کربلا سے متعلق مرثیے اور ان شخصی مرثیوں کے اس بنیادی مطالعے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نسیم نے ان شعری تخلیقات سے ماضی کی تصویروں کو حال کے آئینے میں اور حال کو مستقبل کے لیے ایک روشن مثال بنا کر اس طرح پیش کیا ہے ان کا یہ سارا ادبی سفر ہمارے سماجی اور تہذیبی ارتقا کی ایک داستان بن گیا ہے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین نے یہ درست لکھا ہے کہ:

> 'نسیم کے پورے کلام کو دیکھ لو یہ ہمارے معاشرتی اور فکری ارتقا کی تصدیق و توثیق ہے اور ہمارے تہذیبی ارتقا کی ایک زندہ تاریخ ہے۔'۱۴۹

۱۴۸۔ بحوالہ آفاق حسین صدیقی، جاں نثار اختر کے شخصی مرثیے، مشمولہ نیا دور (ہندوستان)، شمارہ اکتوبر، ۱۹۷۹ء، ص ۴۰

۱۴۹۔ لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں، مشمولہ، ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۳

اختتامیہ

اختتامیہ (Conclusion)

'پاکستانی ادبیات اور نسیم امروہوی ایک سماجی مطالعہ' کے موضوع کو اس مقالے میں بنیاد بنا کر ہم نے سات ابواب کے تحت ایک مطالعہ کیا جس میں ہم تحقیق کے مختلف مرحلوں سے بھی گزرے۔ اور ان کی تمام تصنیفات وتالیفات کا بھی ہم نے جائزہ لیا۔

نسیم امروہوی اردو زبان و ادب کی ان معتبر مگر گوشہ نشیں شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے زندگی بھر علم وادب سے اپنا رشتہ قائم رکھا۔ ہماری تحقیق کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ہم ایک ایسی بڑی علمی و ادبی شخصیت کی تمام نہیں تو بیشتر ادبی خدمات کو تو ضرور سامنے لے کر آئے جن کی بظاہر شہرت محض ایک مرثیہ نگار کے طور پر تھی عام لوگوں کے سامنے یہ بات بہت کم آ سکی کہ وہ صرف ایک مرثیہ نگار نہیں تھے اُن کی علمی شخصیت کے اور بھی دائرے ہیں جو بہت وسیع ہیں وہ شاعر تو تھے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک لغت نگار، فرہنگ نویس، صحافی، مورخ، ایڈیٹر، مفسر، مترجم، ماہرِ لسانیات، ماہرِ اقبالیات اور بچوں کے لیے ایک بڑا ادب تخلیق کرنے والی شخصیت تھے۔ کم وبیش سو سے زیادہ ان کی تصانیف ہیں۔

اس تحقیقی مقالے میں ہم نے ان کی خدمات کا اس تناظر میں زیادہ جائزہ لیا کہ ہم ہر حوالے سے ان کا مطالعہ کرتے ہوئے سماجی مطالعہ کو زیادہ اہمیت دیں اور یہ دیکھیں کہ معاشرے کی قدر و قیمت اور انسانی اقدار کے متعلق وہ اپنی تحریروں میں کیا تصور رکھتے ہیں۔ پاکستانی ادبیات اور نسیم امروہوی کے تسلسل میں ہم نے جن موضوعات کو خاص طور سے پیشِ نظر رکھا اور جن بنیادوں پر ہم نے اپنے ابواب قائم کیے ان میں 'تحریک پاکستان'، 'سندھی ادب وثقافت'، 'زبان وادب کے علاقائی رشتے'، بچوں کے ادب سے ایک قلبی رشتہ، نظموں اور مرثیوں میں اسلامی سماج اور برصغیر کے سماج کی تصویریں اور خصوصاً اقبالیات کے حوالے سے

سماج میں اسلامی اقدار کی ترویج اور معاشرتی زندگی کے علمی وفکری تقاضوں کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

نسیم ہمارے ان قلم کاروں میں درجہ اول کی حیثیت رکھتے ہیں جنہوں نے ادب کا اور اپنی دوسری علمی خدمات کا رشتہ اپنے سماج سے جوڑے رکھا۔ ان کی مرثیہ نگاری تک میں سماجی زاویے موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر لکھنے والے کیوں لکھتے ہیں؟ شاعر کی شاعری، مفسر کی تفسیر، صحافی کی صحافت، مرثیہ نگار کی مرثیہ نگاری، ڈرامہ نگار کی ڈرامہ نگاری، لغت نگار کی لغت نگاری کیا محض لفظوں کا کھیل ہے اور یہ سب ادبی دوڑ دھوپ اور علمی سرگرمیاں اس لیے ہیں کہ ہم اپنے ذہن کو ایک تسکین دیتے رہیں کہ ہم جو لکھ رہے ہیں اس کے پڑھنے اور سننے والے محظوظ ہو رہے ہیں نہیں...... ایسا نہیں ہے۔ ادب اگر اپنے عہد اور اپنے سماج سے رشتہ توڑ لے تو پھر وہ وقت کے زیاں کے سوا کوئی دوسری حیثیت نہیں رکھتا۔ نسیم امروہوی کے سماجی تصورات کے تفصیلی مطالعے میں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان کی تخلیقی سرگرمیاں ہی سماج کے خدوخال ترتیب دیتی ہیں۔ آخر سماج میں زندگی کی ارتقائی صورت کیسے سامنے آئے گی؟ یقیناً وہ جب ہی سامنے آئے گی جب انسانی ذہن کی نشوونما ہوگی۔ نسیم چاہے تاریخ کے حوالے سے لکھیں چاہے صحافت ان کا موضوع ہو۔ چاہے بچوں کے لیے لکھیں یا پھر مرثیہ تصنیف کریں ان سب کے پیچھے ان کا مقصد انسانی ذہن کی نشوونما ہے۔

ہماری ادبی تاریخ میں ادب اور سماج کے تعلق پر جو بحثیں ہوئیں اکثر لکھنے والے اس کا رشتہ ترقی پسند تحریک (۱۹۳۶ء) سے قائم کرتے ہیں جبکہ اس کی بنیادیں ہمیں سرسید اور حالی کے زمانے سے نظر آتی ہیں۔ نسیم نے یوپی کے جس علاقے میں آنکھیں کھولیں یعنی امروہہ، وہاں کی نئی نسل سرسید، حالی، اکبر الہ آبادی اور اقبال سے بہت متاثر تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ان کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں اور یہی نسیم کے بچپن اور لڑکپن کا دور ہے۔ چنانچہ اپنی شاعری کی ابتدا ہی سے سماجی حوالے سے اپنے ذہن میں وہ کچھ خیالات رکھتے تھے جس کا اظہار ان کی سب سے پہلی نظم 'گلِ خوش رنگ' (۱۹۲۳ء) میں ہوا۔ اپنے لوگوں کو جدوجہد، محنت، لگن اور رنگ ونسل کی تفریق سے بلند کرنے کا پیغام اس نظم میں موجود ہے۔ یہ نظم ۱۹۲۳ء کی ہے۔ نسیم کا انتقال ۱۹۸۷ء میں ہوا اور وہ اپنی زندگی کے آخری برس تک لکھنے پڑھنے سے وابستہ رہے۔ اس طرح ان کی ادبی زندگی کم وبیش ۶۵ برسوں پر محیط ہے۔ اس تمام طویل عرصے میں ان کی ادبی زندگی ادب برائے زندگی کے نظریے سے وابستہ رہی۔ وہ ادب برائے ادب کے نظریے کو زندگی کے ارتقائی سفر میں ایک رکاوٹ تصور کرتے تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ ادیب ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے نظریے کا مبلغ بن جائے اس کا اظہار تو اس کی تحریروں کے اندر دوڑتی ہوئی زندگی سے لگایا جاسکتا ہے۔ وہ سرسید کے رسالے

'تہذیب الاخلاق' سے متاثر رہے۔ سرسید کو انہوں نے سرسید اعظم کے نام سے یاد کیا۔ علیگڑھ میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو کالج قائم ہوا اسے انہوں نے مسلمانوں کی ایک نئی حیات قرار دیا۔ نسیم کی ادبی خدمات کا ایک بڑا حصہ نصابی کتابوں سے متعلق رہا ان تمام میں انہوں نے ایسے موضوعات کو زیادہ اہمیت دی جو براہِ راست سماج کی زندگی کو آگے بڑھانے میں حصہ لیتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جب برصغیر میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی اسی سال انہوں نے سازِ حریت کے نام سے ایک طویل مسدس لکھا جس میں حقوق العباد کے تذکرے کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ اسی مسدس کے بعض حصوں میں انہوں نے سماج میں اقلیتوں کے حقوق کو بھی موضوع بنایا۔ وہ خطباتِ مشران کے مقدمے میں روسو کے نظریے کو بنیاد بناتے ہوئے ادب اور سماج کے تعلق سے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہیں انہوں نے یہ بات لکھی ہے کہ ادب جس معاشرے میں پیدا ہوتا ہے وہ انسانوں کا معاشرہ ہوتا ہے اگر ادب انسانوں کو زندگی کی حقیقی تصویریں نہیں دکھا رہا تو اس کی ساری دوڑ دھوپ بیکار ہے۔

ہم ادیب کی زندگی کے مطالعے سے بھی اس کے نظریات اور اس کی نفسیات تک پہنچ سکتے ہیں نسیم صاحب کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ مال و دولت سے زیادہ ان کی دولت قلم اور قلم کی حرمت تھی۔ وہ ایک متوسط طبقے کے فرد تھے ان کے آباؤ اجداد کی اتنی زمینیں تو تھیں کہ گزر بسر میں کچھ سہولتیں پیدا ہو سکیں لیکن یہ لوگ زمیندار کبھی نہیں تھے۔ خود نسیم صاحب نے اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ درس و تدریس کے راستے سے ان پر رزق کے دروازے کھلے۔ سخت محنتی انسان تھے۔ انسان کی عزت اور انسانی اقدار کا انہوں نے ہمیشہ پاس رکھا۔ ترقی اردو بورڈ کے ادارے میں لغت نگاری میں ان کے رفیقِ سفر بزرگ سندھی دانشور پیر حسام الدین راشدی کا یہ قول ہم نے پہلے بھی نقل کیا ہے کہ نسیم صاحب میں انہیں اعلیٰ انسانی اقدار کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ ان کے مرثیے میں یہ اعلیٰ اقدار جگہ جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان کے مرثیوں کی بیانیہ سادگی میں یہ خوبی بہت زیادہ ہے۔

نسیم کی پوری شاعری میں مذہبیات کا عنصر کچھ کم نہیں مگر ان کا مذہب انسان دوستی کا مذہب تھا۔ ان کے کچھ شاگردوں نے مجھے بتایا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ لوگ نفاذِ اسلام کی بات تو کرتے ہیں نفوذِ اسلام کی بات نہیں کرتے...... پیشِ نظر مقالے میں ان کی فکر کا پھیلاؤ تو ہم اور آپ دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی رثائی شاعری کے اندر جو ایک زندگی کی لہر ہے وہ سب سے الگ ہے۔

وہ نزاعی چند بحثیں کٹ چکے جس پر گلے
دین و دنیا کے ہیں کچھ ان کے سوا بھی مسئلے
(ارمغانِ نسیم، ص ۲۹۵)

اپنی شاعری اور نثری تحریروں میں اکثر ان کا موضوع ان کا سماج اور اس کے مسئلے ہیں۔ لیکن ان حدود میں رہ کر انہوں نے تمام انسانیت کو موضوع بنایا۔ انہوں نے منبر پر بیٹھ کر مرثیے بھی پڑھے لیکن یہ مصرع بھی انہی کا ہے ۔

عصرِ نو پختہ ہوا اور فکرِ منبر خام ہے
(ارمغانِ نسیم، ص ۲۹۵)

وہ اپنی تحریروں میں اپنے سماج اور عصرِ نو کے معاملات سے گریزاں کہیں بھی نہیں ہیں۔ لیکن ان معاملات میں وہ محض نعرے بازی کی شاعری کے آدمی نہیں ہیں۔ سماجی ادب لکھنے والوں پر یہی اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ یہ عارضی اور وقتی فکر لے کر آتے ہیں لیکن نسیم کی وہ شاعری اور وہ تحریریں جس کا سماج سے رشتہ قائم ہوتا ہے ان میں تخلیقی حسن کہیں مدہم نہیں ہوتا۔

اسی تخلیقی حسن کے ساتھ وہ سماج کے موضوع سے عالمگیر سماج کے موضوع تک پہنچ جاتے ہیں۔ زندگی کی وہ اقدار جن کا تذکرہ وہ اپنے چاروں طرف کے ماحول اور اپنے سماج کے توسط سے کرتے ہیں ان میں کچھ ایسے پہلو اور ایسی اقدار نمایاں ہوتی ہیں جو زندگی کی بنیادی اقدار ہوتی ہیں اور اس طرح ان کی تحریروں میں آفاقیت جھلکنے لگتی ہے۔

آفاقی شاعر ہونے کی شرط یہ قرار نہیں دی جاسکتی کہ اسے سب لوگ تسلیم کر لیں۔ دنیا کے کسی بھی بڑے شاعر سے عقیدے، نسل یا زبان کی بنیاد پر کسی نہ کسی گروہ یا حلقے کو یقیناً اختلاف ہوگا۔ ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ اس کے سامنے زندگی کے روشن افق ہیں یا نہیں ہیں۔ اس نے اقدار کا کوئی تصور دیا ہے یا نہیں اور اگر یہ پہلو اس کے یہاں ہیں اور اس کی فکری سطح بھی بلند ہے تو ہم اسے آفاقی شاعر یقیناً تسلیم کر لیں گے۔

نسیم کی ادبی کاوشوں میں جو بات ادب و سماج کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے بہت اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ ان کی تحریروں کا مجموعی اثر ہم پر مایوسی کے اثرات قائم نہیں کرتا۔ دوسرے باب میں ہم نے انتظار حسین کا یہ قول لکھا ہے کہ حالی نے جب مسدس لکھی تھی تو سرسید بہت پریشان ہوئے اور

انہوں نے کہا کہ اس سے تو مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔نسیم کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنی نظم، اپنے کسی مقالے یا اپنے کسی مضمون کے مجموعی تاثر میں ہمیں زندگی کا کوئی نہ کوئی روشن افق ضرور دکھاتے ہیں۔انہوں نے غزلیں بھی روایتی طرز کی نہیں لکھیں اس میں ہجر و وصال کی وہ داستانیں بھی نہیں ہیں جو ہماری اردو کی سیکڑوں غزلوں میں پائی جاتی ہے۔ان کی غزل زندگی کے سفر میں ہمیں ایک نئے جذبے سے روشناس کراتی ہے۔حالات وزمانے کی پستیوں سے افسردہ ہوکر ہمیں شکستہ نہیں ہونے دیتی۔ان کی غزل کا یہ لہجہ اسی حقیقت کا ترجمان ہے ؎

انقلاب اے مقصدِ تخلیقِ ہستی انقلاب
یہ جہانِ آب وگل اب تک مرے قابل نہیں

جب وہ انقلاب کو ہستی کا مقصد قرار دیتے ہیں تو پھر ان کی فکر کے حوالے سے ہمارے سامنے کوئی بات اُلجھی ہوئی نہیں رہ جاتی۔بچوں کے ادب سے لے کر صنفِ مرثیہ تک وہ اسی جدوجہد اور سماجی ترقی میں دوڑ دھوپ کو اولیت دیتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ایک خیال یہ پایا جاتا ہے کہ مرثیے کے معنی کیونکہ رونے رلانے کے ہیں اس لیے اس کا لکھنے والا اپنے، سماج، ماحول اور اپنے لوگوں کو افسردہ دلی کی طرف مائل کرتا ہے لیکن نسیم نے ایسا نہیں کیا انہوں نے مرثیے کو وہ روایتی مرثیہ نہیں بنایا جو گریہ وزاری کے محدود تصورات تک تھا۔انہوں نے مرثیے کو انسانی رشتوں کی ایسی شاعری میں تبدیل کر دیا جس میں تمام رشتے کسی اعلیٰ مقصد کی لگن میں سرگرم عمل ہوں۔ان کے مرثیے کی یہ مشہور بیت ان کے سماجی تصور کو بہت واضح کر دیتی ہے ؎

فراتِ دہر کا پانی سب ہی کو پینے دو
یہی ہے رازِ بقا دوسروں کو جینے دو

ڈاکٹر عقیل رضوی نے اپنی کتاب 'مرثیے کی سماجیات' میں یہ بات لکھی ہے کہ نسیم امروہوی اس صدی کے وہ واحد مرثیہ نگار ہیں جنہوں نے خواتین کے کرداروں کو مرثیے میں زیادہ اُجاگر کیا ہے۔اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وہ حقوقِ نسواں کی تحریکوں کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں۔تنگ نظری اور تعصبات اور حقوق چھین لینے کی وہ گھٹن جو ہمارے معاشرے میں پائی جاتی ہے نسیم نے اپنے مرثیوں میں کہیں نہ کہیں اس کی تردید میں کوئی بات ضرور کہی ہے۔پاکستان کے دیہی علاقوں خصوصاً سندھی سماج میں عورتوں کے حقوق کی پامالی سے وہ بہت بدظن تھے۔چنانچہ اس زمانے کی اکثر و بیشتر تحریروں میں اسی حوالے سے ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ایک ساتھ اردو اور سندھی زبانوں میں نکلنے والا اخبار 'مراد' جس کے وہ ایڈیٹر تھے اس میں پاکستانی سماج میں

سندھی عورت کے حقوق کو انہوں نے اکثر اداریوں میں لکھا۔ تاریخِ خیر پور میں ان عناصر کی نشاندہی کی جو ایک کمزور سماج کو کمزور سے کمزور کرتے چلے جاتے ہیں۔ لغت نگاری ان کے نزدیک لفظوں کا کھیل نہیں ہے انہوں نے اسے سماجی مظہر قرار دیا۔ لغت نویس ایک طرح سے اپنے سماج ہی کی مختلف تصویروں کو پیش کرتے ہیں۔ رئیس اللغات میں انہوں نے بعض الفاظ کی وضاحت میں یہ بھی کیا کہ کسی منظر یا کسی شے کی تشریح کے لیے تصویر کی ضرورت بھی محسوس کی اور یہ تصویر وہاں موجود ہے۔ وہ ایک مقام پر لغت کو خضرِ کارواں قرار دیتے ہیں اس ترکیب میں ان کی پوری فکر پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ زبان کو پریم کا بندھن اور محبت کا رشتہ کہہ کر لفظ کو ہمارے ذہنوں میں جگہ دیتے ہیں۔ ان کی دونوں فرہنگ، فرہنگ اقبال اردو اور فرہنگ اقبال فارسی اور خود ان کا اقبال پہ وسیع کام محض تحقیقی نوعیت کا کام نہیں ہے۔ اقبال کی شاعری میں اسلامی سماج کی جو تصویریں ابھرتی ہیں نسیم اپنے پڑھنے والوں کو اس کی روشنی میں لے کر چلتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کے فلسفوں کو اپنے کئی مضامین اور نظموں میں اس انداز سے پیش کیا کہ پڑھنے والے اقبال کی فکر سے بھی آگاہ ہوئے اور نسیم کے توسط سے انہیں بہت سے کھٹن فلسفوں کو ایک بہت سہل انداز میں سمجھنے کا امکان پیدا ہوا۔ مختصر یہ کہ نسیم کی غزل ہو، نظم ہو، صحافت یا مرثیہ ہو، مذہبیات سے متعلق بعض بحثیں یا اقبالیات کے حوالے سے کوئی مطالعہ یہ سب کسی نہ کسی راستے سے سماج کی اُن حدود میں داخل ہو جاتی ہیں جو زندگی کے امکانات کی طرف بھی لے کر جاتی ہیں اور ادب کے اس مقصد کی بھی ترجمانی کرتی ہیں کہ ادب سماجی مطالعے میں مشعل کا کام بھی دیتا ہے جس سے پڑھنے والوں کے دلوں میں تاریکیوں سے نکلنے کا جذبہ ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔

ضمیمہ (الف)

نسیم امروہوی کی تصنیفات و تالیفات: تعارفی نوٹ

ضمیمہ 'الف'

لغات وفرہنگ

- نسیم اللغات
- رئیس اللغات
- جامع نسیم اللغات
- فرہنگِ اقبال (اردو)
- فرہنگِ اقبال (فارسی)

صحافت وتاریخ

- جنگِ عالمگیر
- اخبار مراد
- تاریخِ خیر پور

لسانیات، قواعد وفن

- معراج العروض
- تسہیل القواعد
- نسیم البلاغت
- حدائق البلاغت
- نسیم القواعد
- ہندوستانی بول چال (۸ حصے)
- کوہِ نور ریڈر (۸ حصے)
- الصرف
- النحو

- آئینِ اردو (۸ حصے)

تراجم

- تفسیرِ اصفی
- الاعیار
- ابوالکمال
- دوست بنو دوست بناؤ
- صحیفۂ کاملہ
- مناسکِ حج
- توضیح المسائل
- توضیح المسائل (دوسرا حصہ)
- ترجمہ تفسیر پارۂ عم

بچوں کا ادب

- پھولوں کا ہار
- چراغِ زندگی (۲ حصے)
- ہنسوں کی رانی اور دیگر طیور
- اردو ادب (۸ حصے)
- گلزارِ نسیم (۵ حصے)
- نسیم امروہوی (۸ حصے)

نصابی کتب

- شرحِ کلام میر و غالب
- نقادِ شعر

- شرح مصباحِ فارسی
- شرح جواہر فارسی
- استاد کا پیغام شاگردوں کے نام

رثائی ادبیات

- مرقعِ غم
- پیغامِ انقلاب
- روحِ انقلاب
- سازِ حریت
- قرآنِ السعدین
- کشمکش
- فلسفۂ غم
- مراثیِ نسیم (جلد اوّل)
- چشمۂ غم
- تسبیحِ فاطمہ
- دعائے فاطمہ
- مومنِ آلِ ابراہیم
- مراثیِ نسیم (جلد دوم)
- مسدسِ نسیم
- صبحِ ازل
- مراثیِ نسیم (جلد سوم)

مطبوعہ شخصی مرثیے

- دانا صرہ

- بیادِ نہال محمد
- رثائے محسن الحکیم
- مرثیۂ جوش

تحقیق وتنقید

- خطباتِ مشران (حصہ اوّل)
- نظم اردو
- نثر اردو
- ادبی کہانیاں
- سعادت امروہوی
- کلیاتِ ناز
- فرہنگ اقبال اردو پر ایک مخصوص طبقے کے اعتراضات اور اُن کے جوابات

شاعری

- برق وباراں

سوانحی تصانیف

- خودنوشت سوانح حیات (حصہ اوّل)
- سیرتِ سجاد

نایاب مطبوعات

- اکتشافات تام
- تنبیہہ
- شہید انسانیت کا تبصرہ منظوم

- ریل کا سفر، نظم
- خمسۂ متحیرہ، شاعری
- المنطق
- قواعد وانشائے اردو
- ملتِ شیعہ اور سیاسیات حاضرہ
- رہٹ چلے اور من للچائے
- رشوت ستانی
- معلم المکاتب
- ملاپ (ڈرامہ)
- دینیات کی پہلی کتاب
- دینیات کی چوتھی کتاب
- نصیحت کا کرن پھول
- نمازء بیون عبادتون
- الفلسفہ
- ارمغانِ عقیدت
- دستورِ اساسی
- نامکمل مسودات
- دستیاب قلمی نوادرات
- گمشدہ تحریریں
- رسالۂ کنتوری
- فرہنگِ شہباز
- صوفی شعرا کا قلندرانہ کلام

نسیم امروہوی کی تصنیفات وتالیفات......تعارفی نوٹ

ضمیمہ (الف)

نسیم صاحب کی ولادت ۱۹۰۸ء کی ہے لیکن اس زندگی کا آغاز جس کا تعلق ان کی علمی وادبی زندگی سے ہے وہ ۱۹۲۳ء میں ہوا جب انھوں نے پہلی نظم 'گلِ خوش رنگ' لکھی۔ ان کی وفات فروری ۱۹۸۷ء کی ہے اس سے ایک سال قبل ۱۹۸۶ء میں ان کی آخری کتاب 'خودنوشت سوانح حیات' شائع ہوئی اور پھر ان کی وفات کے دو سال بعد ۱۹۸۹ء میں فرہنگِ اقبال فارسی منظرِ عام پر آئی۔ اس کے بعد سے اب تک یعنی ۱۹۸۹ء سے ۲۰۰۶ء تک ابھی کوئی مزید غیر مطبوعہ کتاب ہمارے سامنے شائع ہوکر نہیں آسکی ہے۔

جناب نسیم امروہوی پر اپنی تحقیق کے دوران میرے لیے یہ تلاش بھی میرا ایک تحقیقی فریضہ رکھتی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ ان کی جملہ تحریریں کتنی ہیں اور کہاں ہیں۔ ان کی غزلیں، نظمیں، مرثیے، حمد ونعت، تنقیدی مضامین، نصابی کتابیں، لغات وفرہنگ، تاریخ واخبارات کی تدوین، ڈرامے، کہانیاں۔ ان کے لکھے ہوئے دیباچے، مقدمے، تقاریظ سیمینار میں ان کے مقالے یا مختلف ادبی وسماجی اجتماعات میں ان کی تقریریں...... یقیناً یہ ایک مشکل مرحلہ تھا پھر اس تحقیق کے دوران اور ان کے شاگردوں اور اہل خانہ، ان کے خاندان کے بعض افراد سے مل کر اور ان سے گفتگو کر کے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ نسیم صاحب اپنی تحریروں کو یکجا رکھنے کے معاملے میں ایک طرح سے بے نیاز تھے اسے لاپرواہی بھی کہہ سکتے ہیں ان کے پاس ان کی مطبوعہ کتابیں اور مضامین ایک چوتھائی بھی محفوظ نہیں تھے۔ ان کے صاحبزادے قسیم ابنِ نسیم جو ان کے ادبی وارث بھی ہیں ان کے پاس تحریریں ہیں۔ بعض شاگردوں کے پاس سے کوئی ایک آدھ چیز دستیاب ہوئی ہے۔ کوٹ ڈیجی خیر پور میں سرائی امداد علی صاحب کے گھر جہاں اکثر نسیم صاحب قیام پذیر رہے ہیں وہاں بھی چند قلمی مرثیے تھے۔ بیشتر کتب کراچی کے ایک خطیب سید علی کرار نقوی صاحب کے نادر کتب خانے سے ملیں۔

نسیم کی تمام تحریروں کا صحیح اندازہ ان کی وفات کے بعد ہی لگایا جاسکتا تھا جبکہ ان کا علمی وادبی سفر ختم ہو چکا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے حوالے سے اہلِ قلم حضرات نے جو کچھ لکھا ہے اور اس میں جہاں جہاں ان کی تصنیفات کا تذکرہ آیا ہم نے اس کو حوالہ بنایا ہے۔ ان کے صاحبزادے قسیم ابنِ نسیم نے ان کی وفات پر جو نظم لکھی تھی اس کے ایک شعر میں یہ بیت لکھی ہے۔

ایک دو چار نہ دس بیس کتابیں لکھیں
آپ نے ایک سو چالیس کتابیں لکھیں [۱]

احمد حسین صدیقی نے بھی یہ تعداد ۱۴۰/ ہی لکھی ہے۔[۲] ڈاکٹر شبیہہ الحسن ۱۲۹/ کتابوں کا ذکر کرتے ہیں۔[۳] سید تقی الحسن لکھتے ہیں کہ ایک کتاب نہیں بلکہ ۱۴۶/ کتابیں لکھی ہیں بعض کتابوں کی چار چار پانچ پانچ جلدیں ہیں۔[۴] شبنم بختیار نے ان کی مرثیوں کی تعداد ۲۲۵/ سے زیادہ بتائی ہے اور یہ لکھا ہے کہ ان کی کثیر تعداد چھپ چکی ہے۔[۵] جبکہ یہ بات تحقیقی طور پر غلط ہے ابھی تو ان کے آدھے مرثیے بھی شائع نہیں ہوسکے ہیں۔ پروفیسر سردار نقوی کا یہ کہنا ہے کہ انہوں نے اندازہً دو لاکھ سے زیادہ شعر کہے ہیں۔[۶] ڈاکٹر ہلال نقوی ان کے مرثیوں کی تعداد ۲۰۹/ اور تالیفات و تصنیفات کی تعداد ۱۴۷/ بتاتے ہیں مگر ساتھ ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"نسیم صاحب نے اپنی خودنوشت سوانح حیات کے (مطبوعہ ۱۹۸۶ء) آخر میں اپنی

۱۔ شاعری خون میں رچ بس کے ورق تک پہنچی، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۷۵

۲۔ کشورِ اولیا (کراچی: محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۰۳ء)، ص ۴۸۴

۳۔ بجھی وہ شمع (لاہور: اظہار سنز، جون ۱۹۸۷ء)، ص ۱۷

۴۔ نسیم امروہوی کی علمی شخصیت کے بعض پہلو، مشمولہ، ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۶۷

۵۔ نسیم امروہوی بحیثیت شاعر، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے ۱۹۸۹ء، مملوکہ شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج فیصل آباد، ص ۳۸

۶۔ نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۳۲

کتابوں کی ایک فہرست درج کی ہے جس میں رثائے نجم العلماء، سچل سرمست کی اردو شاعری......رثائے ترابی اور بیادِ رضا بھی شامل ہیں۔ یہ شعری ونثری تخلیقات اصل میں رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ کتابی صورت میں طبع نہیں ہوئیں اس لیے ہم انہیں علیحدہ کتابی حیثیت میں شمار نہیں کر رہے۔' ۷

نسیم صاحب کی نثری کتابیں اور ان کی غزلیں اور نظمیں تو اپنی جگہ پر خود ان کے مرثیوں کی تلاش و تحقیق ہی ایک سخت مرحلہ ہے۔ ان کا ۲۳ر نومبر ۱۹۷۶ء کا ایک خط جو ہلال نقوی کے نام ہے ان کے مرثیوں کے متعلق بڑی معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس کا ایک حصہ ہم یہاں نقل کر رہے ہیں:

'میرے مراثی ہجرت کے وقت اور اس سے پہلے بھی اتنے منتشر تھے کہ مجھے خود بھی یہ یاد نہیں کہ کُل کتنے مرثیے کہے اور وہ اب کہاں کہاں ہیں۔ بعد میں سوچا کہ جتنے یاد آئیں یا ریکارڈ میں کہیں مل جائیں ان کے مطلع شائع کر دوں باقی کے لیے اس وقت سوچا جائے گا جب وہ ہاتھ آئیں گے۔

میرے مراثی کے بعض اجزاء (مثلاً رخصت، جنگ، رجز یا شہادت وغیرہ) جناب سید باقر علی خاں فہیم رئیس جانسٹھ کے پاس تھے۔ جو میرے دادا مرحوم اعلیٰ اللہ مقامہ، کے شاگرد تھے۔ میرے مراثی اور بھی چند اشخاص کے پاس تھے، کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے واپسی کے وعدے پر میرے بستے کے اصل مرثیے مجھ سے لے لیے تھے۔ مگر میں نے ایسی گھبراہٹ میں ہجرت کی کہ سب مرثیے چھوڑ کر پاکستان کی طرف بھاگنا پڑا۔ یہاں آنے کے بعد ان لوگوں سے بذریعہ خط و کتابت جو ہجرت کر کے یہاں آ گئے تھے ان سے دست بستہ میں نے اپنے مرثیے حاصل کیے۔ با ایں ہمہ ابھی ان لوگوں کے پاس اور بھی مرثیے ہیں جو ابھی تک مجھے نہیں مل سکے۔ ایسے اصحاب میں چند کے نام یہ ہیں:' ۸

اس کے بعد انہوں نے اپنے خط میں ۱۸ر عام لوگوں کے اور بعض مختلف شخصیتوں کے نام لکھے ہیں برصغیر میں جن کے ذاتی کتب خانوں میں ان کے مرثیے موجود ہیں۔ ہم نے ان تمام باتوں،

۷۔ ارمغانِ نسیم، ایضاً، ص ۱۹۱

۸۔ قلمی مکتوب

شہادتوں اور مختلف اہلِ علم حضرات کی آرا کی روشنی میں اپنی تحقیقی کوششوں سے ان کی تحریروں کے متعلق جو نتائج حاصل کیے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

لُغات وفرہنگ

نسیم اللغات......شیخ غلام علی اینڈ سنز کتاب منزل لاہور، ۱۹۵۵ء

نسیم امروہوی نے اردو لغت نویسی کے ذیل میں جو خدمات انجام دی ہیں ان میں سب سے زیادہ شہرت نسیم اللغات کو حاصل ہوئی۔ تقریباً ۷۰ ہزار الفاظ پر مشتمل اس لغت کے ٹائیٹل پر یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اس لغت میں وہ الفاظ بھی شامل ہیں جو آج تک کے تمام سیاسی و معاشی انقلاب کے بعد اردو میں جگہ پا چکے ہیں ۹۹۸ رصفحات پر مشتمل اس لغت کے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ماہرین اس لغت کو مختلف وقتوں میں نئی ترتیب کے ساتھ شائع کرتے رہے چنانچہ بعض ایڈیشنوں میں نسیم صاحب کے ساتھ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل اور مولانا آغا محمد باقر کے نام بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس لغت کو ہم پاکستان میں نسیم کا سب سے پہلا علمی وادبی کام قرار دے سکتے ہیں۔

رئیس اللغات......ملک دین محمد تاجران کتب لاہور، ۱۹۵۶ء

نسیم اللغات کے ایک سال بعد یہ لغت منظرِ عام پر آئی اس کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں بعض لفظوں کی تشریح میں تصویریں بھی بنائی گئی ہیں تاکہ لغت سے استفادہ کرنے والا لفظ کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکے مثلاً پیانو، بگونا، طنبورہ، آڑو، گرز اور اسی طرح لاتعداد الفاظ کی وضاحت میں تشریح کے ساتھ ساتھ تصویر سے بھی وضاحت کی گئی ہے یہ لغت بہت نایاب ہے سید علی کرار نقوی کے ذاتی کتب خانے واقع فیڈرل بی ایریا میں اس کا ایک نسخہ میری نظر سے گزرا ہے۔ اس لغت کے حوالے سے نسیم صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:

> "نسیم اللغات کی ترتیب سے میں فارغ ہوا تھا کہ ایک دوسرے پبلشر نے لغت شائع کرنے کے لیے مجھ سے گفتگو کی۔ میں نے اپنے بھائی اور دوست رئیس امروہوی کے نام پر رئیس اللغات اس کا نام تجویز کیا۔ پبلشر نے بعض مقامات پر تحریف کر کے اسے شائع کیا جس سے یہ دائرہ لغت سے خارج ہوگئی کیونکہ کاپی رائٹ پبلشر کے تھے اس

لیے میں بے بس تھا۔' [۹]

جامع نسیم اللغات......شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، لاہور، اشاعت اول ۱۹۹۶ء

نسیم امروہوی کے حوالے سے ۱۹۷۰ء کے عشرے کی یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ہلال نقوی صاحب لکھتے ہیں:

'نسیم اللغات جس کے متعدد ایڈیشن پاکستان میں شائع ہوئے اسے لفظوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ساتھ فرہنگِ نسیم کے عنوان سے مرتب کرنے کا آغاز ۱۹۷۷ء میں ہوا۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور کے زیرِ اہتمام یہ کام وہ اپنے گھر پر ہی انجام دے رہے تھے اس زمانے میں ناصر نامی ایک کاتب صبح سے نمازِ مغرب کے وقت تک ان کے یہاں رہتا کتابت ہوتی اور روز کے روز اس کی تصحیح ہوتی اس زمانے میں کچھ مسودات میں نے بھی پڑھے۔' (ارمغانِ نسیم، ص ۷)

شیخ غلام علی نے نسیم صاحب کے انتقال کے ۹ ر سال بعد اسے شائع کیا اور اس کا نام جامع نسیم اللغات رکھا جبکہ اس لغت میں شامل نسیم صاحب کے لکھے ہوئے مقدمے سے یہ اظہار ہوتا ہے کہ اس کا اصل نام فرہنگِ نسیم تھا [۱۰] ڈاکٹر شبیہہ الحسن نے بھی اپنی ایک تحریر میں فرہنگِ نسیم، کا ذکر کیا ہے۔ [۱۱]

فرہنگِ اقبال (اردو)......اظہار سنز لاہور، ۱۹۸۴ء

علامہ اقبال کا وہ تمام تر اردو کلام جو بانگِ درا، بالِ جبرئیل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز اور باقیاتِ اقبال کے علاوہ اخبارات و رسائل میں بھی محفوظ ہوا۔ یہ اس تمام کلام کی ایک ضخیم فرہنگ ہے جو ۸۷۰ ر صفحات پر مشتمل ہے۔ رئیس امروہوی نے 'اقبالیات' کچھ تشریحات ۔ کچھ 'انکشافات' کے عنوان سے اس فرہنگ کا مقدمہ لکھا۔

۹۔ بحوالہ مکتوب نسیم بنام ہلال نقوی، مرقومہ ۱۱ر نومبر ۱۹۷۹ء، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن سادات امروہہ، فروری ۱۹۹۲ء، طبع اول)، ص ۱۸۸

۱۰۔ مقدمہ، مشمولہ، جامع نسیم اللغات (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۶ء)، ص ۸

۱۱۔ بجھی وہ شمع (لاہور: اظہار سنز، جون ۱۹۸۷ء)، ص ۱۸

فرہنگ اقبال (فارسی)......اظہار سنز لاہور، ۱۹۸۹ء

علامہ اقبال کے فارسی کلام کے سات مجموعوں کا ذکر اس فرہنگ کے صفحہ اول پر کیا گیا ہے جن کے نام یہ ہیں اسرارِ خودی، رموزِ خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، مثنوی پس چہ باید کرد، ارمغانِ حجاز۔ ان تمام مجموعوں اور باقیاتِ اقبال کے اشعار سے بھی نسیم نے یہ فرہنگ ترتیب دی ہے۔ ابتدائی صفحات میں جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جاوید اقبال، پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، میرزا ادیب، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، شان الحق حقی، وارث سرہندی اور ڈاکٹر علی نواز بلوچ کی آرا دی گئی ہیں۔ مقدمہ ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے۔ نسیم صاحب کے انتقال کے بعد ان کی یہ پہلی تالیف ہے جو منظرِ عام پر آئی۔

لغت نویسی کے ذیل میں نسیم امروہوی کی خدمات کا جب بھی جائزہ لیا جائے گا ترقی اردو بورڈ (وزارتِ تعلیمات حکومتِ پاکستان) کے تحت تیار ہونے والی اردو لغت کے لیے ان کی روز و شب کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔[۱۲]

صحافت و تاریخ

جنگِ عالمگیر......اشاعت اردو لکھنؤ، ۱۹۴۵ء

دوسری جنگ عظیم کے روزانہ کے حالات جو مختلف اخبارات (ہمدم، حقیقت اور قومی آواز) میں چھپتے تھے ان

۱۲۔ ۱۹۸۸ء میں وزارتِ تعلیمات حکومتِ پاکستان نے جو ترقی اردو بورڈ قائم کیا تھا اسے آکسفورڈ ڈکشنری کے اصول اور معیار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تاریخی اصول پر اردو لغت کی تدوین کرنا تھی۔ بورڈ نے ۱۹۶۱ء سے نسیم امروہوی کی خدمات حاصل کیں۔ جنہوں نے ۱۸ سال تک یہاں انتھک محنت کی۔ ابتدائی چار سالوں تک وہ نائب مدیر رہے اس کے بعد کم و بیش ۹ سال انہوں نے مدیر کے طور پر کام کیا اور آخری ۷ سال مدیر اول رہے۔ ۱۹۷۹ء میں بورڈ سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ اس وقت تک گیارہ جلدوں کی تیاری میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ لیکن اس تمام تر اعتراف کے باوجود کیا ہم اس لغت کو براہ راست نسیم صاحب کی تالیفات میں شمار کر سکیں گے؟ یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ترقی اردو بورڈ نسیم امروہوی کی خدمات بلکہ اعلیٰ ترین خدمات کا منکر نہیں ہے لیکن کیوں کہ یہ ایک بورڈ کے تحت تیار کی گئی ہے اس لیے اس کتاب پر بحیثیت مولف نسیم صاحب کا یا کسی دوسرے ادیب کا نام درج نہیں ہوتا۔ (جاری ہے......)

تمام کو نسیم نے ایک جگہ جمع کر کے پوری تنظیم کے ساتھ ترتیب دیا لیکن یہ محض مضامین اور خبروں کو یکجا کر دینا ہی نہیں تھا انہوں نے اس تمام پس منظر میں جنگ کے محرکات کا بھی جائزہ لیا۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی جب امروہہ سے کراچی آئے تو ایک ملاقات میں انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ کتاب ان کے کتب خانے میں موجود ہے۔ [۱۳]

اخبار مراد......مراد برقی پریس، خیر پور میرس ۱۹۵۱ء تا ۱۹۶۱ء

یہ پاکستان کا پہلا اخبار ہے جو سندھی اور اردو زبان میں شائع ہوتا تھا۔ اخبار روز نامہ نہیں تھا بلکہ سہ روزہ تھا۔ نسیم اس کے بانی بھی تھے اور ایڈیٹر بھی۔ ۱۹۵۱ء میں اس کا پہلا اخبار شائع ہوا۔ ۱۹۶۱ء کے بعد اس کی اشاعت بند ہوگئی اس اخبار کے ایک معاون یکتا امروہوی نے مجھے بتایا کہ دس برسوں میں کم از کم ۶۰۰ /اخبار ضرور شائع ہوئے ہوں گے ان کا کہنا تھا کہ ۱۹۸۳ء تک خیر پور پبلک لائبریری میں اس کا کافی ریکارڈ موجود ہے۔ [۱۴]

تاریخ خیر پور......مراد برقی پریس، خیر پور میرس، ۱۹۵۵ء

کم وبیش دوسو صفحات پر مشتمل خیر پور کی سماجی، سیاسی اور ریاستی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے سابق شیخ الجامعہ اور تاریخ کے ایک استاد ڈاکٹر محمود حسین کے تعارفی کلمات اس میں شامل ہیں۔

۱۹۷۷ء میں اس کی پہلی جلد جب منظرِ عام پر آئی تو اس کے صفحہ نمبر ۳ پر اہلِ قلم شخصیات کے نام اس ترتیب سے لکھے ہوئے ہیں۔ مدیر اعلیٰ، ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم (۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۱ء) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (۱۹۷۶ء تا حال)......مدیر اول ڈاکٹر شوکت سبزواری (۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۳ء)......مولانا نسیم امروہوی (۱۹۷۳ء تا حال)، پریس کاپی: (۱) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، (۲) مولانا نسیم امروہوی

۱۳۔ کراچی، ۱۷/فروری ۲۰۰۶ء

۱۴۔ کراچی، ۱۵/اپریل ۲۰۰۲ء

لسانیات،قواعد وفن

معراج العروض......انوار احمدی پریس الہ آباد،۱۹۲۹ء

اس کتاب کا موضوع اردو کے عروض وقواعد ہیں۔علمِ عروض کیا ہے؟اس کی تشریح کرتے ہوئے نسیم نے پہلے باب کے آغاز میں لکھا ہے:

> ’علم عروض کا خلیل بن احمد نے مکہ میں ایجاد کیا۔عروض مکہ کا نام ہے اس لیے بطور مجاز مرسل اس علم کا نام عروض رکھ دیا گیا۔ یہ وہ علم ہے جس سے اشعار کا صحیح وزن معلوم ہوجاتا ہے۔(ص،۳)

اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ نسیم صاحب نے علمِ عروض سے متعلق بہت سے قاعدے اور اصول نظم بھی کر دیے ہیں جس سے مشکل فنی بحثیں بھی آسان ہوگئی ہیں۔اس کتاب کے کچھ نسخے قسیم ابنِ نسیم کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

تسہیل القواعد......انوار احمدی پریس الہ آباد،۱۹۳۰ء

اردو کے قواعد پر یہ ایک آسان مقالہ ہے جسے کتاب کی شکل دی گئی ہے۔سید علی کرار نقوی کے کتب خانے میں اس کے دو نسخے موجود ہیں۔

نسیم البلاغت......انوار احمد پریس الہ آباد،۱۹۳۲ء

معراج العروض کی اشاعت کے تین سال بعد یہ کتاب منظر عام پر آئی۔لسانیاتی حوالوں سے بھی اس میں بعض بحثیں شامل ہیں اور علمِ عروض پر بھی کچھ حصے لکھے گئے ہیں۔

حدائق البلاغت......انوار احمدی پریس الہ آباد،اشاعت ندارد

اس کتاب کو بھی معراج العروض اور نسیم البلاغت کے سلسلے کی ایک کڑی کہنا چاہیے۔

نسیم القواعد...... گیا پرشاد پبلشر آگرہ، ۱۹۳۷ء

نسیم البلاغت، حدائق البلاغت اور معراج العروض کی نسبت اس کتاب میں قواعد پر تفصیلی بحث موجود ہے۔ ۳۲ ذیلی سرخیوں کے تحت بحثوں کو سمیٹا گیا ہے۔ ابتدائی حصے پر انہوں نے لکھا ہے کہ 'قواعد کی جو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں ان کے مسائل کسی ایک مشرقی یا مغربی زبان کی تقلید کا ارادہ کر کے مرتب کیے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک اردو کی صحیح قواعد ایک بھی تیار نہ ہو سکی۔ (ص،۵۰)

لسانی حوالے سے اسے ایک اہم درجہ حاصل ہے۔ کتاب کے صفحہ اول پر نسیم صاحب کے نام کے ساتھ رکن انجمن ترقی اردو دکن بھی لکھا ہوا ہے۔

ہندوستانی بول چال (۸ حصے)......رام چرن لال، لکھنؤ اشاعت ندارد

اس کتاب کو کامن لینگو یج میں لکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے ذیل میں یہ وضاحت کی گئی ہے:

'اردو ہندی رسم الخط میں ایک ہی عبارت میں اسے مرتب کیا گیا مثلاً گائے سے متعلق یہ شعر۔

دودھ دہی اور مٹھا مسکا
دیا ہے سب کچھ جو تھا بس کا

یہ لفظ اردو ہندی دوں زبانوں میں مشترک ہے۔' [۱۵]

کوہِ نور ریڈر (۸ حصے)......نند کشور بھارگو بنارس، اشاعت ندارد

ہندوستانی بول چال کی طرز پر ہی یہ کتاب ترتیب دی گئی۔

الصرف......شیخ غلام علی لاہور، ۱۹۵۳ء

علمِ صرف سے متعلق ایک تفصیلی جائزہ

۱۵۔ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۱۸۷

النحو ...... شیخ غلام علی لاہور، ۱۹۵۳ء

علم نحو کے موضوع پر بعض انتہائی بنیادی باتوں کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے۔

آئین اردو (۸ حصے) ...... کتاب منزل لاہور، ۱۹۵۲ء

قواعد و انشا اور املا نگاری کے فن پر بحث کی گئی ہے۔

تراجم

تفسیرِ اصفی ...... نور المدارس امروہہ، اشاعت ندارد

عربی زبان میں تفسیرِ صافی، ملا محسن فیضی کی کتاب ہے۔ نسیم نے اس کا ترجمہ کیا اور حاشیے بھی لکھے [۱۶] اردو کے استاد اور نقاد پروفیسر مجتبیٰ حسین نے اس کا ایک نسخہ مدرسۂ ایمانیہ جونپور میں دیکھا تھا۔[۱۷]

الاعیار ...... انوار احمدی پریس الہ آباد، ۱۹۳۲ء

علمِ عروض سے متعلق معیار الاشعار طوسی ایک اہم کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اسے بہت مشکل تصور کیا جاتا تھا۔ نسیم صاحب نے اسے 'الاعیار' کے نام سے آسان ترجمہ کیا۔ کامل کے امتحان کے لیے طلبا اس سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

ابوالکمال ...... شیخ جان محمد تاجرانِ کتب لاہور، ۱۹۴۹ء

نسم صاحب نے کم و بیش دس کتابوں کے ترجمے کیے جو عربی، فارسی، سندھی اور انگریزی زبانوں پر مشتمل تھیں۔ ابوالکمال ترجموں کے سلسلے کی ایک اہم کتاب کہی جانی چاہیے یہ 'دفتر ابوالفضل' اول اور سوم کا ترجمہ ہے جو ۳۴۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ صفحہ ۱۱۸ سے ۱۲۹ تک اور پھر صفحہ ۳۴۷ سے ۳۶۸ تک 'فرہنگِ الفاظ' بھی دی گئی ہے۔ 'دفتر ابوالفضل' کی زبان قدیم فارسی ہے اور نسیم صاحب نے اسے جس مہارت سے اردو میں

۱۶۔ ایضاً ص ۱۸۵

۱۷۔ ایضاً

ڈھالا ہے اس کی صحیح تعریف ماہرینِ لسانیات ہی کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نواز علی شوق نے نسیم صاحب کی وفات پر اپنے تعزیتی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے پیر حسام الدین راشدی کا قول نقل کیا ہے جو قدیم فارسی پر نسیم کی استادانہ مہارت سے متعلق ہے۔ [۱۸]

ڈاکٹر حسین محمد جعفری نے تو دفتر ابوالفضل ہی کے حوالے سے ان کے بارے میں یہ بات کہی ہے جسے گزشتہ کسی باب میں ہم لکھ بھی چکے ہیں کہ: 'میں نے ان کو فارسی کی مشکل ترین کتابیں دفتر ابوالفضل اور سہ نثری ظہوری اس طرح پڑھاتے دیکھا ہے جیسے وہ ساری زندگی انہی کتابوں کو پڑھاتے رہے ہیں۔ [۱۹]

نسیم صاحب ابوالکمال کے ابتدائی صفحے میں 'غرضِ مولف' کے تحت لکھتے ہیں:

> 'میں اپنی اس شرح میں نیز ہر شرح میں ایسا ترجمہ لکھتا ہوں جو بول چال کے خلاف نہ ہو اور لفظی بھی رہے۔'

کتاب کے سرورق پر اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ: 'انشائے ابوالفضل دفتر اول وسوم کا لفظ بہ لفظ سلیس ترجمہ اور تشریح مطالب مع ترکیب، تشریح لغوی وصرفی ونحوی وتلمیح وواقعات'

اس کتاب کے آغاز میں نسیم صاحب نے ابوالفضل کی سوانح بھی لکھی ہے اور اس کی نثر کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

دوست بنو دوست بناؤ...... شیخ غلام علی لاہور، ۱۹۵۵ء

نسیم صاحب نے جن کتابوں کے ترجمے کیے وہ لفظ بہ لفظ ترجمے نہیں ہیں۔ نسیم نے اس کی بنیادی روح اور بنیادی خیالات تو باقی رکھے لیکن اپنے حاشیوں اور بعض افسانوں سے اسے بالکل دوسری صورت دے دی۔ ہم اس کتاب کو اگرچہ نسیم کے کیے ہوئے تراجم میں کے ذیل میں شمار کر رہے ہیں لیکن اس کی ایک اپنی جداگانہ حیثیت بھی ہے۔ کریم بخش خالد نے اس کتاب کے حوالے سے لکھا ہے:

> 'واقعات اور مثالیں سب مشرقی مذاق کی ہیں۔ جنہوں نے اس کتاب کو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت دے دی ہے۔' [۲۰]

۱۸۔ تعزیت نامۂ نسیم، مرتبہ قسیم ابن نسیم، کراچی ۱۹۸۷ء، ص ۱۱

۱۹۔ بحوالہ مقدمہ فرہنگ اقبال فارسی (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۹ء)، ص ۶، ۷

۲۰۔ ہمارے شہر کا ایک زندہ شاعر و ادیب، اشاعتِ ثانی مشمولہ ہفت روزہ 'ہمارا سندھ' آخری ہفتہ مئی، ۱۹۸۸ء، ص ۳

صحفیۂ کاملہ......شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۰ء

حضرت حسین ابنِ علی کے فرزند حضرت زین العابدین کی دعاؤں سے آراستہ یہ کتاب ایک علمی عربی زبان کے صاف اور سادہ اردو زبان میں ترجمے کی بہترین مثال ہے۔ ٹائیٹل پر اس کتاب کو 'زبورِ آلِ محمدؐ' کا نام بھی دیا گیا ہے، ساتھ ہی یہ نوٹ بھی درج ہے:

'اردو ترجمہ، مفید حواشی، مفصل مقدمہ، سیر حاصل تذکرہ، چند ادعیہ جو آج تک شائع نہ ہوسکیں'

دعاؤں سے پیشتر کتاب کے دو حصے انتہائی اہم ہیں۔ ایک ۹۵ رصفحات پر مشتمل وقیع مقدمہ، دوسرے حضرت زین العابدین کا بہت جامع تذکرہ جو صفحہ ۹۶ سے ۱۹۹ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد دعاؤں کا سلسلہ ہے جو صفحہ ۳۲۸ رتک جاتا ہے۔ اس حصے میں ایک طرف عربی میں دعائیں ہیں اور دوسری طرف ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی۔ اس کتاب کی قدر و قیمت اور نسیم صاحب کے علمی وقار کا اندازہ ان فٹ نوٹس میں بھی ہوتا ہے جو کئی مقامات پر ایک وضاحت لے کر آتی ہیں۔

مناسک حج......انجمن پریس لارنس روڑ کراچی، ۱۹۷۲ء

عراق کے بزرگ عالم دین اور مجتہد سید ابوالقاسم خوئی صاحب کی تعلیمات اور ارشادات جو عربی زبان میں تھیں یہ ان کا ایک بہت دلنشین ترجمہ ہے۔

توضیح المسائل......امین مرچینٹ کراچی، ۱۹۷۲ء

یہ بھی سید ابوالقاسم خوئی کے ان ارشادات اور احکامات کا اردو ترجمہ ہے جو زندگی کے مختلف مسائل دینوی اور دنیاوی دونوں سے متعلق ہے۔ اظہار سنز لاہور نے ۱۹۸۴ء میں اس کا ایک الگ ایڈیشن شائع کیا۔ ۳۵۶ ذیلی عنوانات کے تحت یہ کتاب ۴۸۴ رصفحات پر مشتمل ہے۔

توضیح المسائل (دوسرا حصہ)......امین مرچنٹ کراچی، ۱۹۷۳ء

یہ کتاب گذشتہ کتاب کا ایک جزو ہے جس میں اور صوم و طہارت کے مسائل کا اردو ترجم ہے۔

لاہور کے مشہور پبلشر شیخ نیاز احمد کا تذکرہ کرتے ہوئے سلطانہ مہر لکھتی ہیں:

'شیخ نیاز نے ایک دن مشہور انگریزی مصنف ڈیل کارنیگی کی مشہور کتاب How to win friends and influence people انہیں دکھائی اور کہا کہ کاش اردو میں بھی اس طرز کی کتابیں لکھی جائیں۔ نسیم صاحب نے قلم اٹھایا اور ہفتے بھر کے اندر نفسیات جیسے نازک موضوع پر ایک کتاب لکھ کر حوالے کر دی یہ کتاب بار ہا شائع ہوئی اور اب تک دس ہزار سے زیادہ فروخت ہوئی ہے۔' [۲۱]

ترجمہ وتفسیر پارۂ عم...... مہران بک سینٹر خیر پور میرس، ۱۹۸۳ء

نسیم امروہوی علومِ اسلامی پر دسترس اور عربی زبان پر مکمل گرفت کے سبب قرآن وحدیث کا ایک وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ ۱۹۸۰ء اور اس کے بعد کے عرصے میں انہوں نے ایک طرف اقبالیات پر برابر کام کیا اور دوسری طرف مذہبیات میں بھی فلسفے اور تاریخ کی توانائی کے ساتھ کچھ تحریریں اپنے یادگار اثاثے میں چھوڑیں انہی میں سے تراجم کے ذیل میں پارۂ عم کا ترجمہ وتفسیر ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس پارے کا ترجمہ اردو میں ہے لیکن تفسیر سندھی زبان میں ہے۔ نسیم صاحب سندھی زبان سے کافی حد تک واقفیت رکھتے تھے لیکن بعض مرحلوں پر انہوں نے محکمۂ تعلیم سندھ کے ایک پرنسپل سرائی امداد علی خاں کو بھی اپنے معاون میں شامل کر لیا۔

بچوں کا ادب

مقالے کے چوتھے باب 'بچوں کا ادب اور سماجی اقدار کی تقسیم' میں نسیم کی ان تمام تالیفات وتصنیفات کا تذکرہ ایک بنیادی تعارف کے ساتھ آ گیا ہے جو بچوں کے ادب سے متعلق ہیں۔ یہاں ان کتابوں کے صرف نام ادارۂ اشاعت اور سنِ اشاعت کا ذکر کیا جا رہا ہے:

- پھولوں کا ہار، بھارگو اسکول ڈپو لکھنؤ ۱۹۳۷ء
- چراغِ زندگی (۲ حصے)، پہلا ایڈیشن، پٹنہ، سنہ اشاعت ندارد
- ہنسوں کی رانی اور دیگر طیور، پہلا ایڈیشن لکھنؤ، اشاعت ندارد، دوسرا ایڈیشن، سکھر ۱۹۵۵ء
- اردو ادب (۸ حصے)، کتاب منزل لاہور ۱۹۵۳ء

۲۱۔ سخنور، تذکرہ شعرائے پاکستان (امریکہ: مہر بک فائڈیشن، بار سوم، ۲۰۰۰ء)، ص ۴۰۰

- گلزارِ نسیم (۵ حصے)، کتاب منزل لاہور، ۱۹۵۳ء
- نسیم اردو (۸ حصے)، کشمیری بازار لاہور، ۱۹۵۳ء

نصابی کتب

نسیم صاحب برصغیر میں نصابی کتابوں کے چند اہم مرتبین میں شمار ہوں گے مگر یہ پیش نظر رہے کہ یہ نصابی تحریریں طالب علم کی محض امتحانی ضرورت کی تکمیل کے لیے نہیں ہیں۔ ان کا مقصد اس محدود مقصد سے بہت آگے تھا۔ تقسیم سے پہلے بھی اور تقسیم کے بعد پاکستان میں بھی جو کتابیں ان کی مرتبہ منظرِ عام پر آئیں ان سب کی امتیازی صفت یہی ہے۔ نصابی حوالے سے ان کی کتب کے بنیادی تعارف سے اس حقیقت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

شرحِ کلام میر و غالب......انوار احمد پریس الہ آباد، ۱۹۲۸ء

میر تقی میر اور مرزا غالب کی بعض منتخب غزلیات کی تشریح۔ پہلے الفاظ کی وضاحت کی گئی ہے پھر شعر میں جو معنی پوشیدہ ہیں ان کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ الہ آباد میں منشی کے نصاب کی تکمیل کے لیے طلبا اسے لازمی طور پر پڑھا کرتے تھے۔

نقاوہ شعر......دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۳۱ء

اس کتاب کے ٹائیٹل پر کتاب کے نام کے نیچے وضاحت کی گئی ہے کہ یہ دار المصنفین اعظم گڑھ کی شائع کردہ کتاب 'شعر الہند' کا خلاصہ ہے۔ مصنف کے نام کے ساتھ یہ تعارفی سطر بھی ہے: 'مدرس اول مدرسہ باب العلم نوگانواں مراد آباد' یہ کتاب اگرچہ شعر الہند کا خلاصہ ہے لیکن اس میں نسیم کے اپنے اضافے بھی شامل ہیں۔ ابتدائی باب اردو زبان میں فنِ تنقید سے متعلق، پھر غزل، ریختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ و مثنوی، ڈرامے کا ذکر ہے۔ آخر میں صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری اور فلسفیانہ شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ نقاوہ کے معنی خلاصے کے ہیں۔

شرح مصباحِ فارسی......الہ آباد، انوار احمدی پریس، سنہ اشاعت ندارد

ہندوستان کے بعض شہروں اور قصبات خصوصاً الہ آباد کے وہ طلبا جو منشی کے نصاب کی تکمیل کرتے تھے اس کتاب میں ان کے لیے قدیم فارسی کے مضامین کی شرح کی گئی ہے۔

شرحِ جواہر فارسی......الہ آباد، انوار احمدی پریس، سنہ اشاعت ندارد

شرح مصباح فارسی میں قدیم فارسی کے مضامین کی شرح ہے تو اس کتاب میں جدید فارسی کے مضامین کی تشریح شامل ہے اور یہ کامل کے امتحان سے متعلق ایک نصابی سلسلہ ہے۔

استاد کا پیغام شاگردوں کے نام......انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ، یو پی، ۱۹۴۳ء

یہ کتاب طلبا کے حقوق و فرائض کا احاطہ کرتی ہے۔ پاکستان کے بعض اخبارات میں اس کے کچھ حصے بھی شائع ہو چکے ہیں۔[۲۲]

مندرجہ بالا تمام کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ تمام کتابیں بھی جن کا ذکر ہم نے بچوں کے ادب کی ذیلی سرخی میں کیا ہے ان میں سے بیشتر بچے کے نصابی ضرورت ہی کے تحت لکھی گئیں ہم انہیں بھی نسیم کے نصابی ذخیرے میں شمار کر سکتے ہیں۔

رثائی ادبیات

مرقعِ غم......نادری پریس جبلپور، ۱۹۳۵ء

نسیم صاحب نے ۱۹۲۳ء میں پہلا مرثیہ کہا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جبکہ ان کی مرثیہ گوئی کی مدت کو ۱۲ رسال ہوئے تھے ان کے چند مرثیوں کا ایک انتخاب مرقعِ غم نادری پریس جبلپور نے شائع کیا۔[۲۳] شمیم رضا ندیم نے بھی اس جلد کا تذکرہ کیا ہے۔[۲۴]

۲۲۔ خبر نامہ، انجمن ساداتِ امروہہ کراچی، مارچ ۱۹۶۸ء، ص ۳

۲۳۔ ۱۹۶۲ء کے چند جدید مرثیے (کراچی: دارالاشاعت اسلامی، ۱۹۶۲ء)، ص ۷۶

۲۴۔ گلہائے صدرنگ (کراچی: عظیمی پرنٹرز، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۱۶

پیغامِ انقلاب......نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۳۷ء

نسیم صاحب خیالی گنج لکھنؤ میں مقیم تھے جب ۱۹۳۶ء میں انہوں نے یہ مرثیہ کہا جسکا مطلع ہے ۔

اے انقلاب مژدۂ عزم و عمل ہے تو

۸۱ ربندوں پر مشتمل اس مرثیے کے متعلق مراثی نسیم [۲۵] میں یہ نوٹ موجود ہے:

'یہ سب سے پہلا مرثیہ ہے جس میں مصنف نے حقائق اور عقائد کو فلسفیانہ اندازِ بیان کے سانچے میں ڈھالا اور جدید تخیل کو قدیم فنی پابندیوں کے ساتھ سمو کر مرثیہ گوئی میں ایک نئے رنگ کی بنیاد ڈالی۔

روحِ انقلاب......نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۳۸ء

پیغام انقلاب کی اشاعت کے ایک سال بعد ہی مرثیہ کچھ تبدیلیوں کے ساتھ نظامی پریس لکھنؤ ہی نے شائع کیا۔ پہلے اس میں ۸۱ ربند تھے اب نسیم صاحب نے اس کے تین بند خارج کر کے ۷۸ ربندوں کے ساتھ اسے ایک نئی ترتیب دی۔

سازِ حریت......اشاعتِ اردو لکھنؤ، ۱۹۳۸ء

۱۰۴ ربندوں پر مشتمل یہ مرثیہ نسیم کے اہم مرثیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا تعارفی حصہ اس وقت کے ایک معروف ایڈوکیٹ برج ناتھ شرغا نے انگریزی زبان میں لکھا۔ مقدمہ ممتاز احمد صاحب نے لکھا۔ اس مقدمے کو صنفِ مرثیہ پر لکھے جانے والے بہت اچھے مقدموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مرثیے کی تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لینے کے بعد مقدمہ نگار نے نسیم امروہوی کے فنِ شاعری اور ان کی شخصیت پر بہت جامع بحث کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نسیم نے مرثیے کو انقلابی مشن کا آرگن بنایا ہے۔ قوم کی خرابیوں پر ان کی گہری نظر ہے وہ سماجی برائیوں کی بیخ کنی چاہتے ہیں ان کا مقصد لفظی بازی گری یا فنی شعبدہ بازی کبھی نہیں رہا۔ اس مرثیے کا اصل مقصد رسوم و رواج میں جکڑے ہوئے سماج کو اس کے نقصانات سے آگاہ کرنا ہے۔ دوسری بار ۱۹۴۲ء میں اس مرثیے کو نزولی ہاؤس لکھنؤ نے بعض نثری تحریروں کے اضافوں کے ساتھ شائع کیا جس میں پروفیسر حامد حسن قادری اور نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے مضامین مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر حفیظ

۲۵۔ جلد اول (کراچی: ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک، ۱۹۶۲ء)، ص ۱۱۷

سید نے انگریزی زبان میں اس مرثیے کا جائزہ لیا۔ بمبئی اور لکھنؤ کے بعض اخبارات کے تبصرے بھی تھے جو پہلے ایڈیشن کے حوالے سے تھے۔ ہندوستان میں اس کا ایک اور ایڈیشن علی گڑھ سے بھی شائع ہوا تھا۔[۲۶] اس کا ایک ایڈیشن ۱۹۸۱ء میں سکھر سے منظرِ عام پر آیا جسے اس کے مرتب اختر دہلوی نے چوتھے عکسی ایڈیشن کا نام دیا۔

قِرآن السعدین......انجمن یادگار شہید ثالث آگرہ، ۱۹۳۷ء

اردو لغت میں قِرآن کے معنی نزدیکی، قریب ہونا اور آپس میں دوست ہونے کے لکھے گئے ہیں[۲۷] 'قِرآن السعدین' دو اچھے ستاروں کے ایک برج میں جمع ہونے کو کہا جاتا ہے۔[۲۸] نسیم امروہوی نے نسیم اللغات[۲۹] میں اس کے معنی میں یہ بھی لکھا ہے کہ 'دو شریف اور لیاقت مندوں کی باہم شادی'۔ نسیم صاحب کے اس مرثیے کا موضوع دخترِ رسولؐ حضرت فاطمہ اور خلیفۂ چہارم حضرت علی کی شادی کا بیان ہے۔ اس طویل مسدس میں حضرت فاطمہ کے جہیز کی سادگی کا بیان کر کے انہوں نے مسلم گھرانوں کو ان جاہلانہ رسوم سے نکالنے کا احساس دلایا ہے جس نے اقتصادی طور پر انہیں مشکلات میں پھنسا دیا ہے:

دیکھو جہیز دخترِ سلطانِ انبیاء　　کُل ایک مِس کا جام ہے اور ایک بوریا
دو چادریں ہیں تارِ نظر سے نہیں سیا　　اک مشک، ایک کاسۂ چوبی، اک آسیا
زیور میں صرف چاندی کے دو باز و بند ہیں
سب ہیں وہ رنگ ڈھنگ جو سب کو پسند ہیں

کشمکش......سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۴۲ء

اس مرثیے میں نسیم صاحب نے شاعر اور رضوانِ جنت کے درمیان ایک طویل مکالمہ نظم کیا ہے۔ شاعر کو اپنی

۲۶۔ بحوالہ رئیس الحسن واسطی، علی گڑھ میری یادوں میں، مشمولہ راز دار (سونیئر) (سکھر: انجمن مہاجرینِ ادب، جولائی ۱۹۵۹ء)، ص ۹

۲۷۔ جلد چہار، دھم (کراچی: اردو لغت بورڈ، جنوری ۱۹۹۲ء)، ص ۲۰۱

۲۸۔ نسیم امروہوی، رئیس اللغات، ملک دین محمد (لاہور: اشاعت منزل لاہور، ۱۹۵۶ء)، ص ۶۷۱

۲۹۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، اشاعت اول ۱۹۵۵ء، ص ۶۸۲

(ظاہری) عبادتوں پر ناز ہے اور اسی بنا پر وہ جنت میں فخریہ داخل ہونا چاہتا ہے لیکن رضوانِ جنت اسے ٹوک دیتا ہے۔ اس مرثیے کے پس منظر میں نسیم کا یہ تصورِ حیات دیکھا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو ان کی ظاہرداریوں نے کہیں کا نہیں رکھا۔ سوسائٹی میں ان کی پستی کا سبب بھی یہ ہے کہ وہ ریاکاریوں اور بناوٹی زندگی کے حصار سے باہر نہیں نکل پا رہا ہے۔

فلسفۂ غم......اسکول پریس جونپور، ۱۹۴۵ء

اس مرثیے کا ایک ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں لاہور سے بھی شائع ہوا۔ شیخ ممتاز حسین جونپوری، مولانا ظفر حسن امروہوی اور مولانا سید احمد کی اس میں تحریریں موجود ہیں علامہ اقبال کی ایک نظم 'فلسفۂ غم' کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ہلال نقوی اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

> 'فلسفۂ غم کے عنوان سے ۳۲ر اشعار پر مشتمل اقبال کی بھی ایک نظم ہے جو بانگِ درا (مطبوعہ ۱۹۳۴ء) میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس نظم میں غم کو مضراب کہہ کر اقبال نے اس کی بیدار و مہمیز کرنے والی طاقت کو ظاہر کیا ہے۔
>
> غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
>
> سازِ یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے
>
> خواب اور مضراب کے قافیوں سے اقبال نے غفلت اور بیداری کی کیفیات کو نمایاں کیا ہے۔ نسیم بھی اپنے مرثیے فلسفۂ غم کی ایک بیت میں خواب اور مضراب کے قوافی لکھ کر جنبشِ عمل کو اُجاگر کرتے ہیں۔
>
> ہے خوشی دل کا سکوں اور سکوں خوابِ عمل   غم خلش اور خلش جنبشِ مضرابِ عمل
>
> اقبال کی نظم فلسفۂ غم میں جن خیالات کو پیش کیا گیا ہے وہ اہمیتِ غم کو اُبھارتے ہیں نسیم نے اس کے فلسفے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔' [۳۰]

مراثیِ نسیم (جلد اول)......دارالاشاعت اسلامی، کراچی، ۱۹۶۲ء

پاکستان میں نسیم امروہوی کے مرثیوں کا یہ پہلا باقاعدہ مجموعہ ہے۔ باقاعدہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس میں

۳۰۔ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ (لندن/کراچی: محمدی ٹرسٹ، فروری ۱۹۹۴ء)، ص ۵۱۵

۱۴۳ مرثیے ایک ترتیب و تنظیم کے ساتھ ہیں۔ان کے سن و تصنیف کی بھی وضاحت کی گئی ہے جس سے نسیم کے ذہنی ارتقا کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے اس کا بہت جامع مقدمہ بھی لکھا ہے ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

'پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہ پہلی کوشش ہے جس میں کسی ہم عصر مرثیہ نگار نے اپنا کلام شائع کرنے کے لیے بلا تکلف دے دیا ہے اب آپ خود ہی محاکمہ کرسکیں گے کہ شاعر نے ان مرثیوں میں اپنی تعلیم، اپنے ماحوال، اپنے تجربات، اپنی زندگی کے نشیب و فراز، اپنی پسند اور ناپسندیدگی، اپنی افتادِ طبع اور اپنے آئیڈیل کے اثرات سے کس حیثیت کے ادب پارے تخلیق کیے ہیں اور ان کا اردو ادب میں کیا مقام متعین ہوسکتا ہے۔' (ص ۲۸)

چشمۂ غم...... مشہور آفسٹ پریس کراچی، ۱۹۶۸ء

نسیم امروہوی کے ۲۸ مرثیوں سے یہ ایک انتخاب ہے۔ رباعیات بھی اس میں شامل ہیں اور کچھ سلام بھی ہیں۔فنِ سوز خوانی سے متعلق حضرات کے لیے ان کی حیثیت ایک نصاب کی ہے۔کراچی میں اس کے کئی ایڈیشن مختلف ترمیمات کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔

تسبیح فاطمہ...... ناشر حکیم محمد علی طبی کراچی، ۱۹۷۳ء

قرآن و احادیثِ رسول سے استفادہ کرتے ہوئے نسیم نے دختر رسول کی شخصیت اور ان کے کردار کو پیش کیا ہے ان کے مرثیے قرآنِ السعدین کے بیشتر بند اس میں موجود ہیں۔

دعائے فاطمہ...... ناشر حکیم محمد علی طبی کراچی، ۱۹۸۳ء

امت رسول کی فلاح و بہبود کے لیے دخترِ رسول کی دعاؤں کا اس میں بیان ہے۔

مومنِ آلِ ابراہیم...... ناشر کے سی غلام علی ایڈوکیٹ ۱۹۷۴ء

سید ہاشم رضا، مولانا منتخب الحق اور علامہ سید محمد رضی کے تفصیلی جائزوں کے ساتھ ۱۶۷ ربندوں پر مشتمل یہ دو

مرثیوں کا ایک مجموعہ ہے جو حضرت خدیجہ اور حضرت ابو طالب کی زندگی، شخصیت، ایثار، وفاداری اور حق و صداقت کے لیے ان کی خدمات کے تذکروں سے آراستہ ہے۔

مراثی نسیم جلد (دوم)...... پاکستان ریڈرس گلڈ کراچی، ۱۹۷۴ء

جلد اول کی اشاعت کے ۱۳/سال بعد نسیم کے مرثیوں کا یہ دوسرا مجموعہ ہے جو کراچی ہی سے شائع ہوا۔ اس میں پندرہ مرثیے ہیں۔ رئیس امروہوی کا ایک تفصیلی مقدمہ بھی اس میں شامل ہے جس میں انہوں نے نسیم کے فنِ مرثیہ کا جائزہ لیا ہے۔

اس شعری مجموعے کی تین خوبیاں ایسی بھی ہیں جو نسیم پر تحقیق کرنے والوں کے لیے بہت کارآمد اور سودمند ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ اس مجموعے میں نسیم نے اپنے ۱۳۴/مرثیوں کے مطلع (مصرع اول) اور ان کا مختصر تعارف بھی لکھ دیا ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اپنی تصنیفات و تالیفات میں سے ۱۵ کا اس میں ذکر ہے۔

۳۔ تیسری خصوصیت یہ بھی ہے کہ ۱۹۶۲ء میں ۱۳/مرثیوں پر مشتمل پاکستان میں ان کا جو پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا اس کے کسی مزید ایڈیشن کے بجائے یہ تمام مرثیے آخری حصے میں شامل کر دیئے ہیں۔ اس طرح سے ۲۸/مرثیے ایک ہی مجموعے میں قاری کے سامنے آ گئے ہیں۔

مسدسِ نسیم......ابن حسن آفسٹ پریس کراچی، ۱۹۷۸ء

۷۷/بندوں پر مشتمل اس مرثیے کا بیشتر حصہ آنحضرت کی نعت پر مشتمل ہے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مقدمے میں یہ اعتراف کیا ہے:

"نسیم امروہوی صرف شاعر ہی نہیں ایک جید عالم بھی ہیں ان کی نظر صرف زبان و بیان کے نکات تک محدود نہیں ہے اسلام اور تاریخِ اسلامی کی روح سے بھی وہ خوب واقف ہیں۔" (ص، ۸)

صبح ازل...... پیسہ اخبار لاہور، ۱۹۸۱ء

حضور اکرمؐ کی شخصیت اور ان کے کردار کے حوالے سے ۷۷ر بندوں پر مشتمل یہی مسدس جو مسدسِ نسیم کے عنوان سے ۱۹۷۸ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا اسے سید ظفر شارب کے دیباچے کے ساتھ پیسہ اخبار نے لاہور سے شائع کیا۔

مراثیِ نسیم (جلد سوم)......اظہار سنز لاہور، ۱۹۸۶ء

نسیم امروہوی کے مرثیوں کا یہ آخری مجموعہ ہے۔ایک طرح سے یہ آخری کتاب ہے جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔۱۹۸۶ء کے آخر میں یہ کتاب منظرِ عام پر آئی ۱۹۸۷ء کے آغاز میں ان کی وفات ہوئی۔اس میں ۱۴ر مرثیے شامل ہیں۔اس میں کسی نقاد کا مقدمہ یا دیباچہ شامل نہیں ہے البتہ ۱۲۷ر صفحات پر مشتمل ان کی زندگی کے حوالے سے ایک طویل یادداشت ہے جسے خود نسیم صاحب نے لکھا۔ یہ ان کی خودنوشت کا ایک حصہ ہے۔

مطبوعہ شخصی مرثیے

نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری کا کثیر حصہ تو اسی موضوع پر مشتمل ہے جو میر انیس و دبیر کی شناخت رہا لیکن انہوں نے اپنے عہد کی علمی و ادبی شخصیات کی دفات پر بھی مرثیے لکھے۔ان شخصی مرثیوں کے حوالے سے اس مقالے میں بحث کی جا چکی ہے۔ان شخصی مرثیوں میں سے جو مرثیے شائع ہو چکے ہیں ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

وانا صرہ......قصبہ سنبھل ضلع بریلی، ۱۹۴۳ء

لکھنؤ کے ایک عالم جناب ناصر حسین صاحب جنہیں ناصر الملت کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ان کی وفات پر نسیم نے مرثیہ کہا۔۱۱۲ر بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ شخصی حوالے سے اردو میں اس اعتبار سے پہلا مرثیہ ہے کہ اس میں مرحوم کی شخصیت اور سیرت و خدمات کا تذکرہ تو اپنی جگہ پر ہے لیکن جس طرح اس کے چہرے میں علم کی اہمیت اور قدر و قیمت پر شعری لباس میں اظہار خیال کیا گیا ہے وہ اردو شاعری میں بالکل نئے سفر کا آغاز

ہے۔

بیادِ نہال محمد......نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۴۵ء

نہال محمد امروہہ کی سرزمین کے رہنے والے تھے اور اہلِ وطن میں ان کی بزرگی اور سیرت کا بڑا تذکرہ تھا۔ ۱۹۴۵ء میں ان کی رحلت پر نسیم نے مرثیہ لکھا جس کے ۱۴/بند ہمارے پیشِ نظر ہیں۔

رثائے محسن الحکیم......کل پاکستان فروغِ مرثیہ کراچی، ۱۹۷۰ء

عراق کے ایک نامور عالمِ دین اور مجتہد حضرت محسن الحکیم کی وفات پر جو مرثیہ نسیم نے لکھا وہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تقریظ کے ساتھ شائع ہوا۔ جس میں وہ لکھتے ہیں:

> 'نسیم صاحب نے ایک ہزار سال کے اکابر علما کا تذکرہ شامل کر کے اس داستان کو پورا منظوم کر دیا ہے جس کی ایک کڑی جناب محسن الحکیم تھے۔ ان تفصیلات سے جہاں ان اکابر کی یاد تازہ ہوتی ہے وہاں جناب نسیم کی معلومات اور ان کے سلیقہ، ترتیب و تزئین کی بھی داد دینا پڑتی ہے۔' (ص، ۷)

کراچی کے ایک معروف رسالے ہفت روزہ 'لیل و نہار' نے اپنے ایک شمارے میں اس پر تبصرہ کیا جس کا ایک اقتباس یہ ہے:

> 'مرثیہ کے چہرے میں علم و عمل میں تطابق کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد علمائے دین کا سرسری لیکن مستند تذکرہ منظوم کیا گیا ہے اور جا بجا ان کے عملی کارناموں اور خدمات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ جہاں نظم کا دامن تمام تفصیلات کو سمیٹنے سے قاصر رہا ہے۔ وہاں حواشی کے ذریعے ان کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ آخری میں محسن الحکیم طاب ثراہ کی وفات کے ذکر میں بالاختصار شہادتِ حسین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔'

اس مرثیہ کو اگر علمائے دین، کی مختصر منظوم تاریخ کہا جائے تو مبالغہ ہوگا۔ جناب نسیم امروہوی نے نہایت خوبی سے علمائے دین کی علمی کاوشوں اور خدمات کی ہزار سالہ تاریخ کو ۹۲/بندوں میں نہایت اختصار کے ساتھ سمو دیا ہے۔[۳۱]

۳۱۔ شمارہ ۷ تا ۱۳/دسمبر ۱۹۷۰ء، ص ۶۸

مرثیۂ جوش......لشکرِ ادب کراچی اپریل ۱۹۸۲ء

۴۷ بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ شاعرِ انقلاب جناب جوش ملیح آبادی کی وفات پر کہا گیا۔ یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ نسیم کے ہم عصر شاعروں میں جوش صاحب اپنی صدی کی ایک بڑی آواز تھی اس اعتبار سے ان کی رحلت ایک حساس شاعر کے لیے مرثیہ لکھنے کا سبب ہوئی لیکن اس مرثیہ لکھنے کے اسباب میں ایک بڑا سبب جوش اور نسیم کا وہ تعلق بھی ہے جو ترقی اردو بورڈ میں لغت نویسی کے سلسلے سے تھا۔ نسیم امروہوی صاحب نے جن شخصیات کے مرثیے لکھے ان میں علامہ رشید ترابی [۳۲] اور سید آل رضا [۳۳] کے متعلق مرثیے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں جبکہ میجر تصویر حسین پر [۳۴] ان کا مرثیہ نسیم امروہوی کی ادبی خدمات سے متعلق ایک یادگار جریدے میں کراچی سے شائع ہوا۔ [۳۵] غیر مطبوعہ شخصی مرثیے بھی ہیں جن کا ذکر آنے والے صفحات میں ہوگا۔ ان تمام مرثیوں کو ڈاکٹر کاظم علی خاں نے نسیم کا 'یادگار اور سدا بہار کارنامہ' قرار دیا ہے۔ [۳۶]

۳۲۔ رثائے رشید ترابی، مشمولہ 'تبلیغ'، مرتبہ محشر لکھنوی، ۱۹۷۳ء، ص ۵ تا ۲۵

۳۳۔ رثائے رضا، مشمولہ مجلّہ بیادِ شاعرِ اہلبیت، کراچی، دسمبر ۱۹۷۸ء، ص ۲۱

۳۴۔ امروہہ کے بزرگ، کراچی کے ایک اسکول کے سابق ہیڈ ماسٹر اور ہومیو پیتھک ڈاکٹر، ڈاکٹر سید عالم نے ایک ملاقات میں (۱۱ رفروری ۲۰۰۱ء بمقام فیڈرل بی ایریا کراچی)، میجر سید تصویر حسین کے متعلق مجھے یہ معلومات بہم پہنچائیں:

'تصویر حسین صاحب نسیم امروہوی کے عزیزوں میں تھے۔ راجہ صاحب محمود آباد نے غالباً ۱۹۶۳ء میں یا اس کے اگلے برس جب سراج الدولہ کالج قائم کیا تو وہ یہاں کے پرنسپل ہوئے اور کالجوں کے سرکاری تحویل میں لیے جانے تک اپنے فرائض ادا کرتے رہے جب امروہہ میں تھے تو تعلیم نسواں کے زبردست حامیوں میں تھے۔ کم عمری ہی میں انجمن اصلاحِ معاشرت کے صدر ہو گئے تھے۔ لندن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی نوجوانی میں برٹش آرمی انڈین کمیشن میں بھرتی ہوئے اور پاکستان آرمی میں میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ۱۹۸۵ء میں کراچی میں وفات پائی۔'

۳۵۔ تصویر حسین کی یاد میں، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی:، انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۹۲ء) ص ص ۳۲۴، ۳۲۵

۳۶۔ مراثی نسیم امروہوی کا تجزیاتی مطالعہ، مشمولہ ادبی کائنات، دہلی شمارہ جون، جولائی ۱۹۸۹ء، ص ۲۷

تحقیق وتنقید

خطباتِ مشران (حصہ اول)...... یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ،۱۹۴۲ء

پنڈت سندر نرائن مشران فرخ آباد کی ایک معزز شخصیت تھے۔ صاحبِ جائیداد اور بہت رئیس آدمی تھے لیکن علمی و ادبی ذوق نے انہیں اہلِ علم کی نگاہوں میں بہت محترم حیثیت دے دی تھی۔ عربی وفارسی کے تو عالم تھے ہی لیکن اردو کی ترویج وترقی میں ہر وقت سرگرمِ عمل رہتے تھے۔ اس کتاب میں ان کے ۵۳ر خطبات کو یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے جن میں سے بعض کے عنوانات یہ ہیں۔ سرسید میموریل فنڈ، آدابِ شاعری، شعرا کا خیر مقدم، ایڈورڈ ہفتم کی وفات، یورپ کی جنگِ عظیم، کتب خانے کی امدادی رقم میں اضافہ، سیرت النبی، یتیم خانے کی امداد اور کئی دیگر موضوعات!۔ اس کتاب کی روح نسیم امروہوی کے لکھے ہوئے مقدمے میں پوشیدہ ہے جو بڑے سائز کے کم وبیش چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مقدمے کی خوبی یہ ہے کہ اور دوسری بحثوں کے ساتھ ساتھ نسیم صاحب نے خطبے کے متعلق بہت اہم پہلو بیان کیے ہیں بلکہ انہوں نے خطبے کو ایک صنف کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ وہ اس کتاب کو ایک منفرد 'خطابیاتی مجموعۂ اردو' قرار دیتے ہیں۔ نسیم صاحب نے مقدمے میں بہت زور دے کر یہ بات لکھی ہے کہ ادب وہی ہے جو سماج میں اپنا رشتہ قائم کرے۔ روسو کے اس قول کو انہوں نے اپنی فکر کا محور بنایا ہے کہ ہر قوم کا ادب اس کی سماجی تبدیلیوں کا آئینہ ہوا کرتا ہے۔

نسیم صاحب کی مرتبہ نصابی کتابیں اور کئی دوسرے موضوعات پر مشتمل تحریریں تحقیق وتنقید ہی کے تحت آتی ہیں۔ لغت نویسی اور فرہنگ نگاری تو انتہائی محنت طلب تحقیق ہے اور نسیم صاحب کی عمر کا ایک بڑا حصہ ان خدمات میں گزرا لیکن ہم نے انہیں گذشتہ صفحات میں مختلف عنوانات کے ذیل میں لے لیا ہے، البتہ وہ متعدد تحریریں اور تالیفات ہیں جنہیں خالصتاً تحقیق وتنقید کے دائرے میں رکھنا چاہیے۔ وہ کتابیں یہ ہیں:

نظم اردو......ادارۂ اردو نرولی ہاؤس لکھنؤ،۱۹۲۲ء

اس کتاب میں سودا اور میر سے لے کر اقبال، فانی، فراق اور جوش تک کم وبیش ۳۰ر شاعروں کے کلام سے انتخاب کیا گیا ہے یعنی قدیم وجدید عہد کے صفِ اول کے شعر گو حضرات کی شاعری کے منتخب حصے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ تبصرہ وتنقید کے ساتھ ادبی وعلمی حوالے سے فٹ نوٹس بھی ہیں جن میں تشریحی پہلو زیادہ ہیں۔ خود نسیم

صاحب کی بھی بعض منتخب نظمیں بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔

نثر اردو......انوار بک ڈپو کراچی، جون ۱۹۴۸ء

منظومات ہی کی طرز پر یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے غالب و سرسید سے رشید احمد صدیقی اور پریم چند تک اور پھر نسیم صاحب کی بھی منتخب نثری تحریریں اس میں شامل ہیں۔

ادبی کہانیاں......کتاب منزل لاہور، ۱۹۵۳ء

۳۲۶ رصفحات پر مشتمل اس کتاب میں پوری تحقیق کے ساتھ ۴۱۵ رتلمیحات کی تشریح کی گئی ہے۔نسیم صاحب دیباچے میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> فارسی کی طرح ہمارے اردو ادبیات میں بھی بہت سے شعر اور جملے اس قسم کے نظر آتے ہیں جن میں شاعر یا مصنف ایک ایسا لفظ چن کر رکھ دیتا ہے جو دیکھنے میں بہت مختصر ہوتا ہے۔مگر دراصل اس سے ایک طولانی واقعے یا قصے کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے جس سے عموماً سب لوگ واقف نہیں ہوتے اور اس لیے (تمام الفاظ کے معنی معلوم ہونے کے باوجود) اس فقرے یا شعر کے مطلب سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ واقعات اور قصے (جنہیں ادیبوں کی اصطلاح میں 'تلمیح' کہتے ہیں) اگرچہ ایک مدت سے ہمارے علم و ادب کی دنیا میں رائج ہیں، مگر ابتدا سے لے کر اب تک سینہ بسینہ ہی چلے آرہے ہیں۔ خصوصاً اردو زبان میں ان الفاظ کا کوئی ایسا مکمل لغت مرتب نہیں ہوا جس میں تمام یا بیشتر تلمیحات ایک جگہ مدوّن کر دی گئی ہوں اور اس لغت کی امداد سے قصہ طلب جملوں اور شعروں کا مطلب حل ہونے میں سہولت ہو جائے۔(ص،۳)

اس کتاب کے مطالعے سے پہلی نظر میں یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ یہ نسیم صاحب کا وہی ذوقِ مطالعہ اور تحقیقی جذبہ ہے جس میں وہ 'لفظ' کی تلاش اور اس کے اپنے ثقافتی اور تہذیبی پس منظر تک پہنچ جاتے ہیں۔ان تلمیحات کی تشریح میں بھی انہوں نے قرآن، تاریخ، ادب، صحافت، جغرافیہ اور دوسرے بہت سے علوم کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ یہاں ہم ۴۱۵ رتلمیحات کا ذکر تو نہیں کر سکتے لیکن بعض کے نام لکھ دینے سے اس کام کی اہمیت کا کسی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

آبِ ظلمات، آدم ثانی، ابنِ رشد، ابونصر فارابی، اصحابِ کیف، الپ ارسلان، انا الحق، اہرام، اقلیدس، برگِ حنا، بیت الیقین، پیراہنِ یوسف، تختِ بلقیس، جامِ جم، چاہِ بلبل، خرِ عیسیٰ، دیوارِ چین، روح اللہ، زندانِ مصر، سیمرغ، صاحبقراں، ظرِ تمام الٰہی، طورِ سینا، قابِ قوسین، کراماً کاتبین، کیومرث، لحنِ داؤد، ماہِ نخشب، مسجدِ ضرار، ہاروت ماروت، یاجوج، ید بیضا......۴۱۵ر تلمیحات کی تشریح میں نسیم صاحب نے حروفِ ابجد کی ترتیب کو مدِ نظر رکھا ہے۔

سعادت امروہوی......انجمن ساداتِ امروہہ کراچی، ۱۹۶۴ء

میر سعادت جو سرزمینِ امروہہ پر سترہویں صدی کے آخری برسوں میں پیدا ہوئے ان کے ادبی مرتبے اور ان کی استادانہ مہارتوں کا اس مقالے میں تذکرہ کرتے ہوئے نسیم صاحب نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ سعادت ریختہ میں میر تقی میر کے استاد تھے ان کے اس مقالے کا تذکرہ ڈاکٹر قمر رئیس نے بھی کیا ہے۔[۳۷]

کلیاتِ ناز......مراد برقی پریس خیر پور، اشاعت ندارد

والیِ ریاست خیر پور ہز ہائینس میر علی نواز ناز (۱۸۸۴ء۔۱۹۳۵ء) کی مادری زبان سندھی تھی لیکن انہوں نے اردو میں بھی شاعری کی لیکن یہ سب تحریریں بکھری ہوئیں تھیں نسیم صاحب نے ان کی غزلوں، قصائد، سلام اور مرثیے کو ترتیب و تدوین کے بعد 'کلیاتِ ناز' کے عنوان سے شائع کیا اور ایک بھرپور مقدمہ بھی لکھا۔ سندھی ادبیات میں نسیم کی خدمات کے ذیل میں ہم گذشتہ ابواب میں اس کا تفصیلی تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس سے اندازہ ہوگا کہ نسیم زبان اور سماج کے رشتے کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں:

> ظاہر ہے کہ جب عرب سندھ کے ساحل پر اترے ہوں گے اور انہوں نے محمد بن قاسم کی فتحمندانہ قیادت کے تحت سندھ میں (جو اس وقت ملتان تک پھیلا ہوا تھا) اپنی باضابطہ حکومت قائم کی ہوگی تو انہیں اس کی بھی ضرورت پڑی ہوگی کہ داعی و رعایا کے درمیان قریبی اور گہرے تعلقات قائم کرنے اور دو اجنبی قوموں کو ایک دوسرے سے قریب تر

۳۷۔ تقریظ، علی نظر حیات اور شاعری، ڈاکٹر محمد سیادت نقوی، مطبوعہ امروہہ، سنہ اشاعت ندارد

لانے کے لیے ایک مشترکہ ذریعہ مفاہمت اختیار کریں۔ یعنی ایک ایسی زبان تشکیل کی جائے جو فاتحین ومفتوحین دونوں کی سمجھ میں آ جائے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں سیاسی اور سماجی تقاضوں کے تحت فوری طور پر ایک نئی بولی، یا کم سے کم بول چال کے نئے الفاظ وجود میں آئے ہوں گے جنہوں نے آگے چل کر رفتہ رفتہ اردو کی صورت اختیار کر لی۔ اسی طرح دوسری صدی ہجری میں سندھ کے سیاسی وتمدنی انقلاب نے ایک ایسے معاشرے کی بنیاد ڈالی جس کا ثمر پیش رس، اردو ہے۔

فرہنگِ اقبال اردو پر ایک مخصوص طبقے کے اعتراضات اور ان کے جوابات

اظہار سنز لاہور، ۱۹۸۴ء

۸۰۷ صفحات پر مشتمل فرہنگِ اقبال اردو کی اشاعت ہی کے سال اس کے اشاعتی ادارے اظہار سنز نے اس فرہنگ کی رسم اجرا کا اہتمام کیا جس میں بعض مقررین نے اس کے بعض پہلوؤں پر سخت اعتراضات کیے۔ تقریب کے حوالے سے 'ارمغانِ نسیم' کے ایک حاشیے میں یہ نوٹ موجود ہے:

> 'تقریب رونمائی لاہور کے ہلسٹن ہوٹل میں ہوئی اس وقت کے وفاقی وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل صاحب نے صدارت کی ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی مرزا حضور صاحب نے مقالہ پڑھا۔ مشکور حسین یاد صاحب نے زبانی تقریر کی۔ اس تقریب میں بعض مقررین نے فرہنگِ اقبال پر اعتراضات اٹھائے۔' (ص ۴۷)

لاہور کے ایک کالم نگار نے اپنے کالم 'لاہور سے لاہور تک' میں اس کی تفصیلی رپورٹ لکھی ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> تقریبات میں عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ مقررین یکے بعد دیگرے پانی پی پی کر مصنف کی تصنیف اور اس کی ذات کے بارے میں تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ کہیں نکتہ چینی ضروری بھی ہو تو ایسے سنبھل سنبھل کر اور احتیاط سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ کہیں مصنف کے ساتھ پرانے تعلقات کو کسی قسم کی گزند نہ پہنچ جائے۔ مصنف کو ایسا آسمان پر چڑھا دیا جاتا ہے کہ جیسے اس نے کوئی بہت ہی انوکھا معرکہ سر کر لیا ہو۔ عام درجے کی کتب کی تعرفی تقریبوں میں بھی یہی وطیرہ اختیار کیا جاتا ہے کیونکہ مقررین کا انتخاب

صاحبِ کتاب کی پسند سے کیا جاتا ہے تاکہ تقریب خوب رہے اور مقررین کی تقریر کی روشنی میں ریکارڈ شاندار سامنے آئے۔

نسیم امروہوی صاحب کی تالیف فرہنگ اقبال کی تقریب رونمائی کے آغاز میں تو خیر گزری۔ مشکور حسین یاد نے روایتی مقررین کی طرح صاحب کتاب کی کوششوں کی تعریف کی داد دی اور حوصلہ افزائی فرمائی لیکن پھر یکایک تقریب کی فضا بدل گئی۔[۳۸]

جو اعتراضات کیے گئے ان میں بعض یہ تھے کہ اجتہاد کی شرح غلط کی گئی ہے۔ اقبال کی ترکیب موج کو غلط معنی پہنائے گئے ہیں۔ خودی کی وضاحت درست نہیں ہے۔ یا بعض لفظوں کی وضاحت میں بہت تفصیلات دی گئی ہیں جس سے فرہنگ کی ضخامت کو بلا سبب بڑھایا گیا ہے۔ نسیم کا یہ تنقیدی مقالہ ان تمام اعتراضات کا بہت مربوط جواب ہے۔

شاعری

نسیم صاحب کی ادبی خدمات میں جو حصہ سب سے زیادہ منتشر صورت میں ہے وہ ان کی شاعری ہے۔ رثائی اصناف سے متعلق ان کا ذخیرہ بہت زیادہ ہے ۲۰۰ سے زیادہ مرثیے کئی جلدوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ تین جلدیں شائع ہو سکیں جن کا ذکر رثائی ادبیات کے ذیل میں گذشتہ صفحوں میں کیا گیا۔ نظمیں ہیں جو ان کی ہی مختلف کتب میں شائع ہوئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کتابچوں اور رسائل میں بے شمار نظمیں چھپی ہیں مگر یکجا نہیں ہیں صرف ایک کتاب برق و باراں ہے جو ان کے طویل مسدس پر مشتمل ہے۔ شاعری کے حوالے سے ان کا یہ باقاعدہ مجموعہ ہے جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔

برق و باراں......مست قلندر بک ڈپو لاہور، ۱۹۴۴ء

زیرِ نظر مقالے کے تیسرے باب 'تحریک پاکستان میں نسیم امروہوی کی قلمی خدمات اور ان کا سماجی پس منظر' میں نسیم صاحب کی اس کتاب کا ایک جامع تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ ۲۷۹ بندوں پر مشتمل یہ مسدس پانچ

۳۸۔ حسنین جاوید، نسیم امروہوی کی فرہنگ اقبال کی تعارفی تقریب، مشمولہ روزنامہ نوائے وقت، لاہور، تاریخ اشاعت ۲/اگست ۱۹۸۴ء، ص ۷

عنوانات کے تحت اپنی ارتقائی شکل کو ہے تلاطمِ امواج، برقِ خرمن، نویدِ برشگال، بارانِ رحمت، پاکستانِ رحمت۔ پیش لفظ سید کلب مصطفیٰ ایڈوکیٹ نے لکھا ہے جس میں کافی تفصیلات ہیں اور نسیم کی فکر کا ایک اچھا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

سوانحی تصانیف

خودنوشت سوانح حیات (حصہ اول)......اظہار سنز لاہور، ۱۹۸۶ء

یہ خودنوشت سوانح نسیم صاحب کی زندگی کی آخری یادگار تحریر کہی جائے گی اس کی اشاعت دوطرح سے ہوئی ایک مراثی نسیم جلد سوم کے ساتھ، دوسرے بالکل علیحدہ صورت میں اس وقت ہمارے پیشِ نظر علیحدہ صورت میں شائع ہونے والی ہی کتاب ہے۔

نسیم صاحب ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔۱۹۲۳ء میں ان کی عمر ۲۴ رسال تھی۔اس خودنوشت میں انہی چوبیس برسوں کی روداد لکھی گئی ہے۔ یہ ان کی نامکمل سوانح ہے اسے انہوں نے حصہ اول قرار دیا لیکن حصہ دوم ترتیب نہ دے سکے اور ان کی وفات ہوگئی۔'اپنی کہانی اپنی زبانی' کی ذیلی سرخی کے تحت وہ لکھتے ہیں:

> ابھی وہ چند لوگ بقیدِ حیات ہیں، جنہوں نے میری زندگی کے بعض ادوار (شباب اور پیری) کو دیکھا ہے اور راہ راست حالات اور واقعات کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے۔ان حضرات کی تعداد روز بہ روز کم ہوتی چلی جارہی ہے اور میں بھی اب چراغِ سحری ہوں، مگر ایسے بزرگ اب تقریباً عنقاے معدوم کا حکم رکھتے ہیں۔ جو میری پیدائش اور نشو ونما کے حالات سے واقف تھے، بنابریں بہتر سمجھتا ہوں کہ جو کچھ مجھے یاد ہے اور گھرانے کے بزرگوں نے جو کچھ مجھے یاد دلایا اور بتایا تھا اور ابھی تک لوح حافظہ پر ثبت ہے، ہوش و حواس گم ہونے سے پہلے اسے کاغذ پر منتقل کردوں۔(ص،۷)

ولادت سے لے کر نانا اور دادا کی سرپرستی، والد کی رحلت، شاعرانہ مباحثے، شاعری، غزل گوئی، اپنی اولاد اور اپنی تحریروں کے تذکرے تک اس خودنوشت سوانح کی حدود کئی ہیں۔نسیم صاحب کی زندگی اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے یہ سوانح بہت بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

سیرتِ سجاد...... شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۹۲ء

جناب سجاد، حضرت حسین ابن علی کے صاحبزادے ہیں انہی کی دعاؤں پر مشتمل 'صحفیۂ کاملہ' نسیم صاحب نے ترتیب دیا تھا جو ۱۹۷۰ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے مقدمے میں انہوں نے بہت تفصیل سے جناب سجاد کی زندگی کے حالات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ نسیم صاحب کی وفات کے پانچ سال بعد شیخ غلام علی کے اشاعتی ادارے نے اس حصے کو علیحدہ کر کے سیرتِ سجاد کے نام سے شائع کر دیا۔

نایاب مطبوعات

نسیم صاحب کی جو مطبوعات اب عام لوگوں اور عام قارئین کو میسر نہیں آتیں بلکہ تحقیق کرنے والوں کو بھی بہت مشکل سے کسی ذاتی کتب خانے میں دیکھنے کو مل جاتی ہیں یا کسی مضمون میں ان کا تذکرہ ہوتا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اکتشافات تام...... تین عالم دین شخصیات سید نجم الحسن، مولانا یوسف حسین اور مولانا سید محمد صاحب جن کا تعلق امروہے سے تھا ان کے فتووں کی اہمیت کا اس میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ مطبوعہ نسخہ بہت قدیم معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس پر نسیم صاحب کا نام مولوی سید قائم رضا فاضل ادیب چھپا ہے۔ نسیم صاحب نے ۱۹۲۳ء میں نسیم تخلص اختیار کیا ورنہ قائم لکھتے تھے۔ (کتب خانہ سید کرار نقوی کراچی)

۲۔ تنبیہ...... لکھنؤ کے نامور عالمِ دین سید علی نقی عرف نقن صاحب کی کتاب 'شہید انسانیت' کی تردید میں تنبیہ کے عنوان سے یہ ایک نظم ہے (کتب خانہ سید علی کرار نقوی، کراچی)

۳۔ شہید انسانیت کا تبصرہ منظوم...... اس کا نام خود اس نظم کا تعارف ہے یہ تنبیہ ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے لیکن مسدس کی صورت میں ہے ۶۰/ سے زیادہ بند ہیں لکھنؤ سے ۱۹۴۳ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ (کتب خانہ سید علی کرار نقوی، کراچی)

۴۔ ریل کا سفر، نظم...... (ارمغانِ نسیم ص، ۱۹۱)

۵۔ خمسۂ متحیرہ، شاعری...... (ارمغان نسیم، ص ۱۹۱)

۶۔ المنطق...... (ارمغانِ نسیم، ص ۱۸۹)

۷۔ قواعد وانشائے اردو (جلد ۱ تا ۸)، شبنم بختیار [۳۹] اور ڈاکٹر شبیہ الحسن [۴۰] نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

۸۔ ملّتِ شیعہ اور سیاسیاتِ حاضرہ......۵۶ صفحات میں، برطانوی دورِ اقتدار میں رہنے والی شیعہ کمیونٹی کے مسائل کا ایک جائزہ لیا گیا ہے۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ نے اسے شائع کیا۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ (کتب خانہ سید علی کرار نقوی، کراچی)

۹۔ رہٹ چلے اور من للچائے......اس میں کچھ مضامین ہیں جن میں ایسی باتوں کا بیان ہے جس سے زراعت کو ترقی مل سکتی ہے۔ خیر پور اسٹیٹ اور حکومتِ پنجاب نے اسے مشترکہ طور پر شائع کیا تھا۔ (ارمغانِ نسیم، ص ۱۸۹)

۱۰۔ رشوت ستانی......خیر پور اسٹیٹ کے محکمۂ اطلاعات نے اسے شائع کیا۔ رشوت کی خرابیوں پر یہ ایک طویل تبصرہ ہے۔ (ارمغانِ نسیم، ص ۱۸۹)

۱۱۔ معلم المکاتب......رائے بہادر گلاب سنگھ نے لاہور سے ۸ حصوں میں شائع کی تھیں۔ اس کی اشاعت کا مقصد تعلیمِ بالغان تھا۔ (ارمغانِ نسیم، ص ۱۸۶)

۱۲۔ ملاپ (ڈرامہ)......(بحوالہ مجلّہ، انجمن ساداتِ امروہہ کراچی، ستمبر ۱۹۶۵ء ص ۲)

۱۳۔ دینیات کی پہلی کتاب......سندھی ترجمہ استاد گل محمد، مہران بک سینٹر خیر پور

۱۴۔ دینیات کی چوتھی کتاب......سندھی ترجمہ استاد محمد حاص حیدری، مہران بک سینٹر خیر پور

۱۵۔ نصیحت کا کرن پھول......ایک غریب لڑکی طیبہ کی شادی پر نظم کہی گئی تھی۔ آفتاب عام پریس نے ۱۹۵۹ء میں لاہور سے شائع کیا۔ (کتب خانہ، سید علی کرار نقوی، کراچی)

۱۶۔ نماز ءِ بیون عبادتون......سندھی زبان میں نماز سے متعلق ایک کتابچہ (کتب خانہ، سید بنیاد علی، خیر پور)

۱۷۔ الفلسفہ......جان محمد الٰہی بخش نے لاہور سے اسے شائع کیا تھا۔ سنہ اشاعت کا پتہ نہیں چلا ارمغانِ نسیم میں اس کے حوالے سے یہ نوٹ موجود ہے:

۳۹۔ نسیم امروہوی بحثیت شاعر، مقالہ برائے ایم اے ۱۹۸۹ء (مملوکہ لائبریری گورنمنٹ کالج فیصل آباد)، ص ۱۴۱

۴۰۔ نسیم امروہوی ایک موضوعاتی مطالعہ، مشمولہ، ماہنامہ شام وسحر، لاہور، مئی ۱۹۱۸ء، ص ۱۷

طبیعیات، عنصریات اور الٰہیات، فلسفے کی یہ تین اہم قسمیں ہیں۔ان سے متعلق
ایک رسالہ لاہور کے ناشر جان محمد الٰہی بخش کے پاس محفوظ تھا لیکن فلسفے کا وہ حصہ
جسے مابعد الاجسام کہتے ہیں اس کی بحث اردو میں نہیں تھی۔اپنی سیریز کو مکمل کرنے
کے لیے ناشر نے یہ پُر مغز اور اہم حصہ نسیم صاحب سے لکھوایا۔(ص ۱۸۷)

۱۸۔ ارمغانِ عقیدت......اسلامی تاریخ کی ایک شخصیت حضرت زید شہید کی شخصیت کے حوالے سے
یہ ایک قصہ ہے جو خیر پور سے شائع ہوا تھا۔اگر چہ اس کا سن اشاعت ۱۹۸۱ء ہے مگر اب یہ بالکل
نایاب ہے اس کا ایک نسخہ سید شید احسن زیدی کے کتب خانے (کراچی) سے ملا۔

۱۹۔ دستورِ اساسی......نسیم امروہوی نے کل پاکستان فروغ مرثیہ کا ایک ادارہ کراچی میں ۱۹۶۷ء میں
قائم کیا تھا جس کا مقصد پاکستان میں صنفِ مرثیہ کے ادبی فروغ کے لیے اہل قلم کو اپنی قلمی خدمات
سے کام لینا تھا۔اس ادارے کا ایک دستوری خاکہ ۱۹۸۶ء خود نسیم صاحب نے تیار کیا تھا۔اس میں
قواعد، اصول، ضابطے اور اغراض و مقاصد کا بیان ہے۔نسیم صاحب نے ابتدائی صفحات میں اس
صنف کے متعلق اپنے نقطۂ نگاہ کا اظہار کیا ہے جس کا ایک اقتباس یہ ہے:

> پاکستان میں اردو کے دوش بدوش، پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو، سرائیکی، گجراتی
> اور کشمیری زبانوں میں بھی مرثیائی ادب کے بے شمار نمونے ملتے ہیں جن سے
> اس صنف سخن کے مقبولِ عام ہونے کی تائید و توثیق ہوتی ہے، اس مقبولیت کی
> خاص وجہ، غالباً، بلکہ یقیناً یہ ہے کہ اردو نے شروع ہی سے اپنے مرثیائی ادب کا
> موضوع تاریخ عالم کے سب سے بڑے المناک واقعے کو بنایا ہے۔اس سانحے
> کے بیان میں ہر پھر کر ان ذواتِ مقدمہ کے افکار موضوعِ سخن بنتے ہیں جن کے
> مورثِ اعلیٰ اور سلفِ عالی شہرِ علوم اور بابِ علوم کے منصب پر فائز ہیں اور ان
> مناصبِ عالیہ کی ذمہ داریوں کے باعث، وہ افعالِ حسنہ کا سرچشمہ، اور اخلاقِ
> جمیلہ کا مرکز و محور ہیں۔انہیں کی تعلیم و تبلیغ اور تلقین و ہدایت سے انسان جہالت
> اور بے عملی کے تیرہ و تاریک غار سے نکل کر چراغانِ اسلام کی روشنی میں تمدن اور
> تہذیب کے اس روشن آسمان تک پہنچا ہے جو رہتی دنیا تک مکارم و محاسن کی
> تجلیوں کا منارۂ لازوال بن کر کائناتِ عالم کے ہر گوشے کو روشنی بخشتا رہے

گا۔(ص،۳)

نامکمل مسوّدات

۱۔ نسیم امروہوی کے ایک ہم عصر اور غزل کے معروف شاعر محشر بدایونی نے ان کی وفات پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ’’آخری دنوں میں وہ قرآن مجید کا ترجمہ نظم کر رہے تھے۔‘‘[۴۱]

۲۔ نسیم امروہوی کی وفات کے بعد ان کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر ہلال نقوی نے ارمغانِ نسیم کے توسط سے ہمیں یہ معلومات فراہم کی ہیں۔

الف۔ (۱۹۴۶ء)......اس زمانے میں نسیم صاحب فردوسی کے شاہنامے کی فرہنگ ترتیب دینے کا ارادہ رکھتے تھے چنانچہ یہ کام شروع کر دیا کچھ لفظوں کے کارڈ بھی بنائے مگر بیمار ہو گئے۔شدید کھانسی کی شکایت رہنے لگی جس سے یہ کام نامکمل رہ گیا(ص،۴۰)

ب۔ ’نظیر اکبر آبادی نے جن نئے لفظوں کو اپنی شاعری میں برتا ہے ان کو پیشِ نظر رکھ کر ایک مختصر لغت ترتیب دینے کے لیے (۱۹۷۵ء میں) کچھ نوٹس تیار کیے۔‘(ص،۷)

ج۔ میرے پاس ان کے جو خطوط ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دنوں (۱۹۸۶ء) وہ بہت مصروف رہے۔مقتدرہ قومی زبان کے تحت انہوں نے اردو لغت ’مفصل جیسی اردو لغت‘ اور اردو تلمیحات کی تیاری میں معاونت کی۔‘(ص،۸)

میری تحقیق کے مطابق ان کی نامکمل اور ادھوری تصانیف (بلکہ بعض ایسی بھی جو ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں تھیں) اُن کے نام یہ ہیں:

۴۱۔ لوگ رخصت ہوئے اور لوگ بھی کیسے کیسے، مشمولہ ارمغانِ نسیم (کراچی: انجمنِ ساداتِ امروہہ، فروری ۱۹۹۲ء)، ص ۱۳۰

خودنوشت سوانح کا دوسرا حصہ، آنحضرتؐ کی منظوم سوانح، جدید مرثیے پر ایک تنقیدی نظر، رئیس امروہوی کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کی یادیں، نظیر اکبرآبادی، انیس اور جوش کے لفظوں پر مشتمل مشترکہ فرہنگ، عصرِ حاضر کے غزل گو شعرا کی فنی کمزوریاں، اردو لسانیات پر ایک تشریحی و توسیعی باب، مرثیے نے اردو شاعری کو کیا کیا دیا، غالبؔ کے قصائد پر ایک نظر، فقہ کی تعلیم پر مشتمل کتابچوں کی سندھی زبان میں اشاعت (ص،۱۹۲)

۳۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے نسیم صاحب کی وفات سے صرف ۷؍روز قبل کراچی کے امراض قلب کے ہسپتال 'کارڈیو ویسکلر' میں ان سے ایک انٹرویو کیا[۴۲]۔ اس انٹرویو کے حوالے سے فرہنگِ اقبال فارسی کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں:

اس انٹرویو میں انہوں نے اپنی بعض ایسی زیرِ ترتیب کتابوں کا بھی ذکر کیا تھا جن کے انہوں نے ابھی یا تو صرف کچھ نوٹس ہی تیار کیے تھے یا جن کے خاکے محض ان کے ذہن میں تھے۔ قطع نظر دوسرے عنوانات کے فنی و لسانی نقطۂ نگاہ سے انہوں نے جن موضوعات کا ذکر تھا وہ یہ ہیں:

- اردو لسانیات پر ایک تشریحی و توسیعی باب
- نظیر اکبرآبادی، انیس اور جوش کے لفظوں پر مشتمل مشترکہ فرہنگ
- عصرِ حاضر کے غزل گو شعراء کی فنی کمزوریاں
- اردو مشتقات
- اردو اور سندھی کے لسانی رشتے

(ص، ۱۱۷، ۱۱۸)

دستیاب قلمی نوادرات

۱۔ ڈاکٹر یاور عباس، مرحوم نجم العلماء اور حاکم حسین کی وفات پر لکھے ہوئے شخصی مرثیے (کتب خانہ قسیم ابنِ نسیم، کراچی)

۴۲۔ روزنامہ جنگ کراچی کی ۶؍مارچ ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں اس انٹرویو کا ذکر ہے (م،ن،ع)

۲۔ نسیم امروہوی صاحب کے غیر مطبوعہ مرثیے (مکان سرائی امداد علی خاں، خیر پور اور کتب خانہ قسیم ابنِ نسیم، کراچی)

۳۔ بیاضِ غزل (کتب خانہ ڈاکٹر ہلال نقوی، کراچی)

۴۔ ۱۹۷۸ء کے حوالے سے نسیم صاحب کی مصروفیات اور مشاغل کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ 'اپنی غیر مطبوعہ رباعیات، عقائد اور سلاموں کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر رجسٹر میں محفوظ کیا۔' (ارمغان، ص، ۷)

گمشدہ تحریریں

نسیم صاحب نے اپنی نوجوانی میں شاعری کے ساتھ جس ادبی مصروفیت کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا وہ شاید فنِ لغت نگاری ہی تھا اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

> '۱۹۲۸ء میں جب ان کی عمر بیس سال تھی اور وہ الٰہ آباد بورڈ سے فاضل فقہ اور فاضل ادب کے امتحانات سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ انہوں نے ایک بہت مختصر لغت ترتیب دی تھی جس کا نام 'طالب علموں کے لیے ایک مختصر لغت' رکھا تھا اس لغت میں صرف پانچ سو الفاظ تھے ہر لفظ کی تشریح میں انہوں نے ایک شعر خود کہہ کر شامل کیا تھا۔'[۴۳]

۱۔ رسالۂ کنتوری

پروفیسر حکیم کمال الدین کے نام نسیم امروہوی کا ایک خط لکھنؤ میں مقیم محقق ڈاکٹر کاظم علی خاں کو دستیاب ہوا ہے جس کے متن سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نسیم صاحب نے ۱۴، ۱۵ سال کی عمر میں علامہ سید غلام حسین کنتوری کے ایک عربی رسالے کو جو علمِ کیمیا کے موضوع پر مشتمل تھا اردو میں ترجمہ کیا تھا کاظم علی خاں لکھتے ہیں:

> 'نسیم امروہوی کے اس خط کا الیکٹرو اسٹیٹ عکس میرے پاس موجود ہے جس کے لیے میں حکیم کمال الدین حسین صاحب کا ممنون ہوں۔ علم کیمیا سے علامہ کنتوری کو جو شغف تھا اس کی تفصیل ان کی سوانح میں موجود ہے۔ علم کیمیا سے متعلق علامہ کنتوری کے اس

۴۳۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، مقدمہ، فرہنگِ اقبال فارسی، مرتبہ نسیم امروہوی (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۹ء)، ص ۶

عربی رسالے کا اردو ترجمہ نسیم اور ان کی کتابوں کی فہرست میں ایک ایسے اضافے کی حیثیت رکھتا ہے جس سے نسیم کے سوانح نگار بے خبر نظر آئے۔'[۴۴]

۳۔ فرہنگِ شہباز

نسیم صاحب کے ہم عصر شاعروں میں امروہہ کے ایک شاعر سلطان احمد صدیقی تھے جن کا سنہ ولادت ۱۹۱۰ء ہے[۴۵] بعض لکھنے والوں نے انہیں اکبر ثانی بھی کہا ہے۔[۴۶] مزاح گو شاعروں میں وہ بہت ممتاز درجے کی شخصیت تھے ڈاکٹر ہلال نے مجھے بتایا کہ:

'شہباز امروہوی نسیم صاحب کی وفات سے چند سال قبل کراچی آئے تھے ان کی پوری شاعری میں جو الفاظ اور تراکیب آتی ہیں نسیم صاحب نے یہاں ان کی ایک فرہنگ تیار کی تھی۔'

(۳۰رمئی ۲۰۰۲ء کراچی)

فرہنگ اقبال فارسی کے مقدمے میں بھی ڈاکٹر ہلال نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے[۴۷]

۴۔ صوفی شعرا کا قلندرانہ کلام

ڈاکٹر ہلال نقوی نے مجھے بتایا کہ 'نسیم صاحب نے شاید ۱۹۷۶ء یا ۱۹۷۷ء میں اس عنوان سے ایک کام کیا تھا میں نے اس کے مسودے پڑھے تھے۔ یہ صوفی شعرا کا وہ کلام تھا جو انہوں نے عشقِ علی میں لکھا۔ اب یہ نسخہ کہاں ہے حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'

(۱۴راکتوبر ۲۰۰۲ء)

۴۴۔ مراثی نسیم امروہوی کا تجزیاتی مطالعہ، مشمولہ، ادبی کائنات دہلی، شمارہ جون، جولائی، ۱۹۸۹ء، ص ۶

۴۵۔ سید علی سید، حرفِ آغاز، آئینہ شہباز، سوونیئر (کراچی: بزمِ ادب، ۱۹۸۱ء)، ص ۷

۴۶۔ عظیم امروہوی، اکبر ثانی مشمولہ ایضاً، ص ۱۰۹

۴۷۔ (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۰

ضمیمہ (ب)

قلمی نوادرات کے عکس

قلمی نوادرات سے اُن تین صفحات کا عکس جس میں نسیم صاحب نے اپنی ۵۵ تصانیف کے متعلق بنیادی معلومات درج کی ہیں

پاکستان میں ۱۹۵۵ء میں شائع ہونے والی معروف لغت 'نسیم اللغات' کے متعدد ایڈیشن منظر عام پر آئے ہیں۔ ان عکسی صفحات میں ان کے ہاتھ سے ردوبدل اور اضافوں کا یہ حصہ بعد کے ایڈیشنوں میں شامل ہوا

مستثنیٰ: (ع) الگ کیا گیا۔ بچتا گیا۔ (علم نحو میں) وہ چیز جسے باقی چیزوں سے الگ کیا گیا ہو۔
مستثنیٰ منہ: وہ چیز جس کے حکم میں سے مستثنیٰ کو الگ کیا گیا ہو۔
مستجاب: (ع) قبول کیا گیا۔ مقبول (دعا)۔
مستحب: (ع) پسند کیا گیا۔ رسول مقبول کا پسندیدہ۔
مستحسن: (ع) پسند کیا گیا۔ پسندیدہ۔
مستحق: حق رکھنے والا۔ لائق۔ حقدار۔ مستحق ٹھہرانا۔ حقدار قرار دینا۔ مستحق ہونا۔ حقدار ہونا۔ لائق ہونا۔
مستحکم: (ع) مضبوط۔ پکا۔ اٹل۔ مستحکم ہونا۔ مضبوط ہونا۔
مستحضر: (ع) یاد رہا (درسی کتابیں ...)۔
مستدعی: (ع) خواہش کرنے والا۔ درخواست کرنیوالا۔
مسترد: (ع) رد کیا گیا۔ واپس کیا گیا۔ مسترد کرنا۔ رد کرنا۔
مستری: (پرتگال) کسی پیشے کا کاریگر۔
مستزاد: (ع۔ مذ) بڑھایا گیا۔ عروض میں وہ شعر جس کے مصرعے کے بعد ایسا ٹکڑا لگا ہو جو اسی مصرعے کے رکن اول اور رکن آخر کے برابر ہو۔
مستسقی: (ع) وہ شخص جسے استسقا کی بیماری ہو۔
مستطاب: (ع) خوش۔ عمدہ۔ خوب۔ اچھا۔ مبارک۔ پاکیزہ۔
مستطیع: (ع) استطاعت رکھنے والا۔ صاحب قدرت۔
مستطیل: (ع۔ مذ) وہ چار ضلعوں کی شکل جس کے چاروں زاویے قائمے اور مقابل کے ضلعے برابر ہوں۔
مستعار: (ع) مانگا ہوا۔ چند روز کے لیے اُدھار لیا ہوا۔ مستعار دینا۔ مانگے پر دینا۔ اُدھار دینا۔ چند روز کے لیے دینا۔ مستعار لینا۔ مانگے پر لینا۔ اُدھار لینا۔

مستعجل: (ع) جلدی کرنے والا۔
مستعد: (ع) تیار۔ چالاک۔ لائق۔ آمادہ۔ باہمت۔ مستعد رہنا۔ تیار رہنا۔ کمر بستہ رہنا۔ موجود رہنا۔ مستعد کرنا۔ تیار کرنا۔ موجود کرنا۔ مستعد ہونا۔ تیار ہونا۔ موجود ہونا۔
مستعفی: (ع) استعفا دینے والا۔ نوکری چھوڑنے والا۔ مستعفی ہونا۔ استعفا دینا۔ نوکری چھوڑنا۔
مستعمل: (ع) کام میں لایا ہوا۔ جاری۔ برتا ہوا۔ مستعمل ہونا۔ مروج ہونا۔ برتا ہوا ہونا۔
مستعین: (ع) مدد چاہنے والا۔
مستغاث: (ع) وہ جس کے آگے فریاد لے جائیں۔
مستغرق: (ع) ڈوبا ہوا۔ مصروف۔ کسی کام میں محو۔ مستغرق ہونا۔ بہت زیادہ مصروف ہونا۔
مستغنی: (ع) آزاد۔ بے پروا۔ امیر۔ آسودہ حال۔ بے نیاز۔ مستغنی ہونا۔ بے نیاز ہونا۔ آزاد ہونا۔ محتاج نہ ہونا۔
مستغیث: (ع) دعویٰ کرنے والا۔ فریادی۔
مستفاد: (ع) حاصل کیا ہوا۔ جو شے فائدے سے حاصل ہو۔ فائدہ۔ حاصل۔
مستفسر: (ع) پوچھنے والا۔ دریافت کرنے والا۔
مستفید: (ع) فائدہ چاہنے والا۔ فائدہ اٹھانے والا۔ مستفید کرنا۔ فائدہ پہنچانا۔ مستفید ہونا۔ فائدہ اٹھانا۔
مستفیض: (ع) فیض چاہنے والا۔ بھلائی چاہنے والا۔ فیض حاصل کرنے والا۔ مستفیض کرنا۔ فیض پہنچانا۔ مستفیض ہونا۔ فیض پہنچنا۔
مستقبل: (ع) آگے آنے والا۔ آنے والا زمانہ۔ (صرف) وہ فعل جو آنے والے زمانے سے تعلق رکھے۔
مستقر: (ع۔ مذ) ٹھہرنے کی جگہ۔ ٹھکانا۔ قرارگاہ۔ منزل۔
مستقل: (ع) مضبوط۔ اٹل۔ ہمیشہ۔ دائمی۔ وہ ملازم جو عارضی اور قائم مقام نہ ہو۔ مستقل رہنا۔ برقرار رہنا۔ مستقل ہونا۔ ملازمت پکی ہونا۔

مسرت: (ع۔ مو) خوشی۔ آنند۔ مسرت ہونا۔ خوشی ہونا۔
مسرف: (ع) فضول خرچ۔ بے فائدہ خرچ کرنے والا۔
مسرور: (ع) خوش۔ مگن۔ شاد۔ مسرور کرنا۔ خوش کرنا۔ مسرور ہونا۔ خوش ہونا۔
مسروق: (ع) چوری کیا ہوا۔ چرایا ہوا۔ مسروقہ (مو) چرائی ہوئی چیز۔
مسطح: (ع) پھیلا ہوا۔ چوڑا۔ بچھا ہوا۔ ہموار۔
مسطر: (ع۔ مذ) کاغذ کی وصلی جس پر سطریں کھینچنے کے لیے ڈورے سی لیتے ہیں۔ خط کھینچنے کا آلہ۔ مسطر کرنا۔ خط کھینچنا۔ لکیریں کھینچنا۔
مسطور: (ع) سطر بندی کیا گیا۔ لکھا ہوا۔
مسعود: (ع) نیک۔ اچھی قسمت والا۔
مسقف: (ع) جس پر چھت ڈالی گئی ہو۔ مسقف کرنا۔ چھت ڈالنا۔ پاٹنا۔
مسک: (ہ۔ مو) کسی زور کے سبب کپڑے کا ذرا پھٹ جانا۔ ٹوٹنے کی آواز۔ دھچکا۔ دبانا۔ بھینچنا۔
مسکا: (ہ۔ مذ) وہ چھینکا جو جانوروں کے منہ پر چڑھا دیتے ہیں کہ فصل خراب نہ کریں۔
مسکت: (ع) چپ کر دینے والا۔
مسکر: (ع) نشہ پیدا کرنے والی چیز۔ مسکرات (مذ) وہ چیزیں جو نشہ پیدا کرتی ہیں۔
مسکرانا: (ہ) ہونٹوں میں ہنسنا۔ مسکراہٹ (مو) ہونٹوں میں ہنسی۔
مسکن: (ع۔ مذ) رہنے کی جگہ۔
مسکنا: (ہ) مسک جانا۔ عذر کرنا۔ دبانا۔ جنبش کرنا۔ اپنی جگہ سے ہلنا۔

مسکوٹ: (ا۔ مو) صلاح۔ مشورہ۔ پنچایت۔ مسکوٹ کرنا۔ آپس میں صلاح مشورہ کرنا۔ مسکوٹ ہونا۔ آپس میں صلاح مشورہ ہونا۔
مسکوڑا: (ا۔ مذ) کروٹ کا جھٹکا۔ کروٹ کا بل۔ مسکوڑا لینا۔ جسم کو جھٹکا دے کے کروٹ بدلنا۔ مسکوڑا مارنا۔ جھٹکے سے کروٹ لینا۔
مسکوک: (ع) ٹھپا لگا ہوا۔ سرکاری چھاپ کا سکہ۔
مسکہ: (ہ۔ مذ) تازہ نکلا ہوا گھی۔ جھاگ۔ مکھن۔
مسکین: (ع) غریب۔ بھوکا۔ کنگال۔ مسکین طبع۔ غریب طبیعت کا۔ مسکینی (مو) غریبی۔ کنگالی۔ بیچارگی۔
مسل: (ا۔ مو) مقدمے کے کاغذات کی فائل۔ فائل۔ (دیکھیے مثل)
مسل ڈالنا: (ہ) پیس دینا۔ کچل ڈالنا۔ توڑنا مروڑنا۔
مسلح: (ع) وہ شخص جو ہتھیار لگائے ہوئے ہو۔ مسلح کرنا۔ ہتھیار لگانا۔ کیل کانٹے سے لیس کرنا۔ مسلح ہونا۔ کیل کانٹے سے لیس ہونا۔ ہتھیار بند ہونا۔
مسلخ: (ع۔ مذ) جانوروں کی کھال اتارنے کی جگہ۔ بوچڑ خانہ۔
مسلسل: (ع) سلسلہ وار۔ پے درپے۔ متواتر۔
مسلط: (ع) وہ جو کسی پر غالب کر دیا جائے۔ تعینات۔ سر پر سوار۔ مسلط کرنا۔ تعینات کرنا۔ مسلط ہونا۔ تعینات ہونا۔
مسلک: (ع۔ مذ) راستہ۔ قاعدہ۔ طریقہ۔ دستور۔ مذہب۔
مسلم: (ع) برقرار رکھا گیا۔ مانا گیا۔ پورا۔ بحال۔ وہ جو سالم ہو۔ درست۔ ٹھیک۔ ضرور۔ واجب۔ سونپا گیا۔ اعتبار کیا گیا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے لکھے جانے والے ۲۷۹ بندوں پر مشتمل مسدس برق و باراں کی قلمی بیاض سے ایک صفحے کا عکس
جس میں پاکستانِ رحمت کے عنوان سے پانچویں حصے کا آغاز ہوا

(دوم)

برق و باراں

حصہ (۵)

پاکستانِ رحمت

عجب جاں فزا ہے محبت کی دنیا محبت کی دنیا، لطافت کی دنیا
نزاکت کے پردے میں طاقت کی دنیا یہ دنیا کی جنت ہے، جنت کی دنیا
یہیں دو جہاں کے سرے مل رہے ہیں
مجاز و حقیقت کے گل کھل رہے ہیں

تخیل کی رنگین و پر کیف بستی جہاں جلوہ فرما ہے لیلائے ہستی
وہ جادہ کہ جس میں بلندی نہ پستی نہ افتادگی اور نہ رفعت پرستی
گل و خار دونوں برابر جہاں ہیں
مساوات کامل کے سکے رواں ہیں

مزین جہاں، شوق و ارماں کی محفل جہاں جنس ارزاں دھڑکتے ہوئے دل
جہاں خضرِ مقصد، فقط جذب کامل نہ پروائے رہبر، نہ سودائے منزل
وہ دنیا، طریقہ جہاں کا نیا ہے
جو بھٹکا ہوا ہے، وہ پہنچا ہوا ہے

نسیم امروہوی کی ۱۹۲۳ء کی لکھی ہوئی پہلی طویل نظم 'گلِ خوش رنگ' کے چار بندان کے عکسِ تحریر میں

میر انیس کے انتقال (۱۸۷۴ء) کی صد سالہ یادگار پر ۱۹۷۴ء میں نسیم امروہوی نے انیس کی فنکارانہ عظمتوں اور ترقی اردو میں ان کے کردار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک طویل مسدس لکھا۔ یہ تین بند اسی مرثیے کا عکس ہیں

۳۰

فضا میں گونج رہے تھے انیس کے اشعار
دلوں میں بیٹھ رہی تھی جلالتِ افکار
اکادمی نہ کوئی انجمن تھی بر سرِ کار
مگر ترقیٔ اردو کا گرم تھا بازار
~~تمام نظموں نے مل کر نہ جتنے لفظ دیے~~ کسی بھی صنفِ سخن نے نہ اتنے لفظ دیے
زباں کو مرثیہ گوئی نے اتنے لفظ دیے

۲۹

تمام برہمن و شیخ و کافر و دیندار
شرابِ ذوقِ فصاحت سے ہو گئے سرشار
وہ مجلسیں تھیں کہ اک اتحاد کا گلزار
فضائے گلشنِ انسانیت تھی باغ و بہار
ہزار رنگ کے تھے پھول متصل گویا
ملے تھے شانوں سے شانے دلوں سے دل گویا

۲۸

جو سو رہے تھے یکایک اٹھے وہ مستانے
جو خود ہی جاگ گئے تھے دوڑے ابھار کر شانے
سمٹ کے آ گئے مجلس میں اپنے بیگانے
جلی جو شمع گرے ہر طرف سے پروانے
کسی کو جذبۂ عشقِ امام لے آیا
کسی کو کھینچ کے زورِ کلام لے آیا

غیر مطبوعہ رباعیات سے چار رباعیوں کا عکس

مرثیہ نوتصنیف کا ایک صفحہ جس میں ملّتِ اسلامیہ کے اتحاد و اتفاق کی اہمیت کا اظہار کیا گیا ہے

مرثیہ نوتصنیف

۱
قائم ہے بندوبستِ جہاں اتحاد سے — قطرے ہیں آبجو میں رواں اتحاد سے
ذرّے بنے ہیں کوہِ گراں اتحاد سے — ہے ملّتِ ضعیف جواں اتحاد سے
واقف ہے خوب وہ جسے تاریخ یاد ہے
اسلام کی بقا کا سبب اتحاد ہے

۲
عنصر بنے حیات و بقا اتحاد سے — بکھرا کے بھاگتی ہے فنا اتحاد سے
پیدا ہوئی ہے نشوونما اتحاد سے — خود معتدل ہے آب و ہوا اتحاد سے
گل سے جدا ہو آب تو ہرگز نہ گُل بنے
سب جزو متحد ہوں تو پھر ایک کُل بنے

۳
تھا زندگی میں خیرِ وریٰ کا یہی شعار — شیرِ خدا امامِ ہدیٰ کا یہی شعار
اصحابِ پاک و اہلِ صفا کا یہی شعار — ذرّیتِ حبیبِ خدا کا یہی شعار
رکھتے تھے اتحاد تو وحدت پہ ناز تھا
افلاس میں متاعِ اخوّت پہ ناز تھا

۴
اللہ سب کا ایک ہے ذات و صفات ایک — سب کی نظر میں ختمِ رسالت کی ذات ایک
قرآن ایک صورتِ صوم و صلات ایک — دل ایک قول ایک نظر ایک بات ایک
اگر ذرا سوچنا چاہیے جو ذی فہم و نیک ہے
پھر کیوں یہ اختلاف ہے سب کچھ تو ایک ہے

نسیم امروہوی

سندھی اردو زبانوں میں بیک وقت شائع ہونے والے سہ روزہ اخبار 'مراد' کے نایاب لیٹر پیڈ کا ایک عکس

کراچی اور خیرپور میرس سے بیک وقت شائع ہونے والا

سہ روزہ

مُراد

THE "MURAD" BI-WEEKLY

جملہ خط و کتابت، اشتہارات اور ترسیل زر ناظم ادارہ کے نام فرمائیں

مدیر
برائے خیرپور میرس
غلام حسن مخدومی
یکتا امروہوی
۴۴/۴۲ نظامانی
خیر پور میرس

نگراں :
نسیم امروہوی
فون : ۳۱۰۱۱

مدیر و ناظم :
علی اطہر جعفری
فون : ۳۱۰۱۱

کتابیات

...... احمد، اشفاق اور دیگر، ہفت زبانی لغت، لاہور کوٹ لکھپت: سلیم پیکیجز، اگست ۱۹۸۸ء، اشاعت دوم

...... احمد، اوصاف، بیسویں صدی کی اردو شاعری، کراچی: بک ہوم، اشاعت، ستمبر ۲۰۰۳ء

...... احمد، سلیم، اقبال ایک شاعر، لاہور: کتاب گھر، ۱۳۹۸ھ

...... احمد، پروفیسر ممتاز، باقیاتِ امروہہ، کراچی: تہذیب و ابلاغ، ۱۹۸۹ء

...... اختر، ڈاکٹر سلیم، اقبال شناسی کے زاویے، لاہور: بزمِ اقبال طبع اول مئی ۱۹۸۵ء

...... اختر، ڈاکٹر سلیم، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، طبع سوم، ۱۹۹۸ء

...... اختر، ڈاکٹر سلیم، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، اکیسواں ایڈیشن، ۲۰۰۲ء

...... اختر، ڈاکٹر سلیم، جوش کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین، لاہور: فیروز سنز، سن اشاعت ندارد

...... اختر، ڈاکٹر ملک، تہذیب و تحقیق، لاہور: یونیورسل بک، ۱۹۸۵ء

...... ادیب، مرزا، بچوں کا ادب، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء

...... اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، لاہور: دانش گاہ پنجاب، جلد ۱۴/۲، طبع اول، ۱۹۸۲ء

...... اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، لاہور: دانش گاہ پنجاب جلد ۲۰، طبع اول، ۱۹۸۴ء

...... اردو لغت 'جلد اول'، کراچی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۷ء

...... اردو لغت 'جلد دہم'، کراچی: اردو لغت بورڈ، جنوری ۱۹۹۰ء

...... اریب، ڈاکٹر اسد، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۵ء

...... اریب، ڈاکٹر اسد، نئے رجحانات بچوں کے ادب میں، ملتان: کتاب گھر، ۱۹۹۴ء

...... اریب، ڈاکٹر اسد، تجزیے اور تجاویز، ملتان: کتاب نگر، ۲۰۰۲ء

...... اشفاق، انیس، ادب کی باتیں، لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۹۶ء

...... اکبر، ادریس، 'امروہہ میری یادوں میں' (کتابچہ)، خیر پور: مطبوعہ، ۱۹۶۱ء

...... الہ آبادی، بدر، ضیائے سخن، کراچی: ابنِ حسن آفسٹ پریس، ۱۹۷۷ء

...... الہ آبادی، کوثر، مقدمہ 'مسافتِ شب'، کراچی: انجمن سفینۂ ادب، اشاعت اول، جولائی ۱۹۹۷ء

...... امروہوی، عظیم، مرثیہ نگارانِ امروہہ، کراچی: اتحاد کمیٹی، رجسٹرڈ کورنگی، مطبوعہ ۱۹۸۴ء

...... امروہوی، علی نظر، چند حکایتیں چند کہانیاں، خیرپور: ادارۂ اسلامی، ۱۹۵۹ء

...... امروہوی، نسیم، شرحِ کلام میر و غالب، الہ آباد: انوار احمدی پریس، ۱۹۲۸ء

...... امروہوی، نسیم، معراج العروض، الہ آباد: انوار احمدی پریس، ۱۹۲۹ء

...... امروہوی، نسیم، تسہیل القواعد، الہ آباد: انوار احمدی پریس، ۱۹۳۰ء

...... امروہوی، نسیم، نقادہ شعر، ، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۳۱ء

...... امروہوی، نسیم، الاعیار، الہ آباد: انوار احمدی پریس، ۱۹۳۲ء

...... امروہوی، نسیم، نسیم البلاغت، الہ آباد: انوار احمدی پریس، ۱۹۳۲ء

...... امروہوی، نسیم، کوہِ نور ریڈر، بنارس: نند کشور بھارگو، دسمبر ۱۹۳۵ء

...... امروہوی، نسیم، پھولوں کا ہار، لکھنؤ: بھارگو اسکول ڈپو، پہلی بار ۱۹۳۷ء

...... امروہوی، نسیم، پیغامِ انقلاب، لکھنو: نظامی پریس، ۱۹۳۷ء

...... امروہوی، نسیم، تسبیح فاطمہ، کراچی: حکیم محمد علی طیبی، ۱۹۳۷ء

...... امروہوی، نسیم، قرآنِ السعدین، آگرہ: انجمن یادگار شہید ثالث، ۱۹۳۷ء

...... امروہوی، نسیم، نسیم القواعد، آگرہ: گیا پرشاد اینڈ سنز، ۱۹۳۷ء

...... امروہوی، نسیم، دُعائے فاطمہ، کراچی: حکیم محمد علی طیبی، ۱۹۳۸ء

...... امروہوی، نسیم، روح انقلاب، لکھنؤ: نظامی پریس ۱۹۳۸ء

...... امروہوی، نسیم، سازِ حریت، لکھنؤ: اشاعتِ اردو، ۱۹۳۸ء

...... امروہوی، نسیم، خطباتِ مشران 'حصہ اول'، لکھنؤ: یونائٹڈ پریس، ۱۹۴۲ء

...... امروہوی، نسیم، سازِ حریت، لکھنؤ ادارۂ اردو خیالی گنج، ۱۹۴۲ء

...... امروہوی، نسیم، کشمکش، لکھنؤ: سرفراز قومی پریس، ۱۹۴۲ء

...... امروہوی، نسیم، منظومات، لکھنؤ: مطبوعہ ۱۹۴۲ء

...... امروہوی، نسیم، شہید انسانیت، لکھنؤ: ادراۂ ترویج اردو، ۱۹۴۳ء

...... امروہوی، نسیم، واناصرہ، قصبہ سنبھل ضلع بریلی: ۱۹۴۳ء

...... امروہوی، نسیم، واناصرہ، لکھنؤ: ادبی پریس لاٹوش روڈ، ۱۹۴۳ء

...... امروہوی، نسیم، برق وباراں، لاہور: مست قلندر ڈپو، ۱۹۴۴ء

...... امروہوی، نسیم، استاد کا پیغام شاگردوں کے نام، یو پی: انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ، ۱۹۴۵ء

...... امروہوی، نسیم، بیادنہال محمد، لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۴۵ء

...... امروہوی، نسیم، جنگِ عالمگیر، لکھنو: اشاعتِ اردو، ۱۹۴۵ء

...... امروہوی، نسیم، نثرِ اردو، کراچی: انوار بک ڈپو، باراول جون ۱۹۴۸ء

...... امروہوی، نسیم، ابوالکمال، لاہور: کشمیری بازار، جنوری ۱۹۴۹ء

...... امروہوی، نسیم، شرح دفتر ابوالفضل، لاہور: جان محمد الٰہی بخش، ۱۹۴۹ء

...... امروہوی، نسیم، اردوادب 'دوسرا حصہ'، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء

...... امروہوی، نسیم، اردوادب 'پانچواں حصہ'، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء

...... امروہوی، نسیم، اردوادب 'چھٹا حصہ'، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۱ء

...... امروہوی، نسیم، اردوادب 'ساتواں حصہ'، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۲ء

...... امروہوی، نسیم، آئینِ اردو 'حصہ دوم'، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۲ء

...... امروہوی، نسیم، آئینِ اردو 'حصہ سوم'، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۲ء

...... امروہوی، نسیم، جدید آئینِ اردو، الہ آباد: مطبع انوار احمدی پریس، ۱۹۵۲ء

...... امروہوی، نسیم، جدید آئینِ اردو 'حصہ دوئم'، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۲ء

...... امروہوی، نسیم، ادبی کہانیاں، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۳ء

...... امروہوی، نسیم، الصرف، لاہور: شیخ غلام علی، ۱۹۵۳ء

...... امروہوی، نسیم، النحو، لاہور: شیخ غلام علی، ۱۹۵۳ء

...... امروہوی، نسیم، کوہِ نور ریڈر، خیر پور: ناشر بنیاد علی، خیر پور، ایڈیشن ۱۹۵۳ء

...... امروہوی، نسیم، گلزارِ نسیم، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۳ء

...... امروہوی، نسیم، نسیم اردو 'حصہ اول'، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۳ء

...... امروہوی، نسیم، نسیم اردو 'حصہ دوم'، لاہور: کشمیری بازار، ۱۹۵۳ء

...... امروہوی، نسیم، چراغِ زندگی ’حصہ دوم‘، پٹنہ: کدار ناتھ، اشاعتی ادارہ، جولائی ۱۹۵۴ء

...... امروہوی، نسیم، تاریخ خیر پور، خیر پور: انوار احمدی پریس، ۱۹۵۵ء

...... امروہوی، نسیم، دوست بنو دوست بناؤ، لاہور: شیخ غلام علی، ۱۹۵۵ء

...... امروہوی، نسیم، نسیم اللغات، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت اول ۱۹۵۵ء

...... امروہوی، نسیم، نصیحت کا کرن پھول، لاہور: آفتاب عالم پریس، ۱۹۵۹ء

...... امروہوی، نسیم، اردو ادب ’ساتواں حصہ‘، لاہور: کتاب منزل، دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۲ء

...... امروہوی، نسیم، مراثی نسیم ’جلد اول‘، کراچی: ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک، ۱۹۶۲ء

...... امروہوی، نسیم، سعادت امروہوی، کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، ۱۹۶۴ء

...... امروہوی، نسیم، عہدِ رفتہ کی طرح گو منتشر اب ہم نہیں ’مرثیہ‘، کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ، نومبر ۱۹۶۶ء

...... امروہوی، نسیم، چشمۂ غم، کراچی: مشہور آفسٹ پریس، ۱۹۶۸ء

...... امروہوی، نسیم، رثائے محسن الحکیم، کراچی: ناشر یاور عباس، جولائی ۱۹۷۰ء

...... امروہوی، نسیم، صحیفۂ کاملہ، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۰ء

...... امروہوی، نسیم، توضیح المسائل، کراچی: امین مرچنٹ، ۱۹۷۲ء

...... امروہوی، نسیم، مناسکِ حج، کراچی: انجمن پریس، لارنس روڈ، ۱۹۷۲ء

...... امروہوی، نسیم، توضیح المسائل ’دوسرا حصہ‘، کراچی: امین مرچنٹ، ۱۹۷۳ء

...... امروہوی، نسیم، ’مرثیہ‘ کیا باوفا رفیقِ شبہ ذی وقار تھے، کراچی: ناشر وزحیدر جعفری، ۱۹۷۳ء

...... امروہوی، نسیم، مومنِ آلِ ابراہیم، ناشر کے سی غلام علی ایڈووکیٹ، ۱۹۷۴ء

...... امروہوی، نسیم، مراثی نسیم ’جلد دوم‘، کراچی: پاکستان ریڈرس گلڈ، ۱۹۷۶ء

...... امروہوی، نسیم، مسدسِ نسیم، کراچی: ابنِ حسن آفسٹ، ۱۹۷۸ء

...... امروہوی، نسیم، ارمغانِ عقیدت، خیر پور، ۱۹۸۱ء

...... امروہوی، نسیم، صبحِ ازل، لاہور: ظفر شارب، ۱۹۸۱ء

...... امروہوی، نسیم، دستورِ اساسی، کراچی: کل پاکستان فروغِ مرثیہ، ۱۹۸۲ء

...... امروہوی، نسیم، مرثیۂ جوش، کراچی: لشکرِ ادب، ۱۹۸۲ء

...... امروہوی، نسیم، تفسیر و ترجمہ پارۂ عم، خیر پور میرس: مہران بک سینٹر، ۱۹۸۳ء

...... امروہوی، نسیم، دینیات جو پھریون کتاب، خیر پور میرس: مہران بک سینٹر، شاہی بازار، ۱۹۸۴ء

...... امروہوی، نسیم، فرہنگِ اقبال 'اردو'، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۴ء

...... امروہوی، نسیم، فرہنگِ اقبال پر اعتراضات اور اُن کے جوابات (کتابچہ)، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۴ء

...... امروہوی، نسیم، خودنوشت سوانح حیات 'حصہ اول'، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۶ء

...... امروہوی، نسیم، مراثی نسیم 'جلد سوم'، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۶ء

...... امروہوی، نسیم، فرہنگِ اقبال 'فارسی'، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۹ء

...... امروہوی، نسیم، جامع نسیم اللغات، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت اول ۱۹۹۶ء

...... امروہوی، نسیم، فلسفۂ غم، جونپور: سن اشاعت ندارد

...... امروہوی، نسیم، کلیات ناز، خیر پور: مراد برقی پریس، سن اشاعت ندارد

...... امروہوی، نسیم، ملّتِ شیعہ اور سیاسیات حاضرہ، لکھنؤ: سرفراز قومی پریس، سن اشاعت ندارد

...... امروہوی، نسیم، نظمِ اردو، لکھنؤ: مختار پرنٹنگ ورکس، سن اشاعت ندارد

...... انجم، ڈاکٹر خلیق، جوش ملیح آبادی کے خطوط، دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۸ء

...... انجمن ساداتِ امروہہ، عرفانِ نسیم، کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ پاکستان، ۱۹۷۴ء

...... اوحدی، حافظ خیر محمد، سندھی ادب کی مختصر ترین تاریخ، جامشورو: انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی، اشاعت اول، جولائی ۱۹۸۳ء

...... ایاز، شیخ، مقدمہ منظوم اردو ترجمہ شاہ جو رسالو، سندھ یونیورسٹی: سندھیکا اکیڈمی، اشاعت سوم، دسمبر ۱۹۹۱ء

...... ایلیا، جون، مقدمہ کلیات رئیس امروہوی، کراچی: ویلکم بک پورٹ، مطبوعہ اشاعتِ اول، ۱۹۹۵ء

...... برق، غلام جیلانی، ہماری تہذیب، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت اول، ۱۹۷۱ء

...... بریلوی، سید الطاف علی، علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں، کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۷۰ء

...... بیگم، ڈاکٹر شاہدہ، سندھ میں اردو، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، جون ۱۹۸۰ء

...... تونسوی، ڈاکٹر طاہر، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، احوال و آثار، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

...... تونسوی، ڈاکٹر طاہر 'مرتب'، سرسید شناسی: الفیصل اردو بازار، دسمبر ۲۰۰۲ء

...... جالبی، جمیل (مترجم)، ایلیٹ کے مضامین، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰ء

...... جاوید، ڈاکٹر انصار الحق، پنجابی زبان و ادب کی مختصر ترین تاریخ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، طبع اول ۱۹۹۷ء

...... جعفری، ڈاکٹر حسین محمد/ احمد سلیم، احمد 'مرتبین' پاکستانی معاشرہ و ادب، کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، اپریل ۱۹۸۷ء

...... جعفری، رئیس احمد، بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت سوم، اکتوبر ۱۹۶۹ء

...... جعفری، وزیر حیدر، چند قصے چند نظمیں، کراچی: اطہر اکیڈمی، ۱۹۸۱ء

...... جمیل، خاور 'مرتبہ' ادب کلچر اور مسائل، کراچی: پاکستان نیشنل اکیڈمی، ۱۹۸۶ء

...... جونپوری، مرزا امیر علی، تذکرہ مرثیہ نگارانِ امروہہ اردو، لکھنو: دانش محل امین آباد، مطبوعہ اگست ۱۹۸۵ء

...... جین، ڈاکٹر گیان چند، اردو کی ادبی تاریخیں، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰ء

...... حالی، الطاف حسین، مقدمہ مع دیوانِ حالی، کانپور: نامی پریس، ۱۸۹۳ء

...... حالی، الطاف حسین، حیاتِ جاوید، دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۹ء

...... حسن، پروفیسر محمد، اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو قومی زبان، ۱۹۸۸ء

...... حسن، پروفیسر محمد، دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۸۹ء

...... حسن، پروفیسر محمد، مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، پہلا ایڈیشن، ۲۰۰۰ء

...... حیدر، سید جرآر، ساداتِ امروہہ، دہلی: جمال پریس، نومبر ۱۹۷۹ء

...... حیدر، ڈاکٹر علی، مرثیہ شناسی، الہ آباد: اردو رائٹرس گلڈ، طبع اول، ۱۹۸۷ء

...... حیدر، قرۃ العین، کارِ جہاں دراز ہے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

...... حسین، پروفیسر احتشام، اعتبارِ نظر، لکھنؤ: کتاب پبلشرز چوک، بار اول، ۱۹۶۵ء

...... حسین، پروفیسر احتشام، عکس اور آئینے، لکھنؤ: فروغِ اردو، ۱۹۷۰ء

...... حسین، پروفیسر احتشام، جدید ادب منظر اور پس منظر، اتر پردیش: اردو اکادمی، مطبوعہ اکتوبر ۱۹۷۸ء

...... حسین، پروفیسر احتشام، روایت اور بغاوت، لکھنؤ: فروغِ اردو، ۱۹۷۸ء

...... حسین، پروفیسر احتشام، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۸۸ء

...... حسین، انتظار، ملاقاتیں، لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۸۸ء

...... حسین، سید بشیر، شجراتِ سادات امروہہ، کراچی: مسلم پرنٹنگ پریس، مطبوعہ ۱۹۶۱ء

...... حسین، ڈاکٹر صفدر، رزم نگارانِ کربلا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، مطبوعہ ۱۹۶۲ء

...... حسین، ڈاکٹر صفدر، آئینِ وفا، لاہور: مکتبۂ دانش افروز، ۱۹۶۵ء

...... حسین، ڈاکٹر صفدر، مرثیہ بعدِ انیس، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۱ء

...... حسین، ڈاکٹر طاہر، اردو مرثیہ میر انیس کے بعد، نئی دہلی: ایرانین آرٹ پرنٹر، ۱۹۹۷ء

...... حسین، پروفیسر ممتاز، نقدِ حرف، کراچی: مکتبۂ اسلوب، اشاعت اول ۱۹۸۵ء

...... خانی، باقر امانت، امانتِ غم، کراچی، گروہ اکبری، ستمبر ۱۹۸۲ء

...... خلیفہ عبدالحکیم، مطالعۂ اقبال 'مرتبہ گوہر شاہی'، لاہور: بزمِ اقبال کلب روڈ طبع اول جون، ۱۹۷۱ء

...... خواجہ غلام الثقلین، مولانا شبلی ایک مطالعہ، کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۸۶ء

...... خواجہ، مشفق، صبا اکبر آبادی، دوام، کراچی: فرید پبلشرز، اردو بازار، ۲۰۰۲ء

...... خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام، سرگزشتِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء

...... داؤد، علامہ محمد، تحفۂ رضویہ، رامپور: مرتضیٰ پریس، سن اشاعت ندارد

...... راشدی، ڈاکٹر وفا، مہران نقش، کراچی: مکتبۂ اشاعتِ اردو، ۱۹۸۶ء

...... رائے پوری، ڈاکٹر اختر حسین، ادب و انقلاب، بمبئی: نیشنل ہاؤس، ۱۹۳۵ء

...... رائے پوری، ڈاکٹر منظور مہدی، مراثی سجاد و منظور رائے پوری، کراچی: جاوید پریس، مطبوعہ ۱۹۶۵ء

...... رضا، ڈاکٹر جعفر، دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی، الہ آباد: دبستانِ شاہ گنج، تیسرا ایڈیشن، مارچ ۱۹۹۴ء

...... رضوی، حسن، گفت و شنید، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء

...... رضوی، حسن، اندازِ گفتگو، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

...... رضوی، ڈاکٹر عقیل، مرثیے کی سماجیات، دہلی: خواجہ پریس جامع مسجد، ۱۹۹۳ء

...... رضوی، علی اکبر، مقالاتِ قدرت نقوی، کراچی: ادارۂ ترویجِ علومِ اسلامیہ، ۲۰۰۲ء

...... رئیس پروفیسر قمر، عاشور کاظمی، ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، دہلی: ثمر آفسٹ پریس، ۱۹۸۷ء

...... رئیس، پروفیسر قمر، اردو میں لوک ادب، نئی دہلی: سیمانت پرکاش دریا گنج، جنوری ۱۹۹۰ء

...... زیدی، سید نواز حسن، نجم آفندی فکر و فن، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰

...... سبطِ حسن، ادب اور روشن خیالی، مرتب سید جعفر احمد، کراچی: مکتبۂ دانیال، اکتوبر ۱۹۹۰ء

...... سبطِ حسن، پاکستان کے تہذیبی مسائل، کراچی: مکتبۂ دانیال، اشاعت ۲۰۰۲ء

...... سدید، انور، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۵ء

...... سرور، آل احمد، فکرِ روشن، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۵ء

...... سکسینہ، رام بابو، تاریخِ ادب اردو، لکھنؤ: نولکشور، ۱۹۳۰ء

...... سندھی، ڈاکٹر میمن عبدالمجید، سندھی ادب کی مختصر ترین تاریخ، جامشورو: انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی، اشاعتِ اول جولائی ۱۹۸۳ء

...... سودا، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سودا' جلد دوم' لکھنؤ: نولکشور، اشاعت اول ۱۹۳۲ء

...... سید عبداللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب، اشاعتِ ثانی، ۱۹۷۷ء

...... شاہی، گوہر، مطالعۂ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال کلب روڈ طبع اول جون ۱۹۷۱ء

...... شبلی، مولانا، موازنۂ انیس و دبیر، آگرہ: مفید عام، ۱۹۰۷ء

...... شبیہہ الحسن، ڈاکٹر، بجھی وہ شمع، لاہور: اظہار سنز، جون ۱۹۸۷ء

...... صدیقی، احمد حسین، کشورِ اولیا، کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، مطبوعہ ۱۹۹۹ء

...... صدیقی، پروفیسر رشید احمد، خطبات، کراچی: مکتبۂ دانیال، مطبوعہ ۱۹۹۱ء

...... صدیقی، ڈاکٹر محمد علی، سرسید احمد خاں اور جدت پسندی، کراچی: ارتقا مطبوعات ۲۰۰۲ء

...... ظریف، قاضی عمر، اقبال قرآن کی روشنی میں، لاہور: کتاب منزل، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۵۸ء

...... عابدی، حسن، دستاویزات، کراچی: خرم پریس پاکستان چوک، ۱۹۸۶ء

...... عابدی، ڈاکٹر سید تقی، مجتہد نظم مرزا دبیر، لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۴ء

...... عباس، پروفیسر ایس جی، اردو مرثیہ اور پاکستان میں اس کی روایت، کراچی: اسلامک ریسرچ سینٹر، ۱۹۹۱ء

...... عبدالباری، ڈاکٹر سید، لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی اور ثقافتی پس منظر، فیض آباد یوپی: نشاط آفسٹ پریس، مئی ۱۹۸۷ء

...... عزیز، مہر النساء، جمیل الدین عالی کی تحریروں میں پاکستانیت، کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی

یونیورسٹی، اشاعت مارچ/اپریل ۲۰۰۰ء
...... عقیل، شفیع، ادب اور ادبی مکالمے، کراچی: اکادمی بازیافت، جون ۲۰۰۲ء
...... علوی، وارث، منتخب مضامین، کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، اپریل ۲۰۰۲ء
...... علی، ڈاکٹر محمد چراغ، اردو مرثیے کا ارتقا، بیجاپور اور گولکنڈہ میں، دکن مدینہ پریس، ۱۹۷۳ء
...... علیگ، م ندیم، لطیف الزماں خاں، 'مرتبین' پیامِ اقبال، کراچی: میک برن انجینیرز، اشاعت اول، ۱۹۹۷ء
...... فاروقی، ڈاکٹر احسن، اردو میں تنقید، لکھنؤ: ادارۂ فروغِ اردو، سن اشاعت ندارد
...... فاضلی، امید، سرِ نینوا، کراچی: سیپ پبلی کیشنز، فروری ۱۹۸۲ء
...... فہمی، ڈاکٹر سیادت، نسیم امروہوی ایک تعارف، امروہہ: بزمِ حیات، جنوری ۱۹۹۱ء
...... فیض احمد فیض، متاعِ لوح و قلم، کراچی: مکتبۂ دانیال، دسمبر ۱۹۷۳ء
...... فیض احمد فیض، میزان، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، جدید ایڈیشن ۱۹۸۷ء
...... قادری، حامد حسن، داستان تاریخِ اردو، آگرہ: بار دوم ۱۹۵۷ء
...... قدوسی، مولانا اعجاز الحق، سندھ کی تاریخی کہانیاں، کراچی: تحریر پرنٹرز دریا آباد، طبع دوم، ۱۹۸۸ء
...... قریشی، محمد عبداللہ، روحِ مکاتیبِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اول، ۱۹۷۷ء
...... قریشی، ڈاکٹر وحید، پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء سے تا حال، لاہور: بک ٹاک، ۱۹۹۵ء
...... قسیم ابنِ نسیم، اتحادِ ملّت، کراچی: پیر ابراہیم ٹرسٹ، ۱۹۷۶ء
...... کاظمی، عاشور، مرثیہ نظم کی اصناف میں، دہلی: عفیف پرنٹر، ۱۹۹۶ء
...... کاظمی، عاشور، بیسویں صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، اشاعت دوم، ۲۰۰۳ء
...... کاظمی، عاشور، 'اردو مرثیے کا سفر'، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء
...... کاظمی، ڈاکٹر محمد رضا، جدید اردو مرثیہ، کراچی: مکتبۂ تعمیر ادب، ۱۹۸۱ء
...... کرہانی، شمیم 'مرثیہ ذوالفقار'، لکھنؤ: احباب پبلشر، سن اشاعت ندارد
...... گیلانی، ڈاکٹر عارف شاہ، شہنشاہِ سخن، کراچی: مدینہ پبلیشنگ کمیٹی اشاعت اول، ۱۹۷۰ء
...... مجید، شیما 'مرتبہ' ادبی مذاکرے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

...... مسیح الزماں، ڈاکٹر، اردو مرثیے کا ارتقا، لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۶۸ء

...... مظہری، علامہ جمیل، منثوراتِ جمیل مظہری' حصہ دوم'، پٹنہ: بہار اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء

...... معین الرحمٰن، سید، نقدِ عبدالحق، لاہور: نذر سنز، طبع اول اگست، ۱۹۶۸ء

...... معینی، عبدالواحد، نقشِ اقبال، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۹ء

...... ملیح آبادی، جوش، شعلہ و شبنم، نئی دہلی: کتب خانہ رشیدیہ، تیسرا ایڈیشن ۱۹۳۹ء

...... ملیح آبادی، جوش، یادوں کی برات، کراچی: جوش اکیڈمی، مطبوعہ ۱۹۷۰ء

...... ملیح آبادی، جوش، یادوں کی برات، لاہور: اردو ڈائجسٹ پرنٹرز، مئی ۱۹۷۵ء

...... مہدی، آغا سکندر، مرثیہ نظم کی اصناف میں، دہلی: عفیف پرنٹر، ۱۹۹۶ء

...... مہر، سلطانہ، سخنور، تذکرہ شعرائے پاکستان، امریکہ: مہر بک فاؤنڈیشن، بار سوم ۲۰۰۰ء

...... میرٹھی، نور احمد، تذکرہ شعرائے میرٹھ، کراچی: ادارۂ فکرِ نو کورنگی، جنوری ۲۰۰۳ء

...... نارنگ، پروفیسر گوپی چند، انیس شناسی، دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء

...... ناز، ڈاکٹر احسن اختر، مکالمات، لاہور: الحمرا انٹر پرائزر، ۲۰۰۳ء

...... ندوی، سید سلیمان، نقوشِ سلیمانی، کراچی: کلیم پریس، طبع اول، ۱۹۵۱ء

...... ندوی، مولانا عبدالسلام، اقبالِ کامل، اعظم گڑھ، ۱۹۴۸ء

...... ندیم، شمیم رضا، گلہائے صد رنگ، کراچی: عظیمی پرنٹرز، ۱۹۸۳ء

...... نقوی، سید ضمیر اختر، سید حسین شرف الدین شاہ ولایت، حالات و کرامات، کراچی: ابنِ حسن آفسٹ پریس، ۱۹۸۹ء

...... نقوی، شاہد، نفسِ مطمئن، لاہور: اظہار سنز، دسمبر ۱۹۷۱ء

...... نقوی، ڈاکٹر محمد سیادت، علی نظر حیات اور شاعری، امروہہ: سنہ اشاعت ندارد

...... نقوی، ناشر، لالہ زارِ صبح، دہلی: بزم تجدید مرثیہ، ۱۹۸۷ء

...... نقوی، ہلال، جدید مرثیے کے تین معمار، کراچی: پاکستان رائٹرس گلڈ، دسمبر ۱۹۷۷ء

...... نقوی، ڈاکٹر ہلال، ارمغانِ نسیم، کراچی: انجمن ساداتِ امروہہ پاکستان، ۱۹۹۲ء

...... نقوی، ڈاکٹر ہلال، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، لندن/کراچی: محمدی ٹرسٹ، فروری، ۱۹۹۴ء

...... نقوی، ڈاکٹر ہلال، اذانِ مقتل، لندن/کراچی: محمدی ٹرسٹ، ۱۹۹۴ء

...... نیازی،ضمیر، حکایاتِ خونچکاں، کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، طبع اول اپریل ۱۹۹۷ء
...... ہاشمی، اظہر عباس، ضیائے سخن، کراچی: ابنِ حسن آفسٹ پریس، ۱۹۷۷ء
...... ہاشمی، وحید الحسن، عظمتِ انسان، لاہور: مکتبہ تعمیرِ ادب، ۱۹۶۷ء

غیر مطبوعہ/قلمی

...... امروہوی، ڈاکٹر عظیم، شمیم امروہوی: حیات اور کارنامے (مقالہ پی ایچ ڈی)، روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی، ۱۹۹۹ء
...... بختیار، شبنم، نسیم امروہوی بحیثیت شاعر (مقالہ برائے ایم اے)، مملوکہ لائبریری، گورنمنٹ کالج فیصل آباد، ۱۹۸۹ء
...... بیگم، شاہانہ، بچوں کی نصابی نظموں کا تنقیدی مطالعہ (مقالہ برائے ایم اے)، مملوکہ لائبریری، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۰۱ء
...... حسین، مزمل، قلمی بیاض، مملوکہ نسرین عباس، امروہہ سوسائٹی، کراچی
...... صدیقی، محمد علی، پاکستانی معاشرے کے تناظر میں اردو شاعری کا تجزیاتی مطالعہ (مقالہ پی ایچ ڈی)، مملوکہ لائبریری، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ۱۹۹۲ء
...... ظریف، سردار محمد، پنجاب کی لوک داستانوں کا سماجی مطالعہ (مقالہ برائے ایم اے)، مملوکہ لائبریری، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ۱۹۹۹ء
...... قسیم ابنِ نسیم، مکتوب بنام مہر النساء عزیز، مرقومہ ۲۶ر اپریل ۲۰۰۱ء، کراچی
...... قسیم ابنِ نسیم، مکتوب بنام مہر النساء عزیز، مرقومہ ۱۷ر اپریل ۲۰۰۲ء، کراچی
...... منصور، مونا، بچوں کا ادب اور ڈاکٹر اسد اریب (مقالہ برائے ایم اے)، مملوکہ لائبریری، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۰۵ء

رسائل

...... اخبار اردو، اسلام آباد، ۳ مارچ ۲۰۰۱ء
...... ادبی کائنات (دہلی)، جون/ جولائی ۱۹۸۹ء

...... ادیب (علی گڑھ)، ستمبر ۱۹۶۰ء

...... اردو سہ ماہی (کراچی)، جولائی ۱۹۶۸ء، ۱۹۷۲ء، شمارہ ۳، ۴

...... اردو نامہ (کراچی)، اکتوبر ۱۹۵۹ء، اپریل ۱۹۶۱ء، جولائی تا ستمبر ۱۹۶۱ء، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۱ء، جنوری تا مارچ ۱۹۶۲ء، جولائی تا ستمبر ۱۹۶۵ء، جنوری ۱۹۷۲ء، اپریل ۱۹۷۷ء

...... ارشاد (کراچی)، پندرہ روزہ، محرم نمبر ۱۴۰۹ھ

...... اصلاح (لکھنؤ)، فروری ۱۹۸۱ء

...... اظہار (کراچی)، اکتوبر ۱۹۸۲ء

...... افکار، جوش نمبر (کراچی)، پہلا ایڈیشن، ۱۹۶۱ء

...... ایوانِ اردو (دہلی)، فروری ۱۹۸۹ء، فروری ۲۰۰۵ء

...... آج کل (نئی دہلی)، جون ۱۹۸۱ء

...... پاکستانی ادب، جولائی، ۱۹۷۶ء، جنوری ۱۹۸۲ء

...... پرچم (سکھر)، مئی ۱۹۶۲ء

...... تبلیغ، مرتبہ محشر لکھنوی، ۱۹۷۳ء

...... تحریر (دہلی)، شمارہ اپریل تا جون ۱۹۷۱ء

...... تخلیق (لاہور)، ۱۹۸۸ء

...... تناظر، سہ ماہی (حیدر آباد دکن)، شمارہ ۲۸۔۲۹

...... جام جم (کراچی)، اپریل ۱۹۷۱ء

...... جاوداں (کانپور)، اپریل تا جون ۱۹۵۸ء

...... جدید ادب (لاہور)، ۵ دسمبر ۱۹۸۹ء

...... جمنائنٹ، سہ ماہی (دہلی)، جنوری ۱۹۸۷ء

...... خبر نامہ انجمن ساداتِ امروہہ، کراچی، ۱۹؍فروری ۱۹۶۷ء، مارچ ۱۹۶۸ء، ۲۱ مئی ۱۹۷۳ء، ۱۹۷۶ء، اکتوبر ۱۹۷۹ء، مئی ۱۹۸۱ء، ۲۱ دسمبر ۱۹۸۶ء

...... دائرے (کراچی)، ۸ فروری ۱۹۸۸ء

...... ذہنِ جدید (نئی دہلی)، فروری ۱۹۹۴ء

...... رثائی ادب، سہ ماہی (کراچی)، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء

...... زاویہ، ماہنامہ (نیویارک)، مارچ ۲۰۰۴ء

...... زبان وادب، جون/ جولائی، ۱۹۹۹ء

...... ساقی (کراچی)، جوبلی نمبر، ۱۹۵۵ء

...... سب رس (حیدرآباد دکن)، فروری، ۲۰۰۴ء

...... سرفراز (لکھنؤ)، جنوری ۱۹۳۹ء

...... سیپ، انیس نمبر (کراچی)، فروری/ مارچ، ۱۹۷۲ء

...... شاعر (بمبئی)، جولائی ۱۹۷۲ء

...... شام وسحر (لاہور)، مئی ۱۹۹۸ء

...... شہید، ہفت روزہ (لاہور)، ۱۹۷۲ء

...... صحیفہ، سہ ماہی (لاہور)، جولائی ۱۹۶۵ء

...... صریر، ماہنامہ (کراچی)، مئی ۱۹۹۶ء

...... طلوع افکار (کراچی)، جنوری ۱۹۷۰ء، اپریل ۱۹۷۷ء

...... عبارت، سہ ماہی (حیدرآباد)، اپریل تا دسمبر ۱۹۷۷ء

...... عصری ادب (دہلی)، ۱۹۷۴ء

...... فنون (لاہور)، دسمبر ۱۹۷۳ء

...... قومی زبان (کراچی)، ۱۶رفروری ۱۹۵۱ء، ۱۶رفروری ۱۹۸۱ء، اکتوبر ۱۹۸۸ء، جون/ جولائی ۱۹۹۳ء، نومبر ۱۹۹۳ء، جون/ جولائی ۱۹۹۹ء، ستمبر ۲۰۰۱ء، مئی ۲۰۰۲ء، اکتوبر ۲۰۰۲ء، دسمبر ۲۰۰۲ء

...... کتاب نما (لاہور)، ستمبر ۱۹۸۹ء، ۱۹۹۱ء

...... کتاب نما (نئی دہلی)، جولائی ۱۹۷۵ء، جنوری ۱۹۹۲ء

...... لیل ونہار (کراچی)، ستمبر ۱۹۷۰ء، دسمبر ۱۹۷۰ء

...... ماہِ نو (لاہور)، ۱۹۸۷ء

...... معیار (نئی دہلی)، مارچ ۱۹۷۷ء

...... میراث (کراچی)، اپریل تا جون ۱۹۹۱ء، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۳ء

...... نظارہ (لکھنؤ)، مئی ۱۹۸۳ء

...... نگار، اگست ۱۹۵۲ء، فروری ۱۹۶۳ء، مئی/ جون ۱۹۶۷ء، مسائل ادب نمبر ۱۹۶۸ء، اپریل ۱۹۹۷ء، فروری ۱۹۹۸ء

...... نیا دور (کراچی)، شمارہ ۶۳، ۶۴

...... نیا دور (ہندوستان)، اکتوبر ۱۹۷۹ء

...... نیا سفر (الٰہ آباد)، جنوری تا جون ۲۰۰۲ء

...... ہمارا سندھ (ہفت روزہ)، آخری ہفتہ، مئی ۱۹۸۸ء

...... ہم قلم، اگست/ ستمبر ۱۹۷۱ء

اخبارات

...... امرتسر (دہلی)، یکم ستمبر ۱۹۸۲ء

...... پیسہ اخبار (لاہور)، ستمبر ۱۹۸۱ء

...... جنگ (کراچی)، ۱۹ر مئی ۱۹۷۸ء، ۱۵ر اپریل ۱۹۸۲ء، ۲ مارچ ۱۹۸۷ء، جنگ مڈویک میگزین، ۲۴ دسمبر ۲۰۰۳ء

...... حریت (کراچی)، ۱۹ر مارچ ۱۹۶۳ء، ۱۹ر اپریل ۱۹۶۹ء، ۲ستمبر ۱۹۷۹ء، یکم ستمبر ۱۹۸۰ء، ۷ جنوری ۱۹۸۸ء، ۲۴ فروری ۱۹۸۹ء، ۱۷ر فروری ۱۹۹۱ء

...... صداقت (جیکب آباد)، ۴ر مارچ ۱۹۷۸ء

...... عبرت (حیدر آباد)، ۲۸ مئی ۱۹۸۵ء

...... قومی آواز (لکھنؤ)، ۴ستمبر ۱۹۸۶ء، ۱۲ر اپریل ۱۹۸۷ء

...... مراد (خیر پور)، ۸ تا ۱۰ر جنوری ۱۹۵۲ء، ۱۹ر اکتوبر ۱۹۵۶ء، ۱۷ر نومبر ۱۹۵۷ء، ۲۸ ستمبر تا ۳۰ نومبر ۱۹۵۸ء، ۱۹ر اپریل ۱۹۵۹ء، اگست ۱۹۶۳ء

...... نوائے وقت (کراچی)، ۲ر اگست ۱۹۸۴ء، یکم مارچ ۱۹۸۷ء

[illegible]

...... بجھی وہ شمع (لاہور)، ۱۹۸۷ء

...... تعزیت نامہ (کراچی)، ۱۹۸۷ء

...... رازدار (سکھر)، جولائی ۱۹۵۹ء

...... فلاحی مجلّہ (کراچی)، ۱۹۶۳ء

...... مجلّہ بزمِ ادب (کراچی)، ۱۹۸۱ء

...... مجلّہ بیادِ شاعر اہلبیت (کراچی)، دسمبر ۱۹۷۸ء

...... مجلّہ دفترِ علوم (مرادآباد)، ۱۹۵۸ء

...... معجزۂ فن (کراچی)، ۱۹۸۱ء

...... یادگاری مجلّہ، ۲۰۰۳ء

ملاقات

...... امروہوی، ڈاکٹر عظیم، ۱۷ر فروری ۲۰۰۶ء، کراچی

...... امروہوی، یکتا، ۱۵ر فروری ۲۰۰۲ء، کراچی

...... حیدر، وسیم، ۲۷ فروری ۲۰۰۳ء، کراچی۔ ۲۷ مئی ۲۰۰۴ء، کراچی

...... عالم، ڈاکٹر سید، ۱۱ر فروری ۲۰۰۱ء، بمقام ہومیو پیتھک کلینک، بلاک ۲۰، فیڈرل بی ایریا، کراچی

...... قائمہ خاتون، دختر نسیم امروہوی ۲۴ر اپریل ۲۰۰۳ء، کراچی

...... قسیم ابنِ نسیم، ۲۷ جون ۲۰۰۳ء، کراچی

...... قسیم ابنِ نسیم، ۲۱ر اکتوبر ۲۰۰۴ء، کراچی

...... معصومہ خاتون، اہلیہ قسیم ابن نسیم، ۱۷ر مارچ ۲۰۰۳ء، کراچی

نسیم امروہوی کے صاحب زادے قسیم ابنِ نسیم صاحب کے وہ دو خطوط جن میں انہوں نے تحقیقی مقالے کے لیے معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کے اقتباسات مقالے میں شامل ہیں

(خط نمبر: ۱)

۴۸۶
۱۶۹

نسیم اکادمی کراچی

نسیم اکادمی
NASIM ACADEMY
KARACHI

سید قسیم حیدر۔ المعروف قسیم ابن نسیم امروہوی (شاعر و ادیب)
دائمی صدر

آر 308 بلاک 19 النور سوسائٹی
فیڈرل بی ایریا کراچی

رابطہ
09221-6361104 ٹیلیفون / فیکس (گھر)
0334-3345598 موبائل
0300-2788324

مورخہ ۲۶-۰۴-۲۰۱۱

عزیزم مہرالنسا سلمہا
سلام و دعا

تم نے جو مجھ سے اپنے تھیسز کے لیے رابطہ کیا ہے وہ تمہاری گہری توجہ کا عکاس ہے۔
لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے تمہارے کسی بھی ٹیلیفون یا خط پر توجہ نہ دی ہو۔ مثلاً کل صبح ۱۰ بجے
(۲۵/۰۴ کو) تم نے خط بھیجا ہے میں اُس کا جواب آج ۲۶ اپریل کو دے رہا ہوں۔
جس نظم کے متعلق تم نے پوچھا ہے یہ نظم قلمی صورت میں والدِ محترم نسیم امروہوی صاحب کے نایاب
ادبی ذخیرے میں محفوظ موجود ہے۔
یہ غالباً ۱۹۴۸ء کی بات ہے کہ بابا (نسیم امروہوی) خلقتِ آدمؑ اور نسلِ انسانی کے زمینی سفر کے
بارے میں کچھ لکھنا چاہتے تھے لہٰذا میں اپنے اس خاکے میں انہوں نے تکرار و بدل بھی کی — اس نظم کا
مطلع یہ تھا —— "کیوں زمانے میں ہوئے حضرتِ آدمؑ پیدا"
اس کے علاوہ تم نے جو بذریعہ ٹیلیفون، خیرپور سے شائع ہونے والے سہ روزہ اخبار "مراد" کے لیے
پوچھا تھا کہ اس کا نام "مراد" کیوں رکھا گیا، میں اُس وقت جلدی میں تمہیں نہ بتا سکا کہ غالباً ۱۹۵۸ء
سے قبل خیرپور ایک ریاست تھی جس کو ۱۹۵۸ء میں کالعدم کر کے سندھ صوبہ کا ایک حصہ
قرار دیا گیا۔ اس ریاست کے آخری والی میر علی مراد خان تالپور ہیں۔ انہی کے نام پر
یہ "مراد اخبار" وجود میں آیا۔

والسلام و دعا

ق حیدر بقلم خود

(خط نمبر: ۲)

نسیم اکادمی کراچی

سید قسیم حیدر۔ المعروف قسیم ابن نسیم امروہوی (شاعر و ادیب)
دائمی صدر

آر 308 بلاک 19 النور سوسائٹی
فیڈرل بی ایریا کراچی

رابطہ
ٹیلیفون/فیکس (گھر) 09221-6361104
موبائل 0334-3345598
0300-2788324

۴۸۶/۱۶۹

مورخہ ۱۷-۰۴-۲۰۰۳

مہر النسا عزیز سلمہا ——— سلام و دعا

کل تمہارا خط وصول ہوا۔ تم محترم والد نسیم امروہوی صاحب سے متعلق جو تھیسز لکھ رہی ہو اس میں کافی تحقیق کی ضرورت ہوگی۔ تم نے خط میں جو بات پوچھی تھی اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

بقول میری دادی مرحومہ کے میرے والد مرحوم عہد طفلی ہی میں ایک کہنہ مشق شاعر ہو گئے تھے۔ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ انھوں نے نثر اور نظم دونوں ادبی راہوں کی طرف ایک ساتھ کامیاب سفر شروع کر دیا تھا۔

شاعری ہمارا خاندانی میراث ہے۔ خادمؔ، یکتاؔ، شمیمؔ، برجیسؔ کا اپنے عہد کے استاد شعرا میں شمار ہوتا تھا۔ یہ ان پر خاندانی ماحول کے اثرات تھے جب انھوں نے بہت ہی کم عمری میں شعر کہنے کا آغاز کیا اگرچہ انھوں نے اپنی خود نوشت میں یہ لکھا ہے کہ وہ گیارہ سال کے تھے جب انھوں نے نعت کا یہ شعر کہا۔

ہمارے محمدؐ تمہارے محمدؐ
سبھی امتی کے سہارے محمدؐ

لیکن میرے پاس بہت بوسیدہ کاغذ پر اپنی پھوپھی مہر بانو کی جو میرے والد کی حقیقی بہن تھیں اور ان سے عمر میں کم از کم دس برس بڑی تھیں، ایک تحریر لکھی ہوئی ملی ہے کہ قائم رضا (نسیم امروہوی) نے ۹ سال کی عمر میں یہ شعر کہا تھا شاید یہ اس کا پہلا شعر ہے ——

میرے والد ہوئے شاعر میرے دادا ہوئے شاعر
مجھے بھی شعر کہنے کا سلیقہ آ ہی جائے گا

والد کی ولادت ۱۹۰۸ء کی ہے اس لیے میرے والد کا یہ شعر ۹ سال کی عمر کے حوالے سے ۱۹۱۷ء کا ہوا۔

والسلام و دعا

قسیم حیدر تعلم فرد